مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

معارف

خصوصی شمارہ

ہندوستانی مسلمان
شذرات معارف کے آئینہ میں

(جولائی ۱۹۱۶ـ جون ۱۹۵۶)

حصہ اول

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

معارف

خصوصی شمارہ

جلد ۱۹۷ ماہ رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ مطابق ماہ جون ۲۰۱۶ء عدد ۶

مرتبہ

اشتیاق احمد ظلی

عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی) پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

قیمت: ۲۰۰/ روپے

فہرست

ہندوستانی مسلمان شذرات معارف کے آئینہ میں

حصہ اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

سفر یوروپ کے دوران مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جہاز پر امریکہ سے شائع ہونے والا ایک ہفت روزہ انگریزی رسالہ ''دی سٹرڈے ایوننگ پوسٹ'' دیکھا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں اس کی عمر ۹۳ سال تھی۔ اسے عجائب عالم میں شمار کیا گیا۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں جب انہوں نے اس واقعہ کا ذکر شذرات میں کیا ''معارف'' ابھی اپنی عمر کے چھٹے سال میں تھا۔ اس وقت انہوں نے لکھا تھا ''ہم سست اور غیر مستقل ہندوستانیوں کے لیے ایک اردو رسالہ کی اتنی عمر بھی غنیمت ہے''۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جو پودا انہوں نے لگایا تھا اور اپنے خون جگر سے جس کی آبیاری کی تھی کارکنان قضا و قدر کی طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اسے سو سال کی عمر پانے والے پہلے اردو رسالہ ہونے کا امتیاز اور اعزاز حاصل ہوگا۔ اگر امریکہ سے شائع ہونے والا ایک رسالہ سو سال کی عمر کو پہنچ جائے تو یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں۔ اس کے سامنے نہ تو وسائل کی کمی کا مسئلہ ہوتا ہے اور نہ سرپرستی کا فقدان۔ البتہ اردو رسائل کو عموماً جس صورت حال کا سامنا ہوتا ہے اور خاص طور سے دارالمصنّفین گذشتہ پوری صدی جن مسائل اور حالات سے دوچار رہا اور آزادی کے بعد اردو کو جن انقلابات اور آزمائشوں سے گذرنا پڑا، ان کو دیکھتے ہوئے ''معارف'' کا سو سال کی عمر کو پہنچ جانا اور اس شان سے پہنچ جانا یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جسے عجائب عالم ہی میں نہیں بلکہ اعجب العجائب واقعات میں شمار کیا جانا چاہیے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم کی وجہ سے ممکن ہوا ورنہ ظاہری حالات اور اسباب کو دیکھتے ہوئے تو اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس عظیم الشان اور غیر معمولی کامیابی کے لیے ہم بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر بجالاتے ہیں۔

اس نادر تاریخی اور یادگار موقع پر ہم ''معارف'' کے بانی مدیر اور جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کو دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے علامہ شبلی کے دوسرے کئی ناتمام منصوبوں کی طرح نہ صرف یہ کہ انہی کے متعین کردہ خطوط کار کے مطابق ''معارف'' کے اجراء کا اہتمام کیا بلکہ ایک طویل مدت تک اس کی تعمیر و ترقی کے لیے اپنی بہترین توانائیاں صرف کیں اور اس کا

وہ انداز اور معیار مقرر کیا جو اردو جرائد کی دنیا میں اس کا نشانِ امتیاز قرار پایا۔ علم و تحقیق کی دنیا میں اس کو جو غیر معمولی قبول عام حاصل ہوا وہ بلاشبہہ اس کے مدیر اول کی دین تھی۔ ان کے اپنے عہد میں اور ان کے بعد کے تمام مستقل اور وقتی مدیران گرامی کو بھی ہم احترام اور ممنونیت کے جذبات کے ساتھ یاد کرتے ہیں جن کے اخلاص اور عزم و حوصلہ نے نہایت نامساعد حالات میں بھی مدیر اول کے قائم کیے ہوئے بلند معیار کو قائم رکھنے کا فریضہ انجام دیا اور علم و تحقیق کی اس شمع فروزاں کی لَو کو مدھم نہیں ہونے دیا۔ ہم اس موقع پر ''معارف'' کے ان بے شمار قلمی معاونین کو بھی ممنونیت کے ساتھ یاد کرتے ہیں جن کے علمی تعاون نے پوری ایک صدی تک اس مجلہ کو کاروانِ علم و تحقیق کے قافلہ سالار کے منصب پر فائز رکھا۔ اس موقع پر ہم ''معارف'' کے خریداروں اور سرپرستوں کو بھی یاد کرتے ہیں جو اگرچہ تعداد میں کم رہے لیکن ان کی علم پروری اور ادب نوازی نے سو سال پر محیط اس طویل عرصے میں ''معارف'' کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ ہم بارگاہ رب العزت میں دست بہ دعا ہیں کہ علم و دانش کے اس سراج منیر کی ضیا پاشیاں اگلے بے شمار برسوں تک ایسے ہی قائم رہیں اور وہ اسی طرح علم و ادب کی خدمت انجام دیتا رہے اور آیندہ بہت سی نسلوں کو علم و تحقیق سے روشناس بھی کراتا رہے اور قلم پکڑنے کا سلیقہ اور ہنر بھی سکھاتا رہے جیسا کہ وہ ماضی میں کرتا رہا ہے۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے جون کے اس شمارے پر معارف کی عمر کے سو سال مکمل ہوتے ہیں۔ بلاشبہہ اردو صحافت کی تاریخ میں اس کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے۔ یہ دارالمصنّفین کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک صدی پہلے اس کے لیے جو مقاصد اور اہداف مقرر کیے گئے تھے اور جو انداز اور معیار متعین کیا گیا تھا حالات و اوضاع میں غیر معمولی تغیر و تبدل کے باوجود بڑی حد تک اب تک ان کی پاسداری کی جاتی رہی ہے۔ ابتداء میں جو قالب اس کے لیے منتخب کیا گیا تھا زمانہ کی بے شمار گردشوں اور لیل و نہار کی بے حساب کروٹوں کے باوجود اس کی یہی وضع اب بھی باقی ہے۔ چنانچہ اس کے پہلے اور موجودہ شمارہ میں دیکھنے والوں کو کوئی بہت نمایاں فرق نہیں محسوس ہوگا اور آنکھوں کو اجنبیت کا چنداں احساس نہیں ہوگا۔ نہایت برق رفتاری سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں جس کے زمین و آسمان سب یکسر بدل چکے ہیں ایک رسالہ سے ایسی وضع داری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے بے خبر اور نئے زمانے کی ضرورتوں سے غافل رہا

ہے۔قارئین اس بات سے واقف ہیں کہ دستیاب وسائل کی حد تک اسے نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے۔

دارالمصنّفین نے ابتداء ہی سے خاموش خدمت کو اپنا شعار بنایا۔اس نے نہایت عظیم الشان کارناموں اور غیر معمولی کامیابیوں کا بھی نہ تو کبھی ڈھنڈورہ پیٹا اور نہ ہی ان کی تشہیر کی طرف کوئی توجہ دی۔کسی اور ادارے میں ایسا غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہوتا اور ایسی عدیم النظیر کامیابی حاصل ہوئی ہوتی تو اس کا کیسا کچھ جشن نہ منایا جاتا اور کس کس طرح اس کی تشہیر نہ ہوتی۔لیکن دارالمصنّفین میں ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔اس کے باوجود ہمیں اس نادر تاریخی لمحہ کی اہمیت کا ادراک بھی ہے اور باوقار علمی انداز میں اسے یادگار بنانے کی ضرورت کا احساس بھی۔اسی کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ جون کا شمارہ جس پر اس کی سو سال کی عمر مکمل ہوتی ہے، خاص نمبر کی صورت میں شائع کیا جائے اور اس کے ذریعہ قارئین کے سامنے اس کے تابناک ماضی اور اس کی مہتم بالشان خدمات کی ایک جھلک پیش کی جاسکے۔اس کی ایک صورت یہ تھی کہ اس کے مشتملات کا ایک انتخاب تیار کیا جائے لیکن کم وبیش ایک لاکھ صفحات اور ہزاروں مقالات اور تحریروں میں سے چند سو صفحات کا انتخاب گو ناممکن نہیں لیکن سخت دشوار عمل تھا۔چونکہ ''معارف'' کے منتخب مقالات کے متعدد مجموعوں کی اشاعت کا منصوبہ پہلے ہی سے پیش نظر ہے اس لیے خیال ہوا کہ معارف کے صفحات میں مستقل عناوین کے تحت شائع ہونے والی تحریروں کا ایک انتخاب مرتب کیا جائے۔لیکن مستقل عناوین کی فہرست سے اگر ''وفیات'' کو الگ بھی کر دیا جائے جس کا بڑا حصہ شائع ہو چکا ہے، تو بھی شذرات، باب التقریظ والانتقاد، تلخیص وتبصرہ، باب الاستفسار، آثار علمیہ وتاریخیہ اور اخبار علمیہ کے تحت شائع ہونے والی تحریروں کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ ان کے ایک انتخاب کی اشاعت کے لیے متعدد جلدوں کی ضرورت ہوگی۔بالآخر نگاہ انتخاب شذرات پر آ کر ٹھہر گئی اور طے کیا گیا کہ مختلف موضوعات اور مسائل پر گذشتہ ایک صدی کے دوران لکھے گئے منتخب شذرات کو خاص نمبر کے طور پر شائع کیا جائے۔اس نقطہ نظر سے شذرات کا ایک محتاط انتخاب تیار کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی اتنا زیادہ ہے کہ خاص نمبر ان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔بالآخر یہ طے کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلق سے جو شذرات لکھے گئے ہیں ان کا ایک انتخاب تیار کیا جائے۔اس کے وسیلہ سے گذشتہ ایک صدی کے دوران ہندوستانی مسلمانوں پر جو کچھ گذری اس کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔اس وقت ہندوستانی مسلمان جن نازک

حالات سے دوچار ہیں اس کے پیش نظر اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس انتخاب کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہوگی۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد انتخاب کا عمل از سر نو شروع ہوا۔ انتخاب کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اس موضوع پر بھی شذرات کے تحت لکھی گئی تمام تحریروں کا احاطہ ممکن نہیں تھا۔ دامانِ نگہ تنگ وگل حسنِ تو بسیار، والی بات تھی۔ چنانچہ خواہش کے باوجود اس موضوع پر لکھی گئی بہت سی تحریریں اس انتخاب میں جگہ نہ پا سکیں۔ خیال یہ تھا کہ یہ خاص نمبر تین سے چار سو صفحات پر مشتمل ہوگا لیکن بہت کچھ کاٹ چھانٹ کے باوجود صفحات کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تجاوز کر گئی۔ دشواری یہ تھی کہ یہ خاص نمبر صرف جون کے شمارہ کی جگہ پر تھا اور ایک عام شمارہ کے لیے جو وقت دستیاب ہوتا ہے اسی میں اس کو تیار کرنا تھا۔ یہ بھی نہایت ضروری تھا کہ یہ خاص نمبر جون کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے شائع ہوجائے ورنہ ''معارف'' کی ہر مہینہ میں وقت کی پابندی کے ساتھ شائع ہونے کی سوسال کی طویل روایت صدی کے آخری شمارہ پر ٹوٹ جاتی اور یہ ایک بہت بڑا المیہ ہوتا۔ اس دوران بعض ایسے عوائق پیش آئے جن کی وجہ سے وقت کے اندر اس کام کی تکمیل تقریباً ناممکن سی ہوگئی۔ اس مشکل صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک صورت تو یہ تھی کہ خاص نمبر کو جون اور جولائی کے مشترکہ شمارے کے طور پر شائع کیا جائے۔ اس میں دشواری یہ تھی کہ جون پر نہ صرف یہ کہ جلد مکمل ہو رہی تھی بلکہ صدی بھی۔ پہلی صدی کے آخری اور دوسری صدی کے پہلے شماروں کو یکجا کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ حددرجہ مجبوری میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ خاص نمبر کو دو حصوں میں منقسم کردیا جائے۔ پہلا حصہ جون میں شائع ہو اور دوسرا جولائی میں۔ حصہ اول پہلے چالیس سال کے انتخاب پر مشتمل ہو اور دوسرا اگلے ساٹھ کے انتخاب پر۔ یہ غیر منطقی تقسیم بھی حالات کے شدید دباؤ کے تحت کرنی پڑی۔ جن اسباب کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا ان کی وضاحت کا یہاں موقع نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین ہماری مجبوریوں کو محسوس کریں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمام تر دشواریوں اور مشکلات کے باوجود ہم پہلا حصہ جون کے اختتام سے پہلے شائع کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے شذرات کا ایک نہایت بلند معیار قائم کیا تھا۔ ان کے شذرات علم و تحقیق اور زبان و بیان کے بڑے دلآویز شہ پارے ہوتے تھے اور بجا طور پر شذرات الذہب کہلانے کے مستحق تھے۔ ان کا معتد بہ حصہ علمی اور تحقیقی معلومات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ان میں عالم اسلام اور

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا بھرپور انعکاس بھی پایا جاتا تھا۔اس خوانِ پرنعمت سے صرف اس حصہ کو اس انتخاب میں جگہ دی گئی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق ہے۔حق تو یہ تھا کہ اس حصہ کو بہ تمام و کمال شائقین کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا اس لیے کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

لیکن جگہ کی تنگ دامانی نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بڑی حد تک یہی معاملہ ان کے جانشینوں کے شذرات کے ساتھ بھی ہے۔ یہ انتخاب پیش خدمت ہے۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی امیدوں، آرزوؤں اور حوصلہ مندیوں کی جلوہ گاہ بھی ہے اور ان کی مشکلات اور مسائل کی ایک دل گداز داستان بھی۔ گذشتہ سو سال کے دوران ہندوستان کی امت مسلمہ جن مسائل سے گذری ہے اور پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے انھوں نے جو کوششیں کی ہیں اس کی داستان اس مختصر سے انتخاب میں پھیلی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدیرانِ معارف نے ملی مسائل پر لکھتے ہوئے اپنا دل نکال کے رکھ دیا ہے اور اگر ان کی زبان سے یہ کہا جائے کہ

من قاش فروشِ دلِ صد پارہ خویشم

تو بیجا نہ ہوگا۔

آپ دیکھیں گے کہ ان میں ایک معتدبہ حصہ اردو اور مسلم یونیورسٹی سے متعلق ہے۔اگرچہ ان دونوں اہم موضوعات پر بھی تمام تحریروں کو اس انتخاب میں جگہ نہیں مل سکی ہے۔ سید صاحب اردو کو ہندوستانی کے نام سے موسوم کرنے کے حق میں تھے، اور چاہتے تھے کہ یہی مشترکہ زبان ہندوستان کی سرکاری زبان قرار پائے۔ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد نقطہ نظر میں کسی قدر فرق محسوس ہوگا۔ آزادی سے پہلے بھی وہ ''ہماری مسلم یونیورسٹی'' تھی لیکن چونکہ وہ تحریک آزادی کی اس طرح حصہ نہیں تھی جس طرح دارالمصنّفین تھا اس لیے کہیں کہیں انداز بیان ناقدانہ ہو جاتا ہے۔ جامعہ ملیہ جو تحریک آزادی کے سلسلہ میں انہی نظریات وخیالات پر کاربند تھی، جن پر دارالمصنّفین یقین رکھتا تھا اس لیے اس کا ذکر ہمیشہ استحسان سے کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد تو مسلم یونیورسٹی اسلامیان ہند کی سب سے قیمتی متاع قرار پائی اور اس موضوع پر تمام تحریروں میں یہ ایک قدر مشترک ہے۔ اس قیمتی تاریخی مواد سے استفادہ کو آسان بنانے کے مقصد سے منتخب تحریروں کے لیے عنوانات مقرر کیے گئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا سید سلیمان ندویؒ

مسلمانوں کی ترقی وتنزل کا سبب

یورپ کے حکمائے تاریخ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ترقی وتنزل دونوں کا ایک ہی سبب ہے، یعنی غیر قوموں کے ساتھ نسبی اور اجتماعی میل جول۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ترقی اور تنزل دونوں کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے ان کا فوری اور وقتی جوش، وہ سیلاب کے مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں لیکن کوہ کن کی طرح ایک ایک پتھر جدا کر کے راستہ صاف نہیں کر سکتے۔ وہ بجلی کی مثل ایک آن میں خرمن کو جلا کر خاک سیاہ کر سکتے ہیں لیکن چیونٹی کی طرح ایک ایک دانہ نہیں ڈھو سکتے۔ وہ ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں لیکن ایک منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لیے مسلسل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے۔ یہ ان سے ممکن تھا کہ محمد علی اور ابوالکلام کے دائیں بائیں گر کر جان دے دیتے۔ لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں کہ وہ مسلسل آئینی جدوجہد سے ان اسیران اسلام کو چھڑا لائیں۔

مایۂ طینت آدم ز خمیر دگر است تو توقع ز گل کوزہ گراں می داری

مسز اینی بسنٹ چھوٹ سکتی تھیں کہ ان کی آزادی کے لیے وہ قوم بے تاب تھی، جو اپنی مسلسل اور پائیدار کوششوں سے برطانیہ کے پرعظمت اور زخّار سمندر کے کنارہ کو ہلا سکتی ہے اور یہ اس وقت تک ہلاتی رہ سکتی ہے، جب تک گوہر مقصود اس کے ہاتھ نہ آجائے لیکن مسلمان دو ہی کام کر سکتے ہیں۔ یا اس پرخطر دریا میں کود کر اپنی جان گنوا دیں یا اس میں ہیل کر پانی کی صاف وشفاف سطح کو گدلا کر دیں۔

ہندوستان کی سیاسی بساط پر اس وقت جو بازی کھیلی جارہی ہے۔ ہم کو یقین نہیں کہ مسلمان

اس کے اچھے شاطر ثابت ہوسکیں۔ کیونکہ یہ وہ میدان ہے جو ایک ایک قدم گن کر آہستہ آہستہ آگے بڑھانے سے جیتا جاسکتا ہے اور ایک دوڑ میں آگے بڑھ جانے کی کوشش میں مات سامنے رکھی ہے اور اگر غافلانہ اپنی جگہ پر قائم رہیں تو توبرتوشہ کی تاب نہ لاکر فوراً بساط الٹ دیں گے۔

اس جدید دور میں علمی، تعلیمی، تجارتی، سیاسی ہر میدان میں مسلمانوں نے اپنی قوت بازو کو آزمایا، لیکن ان کی تمام کوششیں نقش برآب ثابت ہوئیں۔ آج نہایت زور شور سے بڑے شور وغل کی آواز میں ایک انجمن کی بنا پڑتی ہے اور کل اس کی اینٹ اینٹ علاحدہ ہوجاتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ اٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید بغداد و مصر و قرطبہ کی گم شدہ عظمت آناً فاناً واپس آنا چاہتی ہے۔ لیکن اس دن کی جب رات گذرتی ہے، تو خواب فراموش سے زیادہ وہ یاد نہیں رہتا۔ طرابلس اور بلقان کے خونیں معرکوں میں گو شرر بار توپوں کے دہانے افریقہ اور یورپ کی سرزمینوں میں کھلے تھے۔ لیکن ان کی گرج سے ہندوستان کے درودیوار ہل رہے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ شاید یہاں کوئی نیا زلزلہ پیدا ہوگا لیکن اس کی حقیقت صدائے مگس سے زیادہ نہ ثابت ہوئی۔ مسجد کانپور کے خونیں قطروں کو دیکھ کر ہم نے کیا کیا جزع وفزع نہ کی لیکن پھر کر جو دیکھتے ہیں، تو ان دردمند لبوں پر جن کی گریہ وزاری کبھی تھمنے والی نہ تھی۔ اس قیامت کا تبسم نظر آتا ہے کہ شاید یہ ہونٹ کبھی آہ وفغاں سے آشنا ہی نہ تھے۔

ہماری ناکامی کا اصل سبب کیا ہے۔ یہ ہے کہ ہم آندھی کی طرح آتے ہیں اور بجلی کی طرح گذر جاتے ہیں۔ ہم کو دریا کے اس پانی کے مانند ہونا چاہیے، جو آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور سالہا سال میں کناروں کو کاٹ کر اپنا دہانہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ کامیابی صرف مسلسل اور پائیدار کوشش میں ہے۔ ہمالیہ کی برفستانی چوٹیاں آہستہ آہستہ پگھلتی ہیں لیکن کبھی جمنا اور گنگا کو خشک نہیں ہونے دیتیں۔ آسمان کا پانی ایک گھنٹہ میں دشت وجبل کو جل تھل بنادیتا ہے لیکن چند ہی روز میں ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے۔

تمہاری عبرت کے لیے خود تمہاری قومیت کی پیدائش کا سبق کافی ہے۔ اسلام اکیس سال میں تکمیل کو پہنچا۔ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ برس رہے اور اس طویل زمانہ کا ہر لحظہ دعوت اور تبلیغ میں گذرا، تاہم خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی لیکن آپ اس سے ملول خاطر نہ ہوئے اور جب آپؐ کے

چچانے بلاکر سمجھایا کہ اس خیال خام سے باز آؤ۔اس وقت آپؐ کی زبان سے جو فقرہ نکلا،اس کی روشنی اس وقت تک ماند نہ ہوگی، جب تک آسمان پر آفتاب و ماہتاب کی روشنی باقی ہے۔آپؐ نے فرمایا:

''قریش اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں تو بھی اس کوشش سے باز نہ آؤں گا''۔

جس قوم نے اس عزم و استقلال کے آغوش میں تربیت پائی ہو۔اس کے لیے حیف ہے کہ ایک ایک منٹ میں اس کا رنگ بدل جائے۔وہ چاند اور سورج کو پا کر نہیں بلکہ چاند کی طرح کی ایک زرد دھات سے للچا کر اور سورج کی طرح کی ایک سفید دھات سے ڈر کر دفعتہً اس کے ارادہ کا رخ اس طرح پلٹ جائے، گویا وہ باد صرصر کے جھونکے میں ایک خزاں رسیدہ درخت کی پتی تھی۔

ہم ایک ہی بات کہنا چاہتے ہیں کہ کامیابی صرف مسلسل اور پائیدار کوشش میں ہے۔

(معارف،اکتوبر ۱۹۱۷ء)

اشاعت اسلام کی مشکلات

آج کل اخبارات میں اشاعت اسلام،اشاعت اسلام کی پکار ہے لیکن ان کی نظر اس راہ کی دقتوں پر نہیں۔حالت یہ ہے کہ کہنے کو تو اردو زبان تمام ہندوستان کی زبان ہے اور شاید شہروں کی نسبت یہ بیان صحیح ہو لیکن دیہاتوں اور قصبوں کے مسلمان جیسا چاہیے اس زبان کو نہیں سمجھتے، باہر سے جو علماء وہاں جاتے ہیں وہ اول تو چند روز سے زیادہ قیام نہیں کر سکتے۔دوسرے ان کے فصیح و بلیغ تقریروں کے سمجھنے والے وہاں مفقود ہیں۔اس لیے اصلی طریقہ کار یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں میں عربی تعلیم کا ذوق پیدا کیا جائے اور اس صوبہ کے چند لڑکوں کو عالم بنا کر ان کے وطن میں واپس کیا جائے، جہاں وہ مستقل قیام کر کے اور اپنے اہل وطن کے ہر مجلس و خلوت میں شریک ہو کر ان کے درمیان کام کریں۔

ندوہ نے اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے اور اب چند سال سے اس کے سالانہ اجلاسوں کا بھی اہم المقاصد ہے۔مدراس میں خود وہاں کے چند مقدس روشن خیال علماء کی کوشش سے ایک مدرسہ باقیات الصالحات نہایت کامیابی سے ندوہ کے اصول پر چل رہا ہے۔امسال ناگپور میں ایک عربی درس گاہ کی تحریک پیدا ہوئی ہے اور امید ہے کہ وہ کامیاب ہوگی لیکن چونکہ ہر جگہ دارالعلوم جیسا مدرسہ

قائم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ طلبہ دارالعلوم میں لائے جائیں۔ چنانچہ تین سال کی کوشش کے بعد دارالعلوم میں آپ کو اب ہر صوبہ کے لڑکے مل سکتے ہیں۔ بہار اور ممالک متحدہ تو ندوہ کی پرانی کمائی ہیں۔ اب اس کا احاطہ بنگال، برہما، سیلون، مہاراشٹر، کرناٹک، ممالک متوسطہ و برار، مدراس اور پنجاب و پشاور تک پہنچ گیا ہے۔ امید ہے کہ چند سال کے بعد ہمارے دو دو تین تین طالب العلم جب ان ممالک میں پہنچ جائیں گے اور اپنے اخلاق اور جوش عمل سے وہاں کے مسلمانوں کو مطمئن کر دیں گے تو مسلمانوں کی ترقی کا ایک نیا باب کھل جائے گا۔ (معارف، اپریل ۱۹۱۸ء)

جامعہ عثمانیہ کا منشور عمل

محرم ۱۳۳۷ھ سے جامعہ عثمانیہ کو اعلیٰ حضرت کی پیش گاہ سے منشور عمل (چارٹر) مل گیا۔ اس منشور میں اس بات کا خاص التزام کیا گیا ہے کہ کوئی انگریزی لفظ نہ آنے پائے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے تمام مصطلحات کے لیے عربی الفاظ وضع کیے گئے ہیں، جن میں بعض ایسے ہیں، جن کی ایجاد کا فخر دکن کو حاصل ہے لیکن زیادہ تر الفاظ وہ ہیں، جو مصر و شام کی جدید عربی سے لیے گئے ہیں۔

اردو زبان کی یہ سب سے پہلی یونیورسٹی اب عملاً قائم ہوگئی اور یہ اردو کی فرماں روائی کی تاریخ کا پہلا دن ہے۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۱۸ء)

کانگریس، مسلم لیگ اور اردو

دسمبر کے قومی ہنگامے ایک ایک کر کے ختم ہوگئے۔ کانگریس سے لے کر اردو پریس کانفرنس تک ہر ایک مجلس کی روداد عمل ہر شخص کے سامنے آگئی۔ اس سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے بولنا تو سیکھ لیا ہے۔ آہستہ آہستہ زبانوں سے منتقل ہو کر ایک دن ہاتھوں تک یہ قوت پہنچ جائے گی لیکن دعا کیجیے کہ یہ قوت باہم دست و گریباں ہونے میں نہیں بلکہ دامن مقصود کے چھونے میں صرف ہو۔

اللہ اکبر! چند سالوں میں کتنا تفاوت ہوگیا۔ کانگریس میں ایک مدت سے دو فریق ہوگئے ہیں۔ ارباب اعتدال (ماڈریٹ) اور ارباب استعجال (ایکسٹریمسٹ) سورت کانگریس میں جب یہ دونوں فریق باہم پھٹ کر الگ ہوگئے تو استعجالیوں کو کانگریس کے احاطہ سے نکل جانا پڑا اور اعتدالی چھ برس تک کانگریس کے تخت پر بلاشرکت غیرے مالک رہے۔ لکھنؤ کی کانگریس نے بچھڑوں کو پھر

ملایا،لیکن اس میل ملاپ پر دو برس بھی گذرنے نہ پائے کہ دلی کی کانگریس نے پھر نزاع قائم کردی، لیکن زمانہ کا انقلاب دیکھو کہ اب استعجالی کانگریس کی عنان حکومت کے مالک ہیں اور اعتدالیوں کو کانگریس کے احاطہ سے باہر نکل جانا پڑا۔ **تلک الایام نداولها بین الناس۔**

مسلم لیگ نے اپنے بارہ برس کی تاریخ میں سب سے پہلی بار اپنے شایان شان وجود کا ثبوت دیا۔ سچ یہ ہے کہ دلی کے زیر خاک زندوں کی۔ ہندوستان کے روئے زمین کے مردوں نے آبرو رکھ لی۔ آنریبل فضل حق اور ڈاکٹر انصاری نے صدارت کے خطبے نہیں پڑھے، بلکہ ایک نے ہندوستان کا دل اور دوسرے نے اسلام کا جگر دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

شد وقت آں کہ دیدہ چو دل غرق خوں کنم　　خوں نابۂ گرہ شدہ از دل بروں کنم

آں غصۂ کہ پیش نخوردم کنوں خورم　　واں نالۂ کہ پیش نہ کردم کنوں کنم

گویند عاقلاں کہ رہ صبر اختیار کن　　چوں اختیار درکف من نیست چوں کنم

دلی کی مسلم لیگ بھی نزاع باہمی سے پاک نہیں رہی لیکن لیگ اور کانگریس کی نزاعوں میں ایک دقیق فرق ہے۔ کانگریس میں مایۂ اختلاف رفتار کی تیزی اور سستی ہے اور لیگ میں نفس رفتار کا عدم یا وجود۔

یادش بخیر ایجوکیشنل کانفرنس تو امسال بچ کر سورت نکل گئی۔ ''دکن کی بجلی'' صرف مسلم لیگ پر آ کر گری، اس کے اجلاس میں علمائے کرام بھی تشریف فرماتھے۔ ایک گوشہ سے آواز آئی۔

یارب تو نگہ دار دل خلوتیاں را　　کاں مغبچہ مست است و در صومعہ باز است

معاصر لکھنؤ کی روایت ہے کہ ان چند لمحوں میں ارباب دلق و تسبیح دعائے ''ردّ بلا'' کی ''قرأت'' میں مصروف رہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے کلکتہ کے تجربہ کے بعد یہ طے کرلیا کہ تعلیم اور سیاست ایک ساتھ نہیں جمع ہوسکتیں۔ چنانچہ لیگ دلی آئی تو کانفرنس پرے ہٹ کر سورت چلی گئی۔ کانفرنس کا یہ اجلاس متعدد حیثیتوں سے کامیاب رہا۔ چودہ ہزار روپیہ کانفرنس کو وظائف کے لیے ملا۔ ایک دارالاقامہ کے لیے پچاس ہزار کا چندہ ہوا۔ دارالاقامہ تعمیر ہونے تک ایک باہمت نے اپنی عالی شان عمارت طلبہ کے رہنے کے لیے دے دی۔

دو برس کے بعد اردو کانفرنس کا اجلاس دلی میں ہوا۔ تقریریں پڑھیں، تجویزیں دیکھیں، مشاعرہ کی غزلیں سنیں۔ لیکن یہ نظر نہ آیا کہ دیہاتوں سے، تحصیلی اسکولوں سے، کچہریوں سے، ڈاک خانوں سے جس اردو کو شہر بدر کیا جا رہا ہے اور مسلمان طلبہ اور معاملہ داروں کو ہندی قبول کرنے پر مختلف تدبیروں اور حیلوں سے مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس کے روک کی کیا صورت ہے۔ اس دفعہ وقت کی تنگی کے باعث صرف ڈھانچ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ کچھ ہو رہے گا۔ حکیم ناصرالدین صاحب ابن شفاء الملک مرحوم دہلوی کی مسیحائی اس ڈھانچ میں شاید روح پھونک کر رہے۔

(معارف، جنوری ۱۹۱۹ء)

عدم تعاون، اردو

عدم تعاون اور ترک موالات کے مسئلہ نے ہندوستان کے سطح تعلیمی میں جو زلزلہ پیدا کر دیا ہے۔ اس سے عربی مدارس بھی غیر متاثر نہ رہے۔ مدرسۂ عالیہ کلکتہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۂ نور بانکی پور، مدرسۂ دارالعلوم مئو (اعظم گڑھ)، دارالعلوم اسلامیہ پشاور کے نام اس سلسلہ میں سننے میں آئے ہیں۔ اگر ہم سے پوچھا جائے تو ان مدارس میں اگر یہ تحریک اس وقت عام نہ بھی ہوتی، تو بھی مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا توڑنا ہر حیثیت سے فرض تھا۔ یہ وہ مچھلی ہے جس نے بنگال کے تمام تعلیمی تالابوں کو گندہ کر رکھا ہے۔ بنگال کے وسیع رقبہ میں ایک درس گاہ ایسی نہیں، جو مدرسۂ عالیہ کے جال سے محفوظ ہو، اس وقت صوبۂ بنگال میں کم از کم ۲۵ ہزار طالب علم عربی پڑھنے میں مشغول ہیں اور سینکڑوں مدرسے ہر طرف قائم ہیں۔ لیکن یہ اس طرح مدرسہ عالیہ کے نظم و نسق و ترتیب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کے دیگر صیغوں اور محکموں کی طرح دست شل ہو کر رہ گئے ہیں، جن میں ہر طرح کی ترقی و تجدید و اصلاح ناممکن ہے اور وہ کسی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی و تعلیمی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے ہیں اور ان کا وجود ان کی جگہ پر دوسرے مدارس کے قیام کے لیے سدّ سکندری ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر بنگال کی عربی تعلیم کی اصلاح کا کام انجام پا جائے، تو در حقیقت قوم کی ایک بڑی ضرورت رفع ہو جائے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ارکان انتظامی نے ڈیڑھ دن کے متصل و سرگرم مباحثہ کے بعد ۵۰۰ ماہوار کی سرکاری اعانت کا لینا بند کر دیا۔ دارالعلوم کے لیے یہ رقم اس قدر ناگزیر تھی کہ اس

کے ہٹ جانے کے بعد فوراً اس کی زندگی گویا معرض خطر میں آ گئی ہے۔ تقریباً ایک ہزار ماہوار کا اس میں صرف ہے۔ سرکاری امداد کے انکار کے بعد صرف سرکار بھوپال کی ۲۵۰ روپیوں کی ایک امداد اس کے پاس رہ گئی ہے۔ کسی اور قسم کا سرمایہ اس کے پاس نہیں۔ ہماری درخواست پر مدرسین کرام نے اپنی مقدس جماعت کے رتبہ کے مطابق بڑے ایثار کا ثبوت دیا تاہم تین برس کے لیے کم از کم تیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ کیا ہم قوم سے امید رکھیں کہ اس کی جھولی کے بھرنے میں اپنے رتبہ کے مطابق ایثار کا ثبوت دے گی۔

ع خدا شرّے بر انگیزد کہ خیر ما درو باشد

اس مصرع کی صحیح بیانی کی تصدیق موجودہ مسئلۂ ترک موالات کے ضمن میں بھی ملے تو عجب نہیں۔ سرکاری یونیورسٹیوں سے قطع تعلق کے بعد قومی یونیورسٹیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ یونیورسٹیاں علی گڑھ اور احمد آباد میں قائم ہورہی ہیں۔ ان میں تعلیم کی زبان اردو، ہندی اور گجراتی ہوگی۔ ہمارا مدت سے خیال ہے کہ کوئی زبان بغیر تعلیمی زبان بنے علمی اور عام زبان نہیں بن سکتی، اگر قومی یونیورسٹیوں کا خواب سچا نکلا، تو آپ تھوڑے ہی دنوں میں دیکھ لیں گے کہ آپ کی زبان ہر قسم کے لٹریچر سے کس قدر مالا مال ہوجاتی ہے۔

بیسویں صدی کا پہلا سال (۱۹۰۱ء) تھا کہ اردو اور ہندی نے دو رقیب پہلوانوں کی حیثیت سے سرکاری محکموں کے دنگل میں قدم رکھا۔ اس دنگل کے جگت استاد میکڈانل صاحب کی نیت جو کچھ ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ ان کا پیچ دونوں حریفوں کو دست و گریباں کرنے میں نہایت کامیاب ہوا۔ اس وقت سے اس وقت تک اردو ہندی کے جھگڑوں نے ہماری بزم ادب کو مکدر اور غمزدہ کر رکھا ہے۔ بیس برس کے بعد گجرات کی خاک سے ایک صلح جو اور مرنج و مرنجان ہستی (گاندھی) نے ظہور کیا، جس نے اردو ہندی کے تمام جھگڑوں اور نزاعوں کو سن کر فیصلہ کیا کہ ان کی حیثیت نزاع لفظی کے سوا اور کچھ نہیں، اور اس لیے ایک تیسری اصطلاح وضع کی یعنی ہندوستانی، گو اس اصطلاح کے اصل واضع انگریز ہیں، تاہم یہ بدیسی چیز اگر دو قوموں کے درمیان مصالحت کراسکے، تو سودیشی کے حامی اس کو برا نہ جانیں گے۔

آج کل جب ایک متحدہ ہندوستان کی بنیاد ڈالی جارہی ہے اور ہندوستانیوں کی ایک متحدہ

قومیت کی تعمیر کی فکریں ہورہی ہیں۔ملک کے لیے ایک متحدہ زبان سے چارہ نہیں۔کسی قوم کے اتحاد کے صرف تین عناصر ہیں۔نسل، مذہب اور زبان۔نسل کے لحاظ سے تو ہندوستان دنیا کی قوموں کا مجموعہ ہے۔اس لیے یہ اتحاد تو سرے سے مفقود ہے۔مذہب کا اتحاد بھی ناممکن ہے۔لے دے کے صرف ایک زبان رہ گئی۔اگر وہ بھی ایک نہ ہو،تو متحدہ قومیت کی دیوار کی اینٹیں کس مسالہ سے پیوست ہوں گی۔اب کہ قومی تعلیم کا سوال درپیش ہے۔اس مدت کے الجھے ہوئے مسئلہ کو بھی طے کردینے کا موقع ہے۔

ہم نے متعدد دفعہ انہی صفحات میں اس مسئلہ کا تذکرہ کیا ہے اور جب کبھی سمجھدار ہندو مسلمانوں کے مجمع میں بولنے کا اتفاق ہوا ہے، ادھر ان کو توجہ دلائی ہے۔کیمبرج کے ہندوستانی طلبہ کے مجمع میں جہاں تمام ہندوستان کے صوبوں کے نوجوان فرزند موجود تھے۔اس مسئلہ پر پرزور تقریر کی۔۶/اکتوبر کو بمبئی کی نوجوان ہندوستانیوں کی ہوم رول لیگ میں اس کی طرف توجہ دلائی۔کیونکہ اب نظر آتا ہے کہ اردو ہندی کی کشمکش ہندوستان کی دونوں قوموں کے درمیان اجنبیت اور بے گانگی کی ایک دیوار کھینچ رہی ہے۔ابھی ۱۰/نومبر کو مئو میں ایک جلسہ کی شرکت کا اتفاق ہوا، جس میں ایک سوامی جی بھی جو گروکل کے تعلیم یافتہ تھے۔مقرر کی حیثیت سے شریک تھے۔ہم دونوں کی تقریروں کا موضوع بھی ایک ہی تھا لیکن یہ کیا عجیب بات تھی کہ نہ وہ میری پوری تقریر سمجھ سکے اور نہ میں ان کی پوری بات سمجھ سکا۔کیا حکومت ملکی یا سوراج کے حصول کے بعد ہمارے ایوان حکومت کے ارکان کا بھی یہی حال ہوگا۔

اردو اور ہندی میں جو فرق ہے۔وہ درحقیقت نہایت معمولی ہے۔ہر زبان تین عنصروں سے مرکب ہوتی ہے۔اسم، فعل اور حرف، اردو اور ہندی میں جس قدر افعال اور حروف ہیں، وہ تمامتر ایک ہیں۔جھگڑا صرف اسماء کا ہے، اگر عربی اور فارسی اسماء زیادہ ہیں، تو وہ اردو ہے اور سنسکرت اور بھاشا کے اسماء زیادہ ہیں تو وہ ہندی ہے۔اس مسئلہ میں دونوں زبانوں کے حامیوں کے درمیان افراط وتفریط ہے۔ہمارا خیال یہ ہے کہ اس وقت تک جو زبان ہندوستانی کے نام سے پشاور سے لے کر برما تک بولی جاتی ہے اور اس میں جس حد تک عربی، فارسی، سنسکرت اور بھاشا کے اسماء اس کے اندر آگئے ہیں۔وہ مطلب کے ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔اب نئے نئے اور موٹے موٹے عربی یا

فارسی یا سنسکرت کے الفاظ بھر کر دو مختلف زبانیں بنانا نامناسب ہے۔ آج سے بیس برس پہلے جس کو ہندی کہا جاتا ہے اس کا وجود بھی نہ تھا۔ دیہاتوں میں ہندو مسلمان جو زبان بولتے ہیں وہ ایک دہقانی زبان ہے، جو ہر ملک کے دیہاتوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ کہیں دفتری یا علمی زبان نہیں بنائی گئی۔

یورپ میں سوئٹزرلینڈ کی بالکل یہی کیفیت ہے۔ اس پہاڑی ملک میں جرمن، فرنچ اور اٹالین تین قومیں آباد ہیں۔ اور ہر قوم اپنی زبان بولتی ہے اور اپنی آبادی میں اس کی تعلیم معاملات اور دفتر کی وہی زبان ہے، لیکن کل ملک کی عمومی دفتری زبان بھی ایک ضرور ہے اور وہ فرنچ ہے۔ اسی طریقہ سے اگر ہندوستان کی صوبہ دار زبانیں اپنے اپنے صوبوں میں بولی جائیں تو کچھ حرج نہیں۔ بشرطیکہ ایک نہ ایک عمومی زبان طے ہو جائے۔

اردو میں عمومی زبان بننے کی مختلف ترجیحی دلیلیں ہیں۔ اول یہ کہ کم از کم ایک قوم یعنی مسلمانوں کی یہ مشترکہ زبان ہے لیکن ہندی کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ عملاً ہر صوبہ میں یا ہر اسٹیشن پر بیرونی ملک کے ہندوستان میں رہنے والوں کے اندر بلکہ ہندوستان سے باہر بھی یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس سفر یورپ میں اردو کی جغرافی وسعت پر سخت تعجب آیا، ہندوستان سے باہر عدن کی تو یہ گویا زبان ثانی ہوگئی ہے۔ وہاں بے تکلف یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ حضرموت کا ایک عرب لڑکا مجھے مصوع سے آتے جہاز پر ملا، وہ خاصی اردو بولتا تھا۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کبھی ہندوستان نہیں گیا۔ عدن میں انگریزوں کی نوکری اس نے کی ہے۔ مصر میں پورٹ سعید کے تمام خلاصیوں اور ملاحوں کو دیکھا کہ وہ خاصی اردو بولتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ہندوستان کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مصوع کے افریقی سواحل پر بھی یہی منظر نظر آیا۔ یہ صرف ہندوستانی مسافروں کی آمد و رفت کا نتیجہ ہے۔ بصرہ، خلیج فارس اور حجاز کی بھی یہی کیفیت سنی ہے۔ ادھر افغانستان تک اس کا اثر اور اقتدار معلوم ہوتا ہے۔ افغانستان کے اخبارات کی زبان تک سے اردو کی بو آتی ہے۔ علاوہ ازیں انڈمان، پورٹ بلیر، جنوبی افریقہ، ماریشس، جہاں جہاں ہندوستانی پہنچے ہیں۔ ہندوستان کی یہ زبان جس کو خواہ اردو کہو، ہندی کہو یا ہندوستانی پھیلتی چلی گئی ہے۔

(معارف، نومبر ۱۹۱۹ء)

مسلم یونیورسٹی کا افتتاح

سنہ ۱۷ ماہ حال کو علی گڑھ میں اس ''مسلم یونیورسٹی'' کا افتتاح ہوگیا، جو سرسید مرحوم کے ''رویائے یوسفیؑ'' کی تعبیر خیال کی جاتی ہے۔ اگر یہ عید شام کو نہ ہوئی ہوتی تو وائس چانسلر کا نغمۂ مسرت صرف اسٹریچی ہال میں گونج کر نہ رہ جاتا، بلکہ اس کی آواز بازگشت سارے ہندوستان میں سنائی دیتی اور ہم بھی بغداد وقرطبہ کی کھوئی ہوئی دولت کا اس کو نشان بازیافت سمجھ کر خوش ہوتے۔ لیکن اب تو اگر ہم اس کو آب حیات بھی سمجھنا چاہیں تو بھی مسلمانوں کی ''مرگ آرا'' غیرت قلم پکڑ لیتی ہے۔ اور عرفی کی زبان سے کہتی ہے کہ

منت بازیچۂ عیسیٰ مکش بہر حیات
ارزش مردن بپرس زنفس ''مرگ آرائے'' من

(معارف، دسمبر ۱۹۲۰ء)

علی گڑھ میں عربی کی تعلیم

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پر اس وقت سے جب وہ فقط کالج تھا۔ ارباب نظر کا یہ اعتراض چلا آتا ہے کہ عربی تعلیم کے لیے وہاں یورپین، عیسائی یا یہودی پروفیسر کیوں رکھے جاتے ہیں اور اب نیا کیوں بلوایا گیا ہے۔ علاوہ مذہبی بدنمائی کے اور علماء سے قطع نظر کر کے جب اسی قابلیت ولیاقت کے، بلکہ اس سے بہتر خود مسلمان پروفیسر مل سکتے ہیں تو سات سمندر پار سے ڈیوڑھی اور دوگنی قیمت پر علوم عربیہ کے یورپین اساتذہ کیوں بلوائے جاتے ہیں۔ ایک علم فلسفہ لغت یا موازنہ السنۂ سامیہ اور کتب خانہ ہائے یورپ کی فہرست کتب کے علاوہ علمی حیثیت سے وہ ہمارے عام مسلمان علمائے ہند سے جنھوں نے جدید طرز سے تھوڑی بھی آگاہی حاصل کی ہو۔ ان کی ذات ایک ذرہ بھی ممتاز نہیں ہوتی۔ بہتر ہو کہ ہماری یونیورسٹی میں آیندہ سے فارسی پڑھانے کے لیے بھی کسی فرنچ اور اردو پڑھانے کے لیے کسی جرمن کی خدمات حاصل کی جائیں۔

حالانکہ یہ سن کر ہمارے ارکان مسلم یونیورسٹی کو افسوس ہوگا کہ جو اساتذہ ہزاروں روپے تنخواہوں پر وہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ ہمارے ہی سیاہ رنگ بھائیوں کے آگے زانوے ادب تہ کر کے عالم بنتے ہیں۔ اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں فخر کے ساتھ قبول کیے جاتے ہیں۔ لندن کے

مدرسۃ السنۂ مشرقیہ (اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز) میں اردو، فارسی، عربی اور ترکی پڑھانے کے لیے ہندی، ایرانی، عرب اور ترک نوکر ہیں۔ علی رضا بے وہاں ترکی اور ایک بغدادی مسلمان اور ایک شامی عیسائی عربی پڑھاتے ہیں اور ہمارے ہی کالج کے تعلیم یافتہ ملک عبدالقیوم اردو سکھاتے ہیں۔ کیمبرج میں خلیل خالد بے پہلے تھے۔ اب قدری بے اور ہندوستان کے عبدالحیی عرب ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر، سرولیم میور، ڈاکٹر لیٹز، ڈاکٹر راس، ڈاکٹر آرنلڈ، سر چارلس لائل، جنہوں نے یورپ جا کر علوم مشرقیہ کے متبحر کا نام پیدا کیا۔ وہ فیض ان کو اسی ہندوستان سے پہنچا ہے۔ اس وقت پروفیسر براؤن اور پروفیسر مارگولیوتھ جو کیمبرج و آکسفورڈ کے آج کل آفتاب و ماہتاب ہیں۔ وہ برفستان یورپ میں نہیں، بلکہ ایران و مصر و شام کی خاک چھان چکے ہیں۔ فرانسیسیوں کو مشرق کا علم تونس اور الجزائر کے جبہ پوشوں سے پہنچا ہے۔

علی گڑھ کالج میں عربی تعلیم کی شاخ کھلنے سے لے کر آج تک دو پروفیسر یورپ سے آچکے ہیں۔ ڈاکٹر ہارویز اور ڈاکٹر اسٹوری، لیکن جس قدر وہ ہمارے طلبہ کو سکھا گئے، اس سے زیادہ وہ ہمارے علماء سے سیکھ گئے۔ جب آئے تھے تو سیدھی عربی بھی نہیں پڑھ سکتے تھے اور اب واپس جا کر اکابر مستشرقین میں داخل ہیں۔ یہ سب سن کر آپ کہیں گے کہ سب سچ لیکن ہم کو تو جو چیز ملے گی وہ یورپ ہی کی گداگری سے ملے گی۔ خواہ وہ سیاست ہو یا معاشرت، مغرب کا علم ہو یا مشرق کا۔

لیکن اسی ملک میں اور اسی صوبہ میں ہماری ہی یونیورسٹی کی ہمزاد ایک ہندو بنارس یونیورسٹی ہے۔ یہاں بھی اس کی مقدس مذہبی زبان کی تعلیم کے لیے پروفیسر ہوتے ہیں۔ سنسکرت کے بہترین یوروپین عالم جرمن اور فرنچ ہیں۔ لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے، اس کی پیشانی پر کسی جرمن یا فرنچ سنسکرت اسکالر کے حصول خدمات کا داغ نہیں اور بغیر ان کے خود ہندی پنڈت اپنی زبان کی تعلیم آپ نہایت خوبی سے دے لیتے ہیں، پھر ہم کیوں نہیں کر سکتے؟ جواب یہ ہے کہ ہم نے عربی کا وظیفہ ہی سرکار سے اس شرط پر لیا ہے کہ ہم اپنی مذہبی تعلیم اپنوں سے نہیں بلکہ آپ ہی سے سیکھیں گے۔ (معارف، فروری ۱۹۲۱ء)

عثمانیہ یونیورسٹی

الحمدللہ کہ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) نے بارآوری شروع کردی۔ میٹری کولیشن کے

امتحانات تو کئی سال سے ہو رہے تھے۔ اس سال انٹر میڈیٹ کا بھی پہلا امتحان لیا گیا، جس کے نتائج اسی مہینہ میں انگریزی و اردو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

ان نتائج میں جہاں تک ظاہری پہلو کا تعلق ہے۔ ہندوستان کی عام یونیورسٹیوں کو دیکھتے ہوئے دو باتوں میں نمایاں ترقی ہے۔ ایک تو یہ کہ نتیجہ جلد ظاہر ہو گیا، اوائل مئی میں امتحانات ختم ہوئے تھے اور غالباً اوائل جون ہی میں طلبہ کو اپنے مستقبل کے بارہ میں یکسوئی حاصل ہو گئی ہو گی، دوسرے یہ کہ انٹر میڈیٹ میں کامیاب طلبہ کا تناسب نہایت ہی حوصلہ افزا ہے، یعنی ۱۱۶ میں صرف ۲۸ ناکام رہے۔ ان ۲۸ میں بھی ۱۳ وہ ہیں جو خانگی (پرائیویٹ) طور سے شریک ہوئے تھے۔ اور کالج کی تعلیم سے استفادہ نہیں کیا تھا۔ البتہ میٹری کولیشن میں خانگی طور سے شریک ہونے والے امیدواروں کو نکال کر بھی کامیابوں کا تناسب (۳۳ء ۵) فی صدی ہے۔ جس کے اسباب کی تحقیق و اصلاح یقیناً یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کی توجہ کی طالب ہے۔ ۵۷۶ طلبہ میں (گو ان میں خانگی شرکاء بھی شامل سہی)، ۴۵۹ کا فیل ہو جانا قطعی ایک قتل عام ہے۔

امتحان، نصاب تعلیم اور طرز تعلیم وغیرہ میں اگرچہ عثمانیہ یونیورسٹی سر دست (شاید بعض عارضی مصالح کی بنا پر) دیگر ہندوستانی یونیورسٹیوں ہی کے ناقص نظام کی پیروی کر رہی ہے۔ لیکن ذریعہ تعلیم اجنبی زبان کے بجائے ملکی زبان کو قرار دینا جس پر اس یونیورسٹی کی بنیاد ہے ہمارے یونیورسٹیوں کی تاریخ میں ایک ایسا اہم اصلاحی قدم ہے، جس کی بنا پر تمام ملک کی نگاہیں اس کی جانب لگی ہوئی ہیں۔ اس لیے اگر نتائج امتحان کے ساتھ ان نتائج کی بھی جو مادری زبان میں تعلیم دینے سے تجربہ میں آئے ہوں گے۔ ایک مختصر رپورٹ شامل ہوتی تو مناسب تھا۔

ایک اور بڑی کمی علی العموم ہندوستانی یونیورسٹیوں میں یہ ہے کہ خود ہندوستانی و مشرقی علوم و السنہ کے ساتھ غایت بے التفاتی برتی جاتی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان کے ساتھ اختیاری مضامین کی جو فہرست ہم کو موصول ہوئی ہے۔ وہ خود بھی اگرچہ اس نقطہ نظر سے نہایت ہی مایوس کن ہے، تاہم تاریخ اسلام اور دکنی زبانوں (تلنگی، مرہٹی، کنڑی) کے نام اس میں نظر آتے ہیں، جو دوسری یونیورسٹیوں (الا ماشاء اللہ) کی فہرست مضامین میں نہ ملیں گے۔

تاریخ اسلام لینے والے طلبہ کی تعداد بھی خاصی ہے۔ یعنی ۲۱، البتہ عربی اور سنسکرت لینے

والوں کا اوسط وہی ہے جو کم و بیش دوسرے کالجوں میں رہتا ہے یعنی علی الترتیب ۸ اور ۴۔

یادش بخیر! غالباً اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک مستقل شعبۂ مشرقی کے قیام کا اعلان کیا تھا، جس کے معلمین کے نام بھی شاید سرکاری گزٹ میں شائع ہوگئے تھے، لیکن پھر کچھ حال نہ معلوم ہوا کہ یہ شعبہ کہاں تک اپنے وجود کو حق بہ جانب ثابت کررہا ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۲۱ء)

آل انڈیا اردو کانفرنس اور انجمن ترقی اردو

۱۰ء میں بدایوں سے ایک پرزور آواز آل انڈیا اردو کانفرنس کی تحریک قیام کے لیے اٹھی تھی، لیکن جس تیزی کے ساتھ یہ آواز اٹھی تھی۔ اسی سرعت کے ساتھ اس زمین میں مدفون ہوگئی، جو مزارات شہداء کے لیے مشہور ہے۔ ۱۶ء میں بزرگان لکھنؤ نے اس نقارہ پر اس زور سے چوب لگائی کہ علی گڑھ، بنارس، پٹنہ و اورنگ آباد تک کے در و دیوار جنبش میں آگئے۔ لیکن کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا کہ یہ کسی ساحر قیصر باغ کے جرس کارواں کی صدائے بازگشت تھی۔

اسی کے سال دو سال بعد یہ برق افق دہلی پر چمکی، لیکن معاً نظر آگیا کہ اس کا مقصد زائرین حرم ادبیات کو روشنی پہنچانا نہیں، بلکہ ان کی نگاہوں کو خیرہ کردینا تھا۔ خیر یہ تاریخ تو اردو کانفرنس کی تھی، جو ابتدا ہی سے ایک تفریح و تفنن کی چیز تھی۔ البتہ انجمن ترقی اردو ایسی مجلس تھی جو اپنی بساط کے موافق فی الجملہ قابل قدر خدمات انجام دے رہی تھی۔ لیکن اب دو ایک برس سے اس کے بھی کہیں اجلاس منعقد ہونے کی خبر نہیں آتی۔ اگر اس کے اجلاس اب بند ہوگئے تو یہ مطلق حیرت انگیز نہیں۔ حیرت اس پر ہے کہ اتنے عرصہ تک کیوں کر ہوتے رہے۔ جس چراغ کا تیل بالکل ختم ہوچکا ہے، وہ اگر کچھ دیر جھلملاتی ہوئی روشنی دیتا رہے، تو اس پر حیرت ہوسکتی ہے لیکن اگر وہ فوراً بجھ جائے تو کسی کو بھی تعجب نہ ہوگا۔ (معارف، جنوری ۱۹۲۲ء)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جس کی بابت امیدیں یہ دلائی گئی تھیں کہ وہ قرطبہ اور بغداد کی جانشین ہوگی۔ بالآخر جب وہ وجود میں آگئی تو اس کا سب سے پہلا کارنمایاں دنیا کے سامنے یہ پیش ہوتا ہے کہ ۱۲؍فروری کو شاہزادہ ولی عہد بہادر مسلم یونیورسٹی کی سرزمین کو اپنے ورود سے مشرف کریں

گے۔ یونیورسٹی انہیں ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری دے گی اور ان کے ساتھ چار اور صاحبوں کو بھی ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری عطا ہوگی۔ یہ قابل رشک ارکان اربعہ کون ہیں؟ (۱) گورنر صوبہ متحدہ (۲) ممبر تعلیمات حکومت ہند (۳) مہاراجہ صاحب گوالیار (۴) اور نواب صاحب رام پور۔ اس سے قطع نظر کرکے کہ مسلم یونیورسٹی کی یہ انگریز نوازی موجودہ مسلم جذبات کے کہاں تک موافق ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن خوش نصیب اصحاب اربعہ پر یہ اعزاز کی بارش ہونے والی ہے۔ وہ واقعتاً اس اعزاز سے کچھ بھی مناسبت رکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب آج مسلم یونیوسٹی کے ارباب حل وعقد آسانی سے ٹال سکتے ہیں لیکن ایک وقت آنے والا ہے، جب یہ سوال اس آسانی سے نہ ٹل سکے گا۔ اور جب دنیا کی ہر امانت کی طرح اس امانت کا بھی حساب دینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ بہتر ہوگا اس وقت کے لیے کوئی معقول جواب ابھی سے سوچ رکھا جائے۔

یونیورسٹیوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ علم و اخلاق کی روایات کو زندہ رکھا جائے اور ان کی زندگی کو ترقی دی جاتی رہے۔۔ آنریری ڈگری انتہائی اعزاز ہے، جو کوئی یونیورسٹی اپنے اصل مقاصد کے لحاظ سے کسی فرد کو دے سکتی ہے۔ باقی اگر کسی دولت مند نے باوجود علم و اخلاق سے معرا ہونے کے یونیورسٹی کی مالی مدد کی ہے، تو اس احسان کے اعتراف کے لیے یونیورسٹی کے پاس اور بہت سی صورتیں ہیں، مثلاً یہ کہ اسے یونیورسٹی کا رکٹر منتخب کردیا جائے۔ اس کے نام پر کوئی عمارت یونیورسٹی میں تعمیر کرادی جائے۔ وقس علی ہذا، لیکن اعزازی ڈگری کے استحقاق کا معیار تمام تر علمی امتیاز و بلندی اخلاق پر ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے آنریری ڈگری پانے والے اصحاب نے اگر اس حیثیت سے اپنی اہلیت کا کوئی ثبوت دیا ہے، تو اسے یقیناً علی گڑھ کے وائس چانسلر یا خزانچی صاحب کے دفتر کی کسی آہنی الماری میں بہت مضبوط قفل ڈال کر چھپا دیا گیا ہے۔

دنیا کی دوسری یونیورسٹیوں میں آنریری ڈگریاں جس درجہ کے کاملین فنون واساتذۂ علوم کو ملتی رہتی ہیں۔ اس کی توضیح کے لیے یورپ و امریکہ سے مثالیں تلاش کرکے لانے کی حاجت نہیں۔ خود ہندوستان میں علی گڑھ سے چند قدم پر بنارس اور ذرا آگے بڑھ کر کلکتہ ہے۔ ولی عہد بہادر کا ورود ان دونوں جگہوں میں بھی ہوا۔ آخر ان یونیورسٹیوں نے اس موقع پر کیا کیا؟ بنارس کی ہندو یونیورسٹی نے ڈاکٹر کی آنریری ڈگری دی، مگر کس کو؟ مسز بیسنٹ کو جن کے ہاتھوں ہندو کالج کی بنیاد

پڑی تھی، جن کی ایک عمر ہندو علوم وفنون کی ترویج واشاعت میں بسر ہو چکی ہے۔ اور جن کی علمی ودماغی قابلیت کا اعتراف ملک کے نہیں، دنیا کے گوشہ گوشہ سے ہو چکا ہے۔ کلکتہ کی سرکاری یونیورسٹی نے متعدد اشخاص کو ڈاکٹر کی آنریری ڈگریاں دیں، مگر یہ کون لوگ تھے؟ یہ وہ تھے، جو اپنی عمریں فلسفہ، سائنس، تاریخ وادب کی خدمت گذاری میں صرف کر چکے ہیں، جن کا نام علمی دنیا میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے اور جن کی عزت و تعظیم کرنا خود علم وفن کی عزت و تعظیم کرنا ہے۔ مسلمانوں میں بیشک قحط الرجال ہے لیکن کیا یہ قحط اس قدر سخت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو اپنے اخوان طریقت میں چند افراد بھی اس پایہ کے نظر نہ آئے؟ ان لوگوں سے قطع نظر کیجیے، جن کی سیاسیات مسلم یونیورسٹی کے نزدیک قابل نفرت ہے، تو بھی کیا اہل موالات میں ایک متنفس بھی اس پایہ کا نہیں نکل سکتا؟ سید امیر علی کی خدمات تاریخ و مذہب، عماد الملک سید حسین بلگرامی کا علم وفضل و تعلق علی گڑھ، ڈاکٹر اقبال کی فلسفیانہ وادبی عظمت، جسٹس عبدالرحیم کی قانونی وسعت نظر، مولوی عبدالحلیم شرر کی خدمات زبان وادب، شاید یہ تمام قربانیاں مسلم یونیورسٹی کی درگاہ میں ناقابل قبول ہیں۔

خیر عزت تو جس کی ہے، صرف اسی کی ہے۔ (وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) اور اسی رب العزت کی رحمت کے طفیل میں پیمبروں اور پھر عام مومنین کی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (منافقون۔ ع ۱) اس کو کسی یونیورسٹی کی اعزازی ڈگریاں گھٹا بڑھا نہیں سکتیں۔ اس کا تعلق تو صرف ایمان و اعمال صالحہ سے ہے۔ البتہ نااہلوں کو زبردستی علم یا حکومت کا لباس پہنا دینا، بالآخر خود انہیں کے حق میں اور ساری قوم کے حق میں مضر ہوتا ہے۔ مولانا رومی نے کیا خوب تمثیل دی ہے کہ نااہل کو عالم یا حاکم بنا دینا۔ رہزن کے ہاتھ میں تلوار دے دینا ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔

بد گہر را علم و فن آموختن دادنِ تیغ بدست راہ زن
تیغ دادن در کف زنگی ست ہر کہ آید علم ناکس را بدست
علم و مال و منصب و جاہ و قران فتنہ آمد در کف بد گوہران
پس غزازیں فرض شد بر موموناں تا ستانند از کف مجنوں سنان

قوم کے نادان دوست اسی غزا و جہاد کے وقت کو اپنے اعمال سے قریب بلا رہے

ہیں۔(معارف، جنوری ۱۹۲۲ء)

ہندوستان کے زندان خانوں کی نوآبادیاں اور اردو

ہندوستان کے زندان خانوں کی نوآبادیوں میں فرزندان ہند کے مختلف فرقوں اور مذہبوں کے نمایندے شریک ہیں۔ ان میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی، سکھ بھی ہیں اور عیسائی بھی۔ یہ تمام اصحاب گو مختلف قومیتوں، مختلف مذہبوں، مختلف فرقوں، مختلف خاندانوں اور مختلف زبانوں کے افراد ہیں، لیکن ان اختلافات کے باوجود ایک ہی روح ہے جو سب میں ساری ہے۔ ایک ہی خیال ہے، جو سب پر مستولی ہے اور ایک ہی نشہ ہے جو سب پر چھایا ہوا ہے اور اس طرح باوجود الگ الگ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے حب وطن اور نصرت حق کی ایک ہی زنجیر میں وہ بندھے ہوئے ہیں۔ یہ مختلف قوموں، مذہبوں، فرقوں اور خاندانوں کے صدہا افراد کی شب و روز کی یکجائی، ذاتی ملاقات و واقفیت، مبادلۂ خیال، اظہار محبت، معاونت و دست گیری، تاثیر و تاثر یقیناً ہندوستان کے مختلف عناصر کی باہمی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے نئے سرے سے ان میں باہم اعتماد، محبت و اخوت اور مصالحت و رواداری کی روح پیدا کر دی گئی۔ اور وہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کی پوری قدر کرنا سیکھیں گے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ آج کے ہندوستان کے قید خانہ میں کل کے ہندوستان کی نئی قومیت تعمیر پا رہی ہے۔ یہ افراد جو قید سے پہلے ایک دوسرے سے شناسا بھی نہ تھے۔ ایک مدت کی محبت و دوستی، معرفت اور پہچان کے بعد جب تنگنائے زندان سے باہر میدان عمل میں آئیں گے، تو ہمارے رہبروں اور کام کرنے والوں کی ایک جماعت ہمارے اندر ہوگی، جو ایک دوسرے سے اچھی طرح شناسا اور جان پہچان والے ایک دوسرے کے خیالات، حالات، محسوسات اور جذبات سے واقف و مطلع اور مہینوں اور برسوں کے برادرانہ اتحاد سے پر کیف اور سرشار ہوں گے۔ اس نتیجہ کو پیش نظر رکھیے تو ہمارے نگاہوں کے سامنے مستقبل کا کس قدر خوش آیند منظر ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو زندان سے باہر کبھی ہندوستان کو نہیں مل سکتی تھی۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

اسی خوش آیند مرقع کا ایک منظر آگرہ ڈسٹرکٹ جیل ہے۔(فروری ۱۹۲۲ء)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شاہزادہ ولی عہد بہادر کے ورود کے موقع پر آنریری ڈگریوں کی جس فیاضانہ تقسیم کا اعلان فرمایا تھا۔ اس کا ذکر معارف کے جنوری نمبر میں آچکا ہے۔ کس قدر حسرت ویاس کا مقام ہے کہ دنیا کی دوسری تمناؤں کی طرح یہ تمنا بھی پوری نہ ہوسکی۔ نہ شہزادہ صاحب نے قدم رنجہ فرمایا، نہ اکابر قوم کو حضوری کی قابل رشک سعادت حاصل ہوسکی اور نہ آنریری ڈگریوں کی فیاضانہ تقسیم ہوسکی، جو دنیا کی تاریخ میں یادگار رہ جاتی، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ہم بزرگان ملت کی خدمت میں اپنی دلی ہمدردی وتعزیت کا تحفہ بہ صد ادب پیش کرتے ہیں لیکن معلوم ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد، غالب کے فلسفہ

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

کے پورے رازشناس تھے، ''راویٔ معتبر'' کا بیان ہے کہ ٹھیک اسی تاریخ کو جبکہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کی یہ دلچسپ مجلس ہونے والی تھی۔ ان حضرات نے علی گڑھ ولکھنؤ کے وسط میں ایک مشہور اسلامی ریاست میں ایک دوسری بزم سرور ترتیب دی اور علی گڑھ کا غم غلط کرنے کے لیے ایک شبانہ روز مخموری و سرخوشی میں بسر فرمایا۔ (معارف، مارچ ۱۹۲۲ء)

ہندوستانی اور اردو

اب تک حکمراں طبقہ کا یہ خیال تھا کہ ملکی زبانوں میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ تعلیم علوم و فنون کا آلہ بن سکیں۔ چنانچہ اگر آج سے کچھ پیشتر کونسل میں یہ مسئلہ چھڑا ہوتا تو یقیناً یہی جواب ملا ہوتا لیکن الحمدللہ کہ اس موقع پر گورنمنٹ کی جانب سے یہ کہنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی، گورنمنٹ کی جانب سے تجویز کی مخالفت میں جو دلائل پیش کیے گئے، تشفی بخش تو ان میں سے کوئی بھی نہ تھے، تاہم بعض ایسے تھے جو اصل موضوع سے بالکل غیر متعلق تھے۔ مثلاً صیغۂ تعلیمات کے سکریٹری صاحب کا یہ فرمانا کہ ہندوستان بھر کے تعلیم یافتہ گروہوں میں رشتۂ اتحاد پیدا کرنے والی انگریزی زبان ہے، یا یہ کہ سلطنت برطانوی کے دوسرے حصوں کی، جن سے ہندوستان کو ہر وقت سابقہ رکھنا ہے۔ زبان انگریزی ہے۔ یہ دلائل اس وقت البتہ کچھ قوت رکھ سکتے تھے۔ جب انگریزی زبان کو مٹا کر ملکی زبان میں تعلیم دینے کا مطالبہ ہوتا۔ حالانکہ اس وقت خواہش صرف اتنی ہے کہ انگریزی کے پہلو بہ پہلو ملکی

زبانوں میں بھی تعلیم ہوتی رہے۔ اور بعض دلائل ایسے تھے جو سرتاسر ناواقفیت یا غلط فہمی پر مبنی تھے، مثلاً یہ کہنا کہ ''اردو اور ہندی ان دونوں میں سے کون سی ملکی زبان قرار دی جائے۔ دو میں سے کوئی ایک جو بھی رکھی جائے گی، دوسرا فریق اس کی سخت مخالفت کرے گا اور ایک ہنگامۂ فساد گرم ہوجائے گا۔

گورنمنٹ اور بعض برادران وطن کی یہ اصولی غلطی مدت سے چلی آرہی ہے کہ وہ صوبہ کی دو زبانیں ایک دوسرے سے مختلف قرار دیتے ہیں۔ مشترک زبان صرف ایک ہے جسے ہندوستانی سے موسوم کرسکتے ہیں۔ اس کی بیسیوں شاخیں اور صورتیں ہیں۔ ہر ضلع کی بولی دوسرے ضلع سے مختلف ہے۔ ہر طبقہ کی زبان دوسرے طبقہ کی زبان سے متمائز ہے۔ دہقانیوں کی زبان شہریوں سے، شہریوں کی زبان عوام سے، پڑھے لکھوں کی زبان اَن پڑھوں سے، عالموں کی زبان غیر عالموں سے، دوکان داروں اور مہاجنوں کی زبان شاعروں اور ادیبوں سے، یقیناً ممتاز ہے۔ لیکن کیا کوئی منصف مزاج شخص ان امتیازات کو مستقل مختلف زبانیں قرار دے سکتا ہے؟ چاسر کی انگریزی شکسپیئر کی زبان سے اور شکسپیئر کی زبان کو موجودہ انگریزی سے کیا مناسبت ہے؟ بااین ہمہ ایک عام اصطلاح ''انگریزی'' کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی زبان سے موجودہ عربی میں آسمان وزمین کا فرق ہوگیا ہے، تاہم عربی وہ بھی تھی اور عربی یہ بھی ہے۔ سعدی وحافظ کی پاکیزہ زبان کو ایران کی موجودہ بدمذاقی نے غارت کر رکھا ہے۔ اس پر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ فارسی تھی اور یہ کوئی جدید زبان ہے؟

انگلستان میں سنجیدہ تحریروں کی زبان اور ہے، روزمرہ اور ہے۔ پھر مختلف اضلاع کی بولیاں بھی بسا اوقات ضلع کے باہر ناقابل فہم ہوجاتی ہیں، تاہم ہر شخص ان سب بولیوں کو زبان انگریزی ہی کی مختلف صورتیں سمجھتا ہے۔ سر والٹر ہیرن نے جو مع اپنی لیڈی کے تیس سال سے انگلستان سے باہر مختلف قصل خانوں میں تھے۔ حال میں جب لندن کو مراجعت کی، تو انھوں نے اور ان کی لیڈی صاحبہ دونوں نے ایک اسکول میں تقسیم انعام کے بھرے جلسہ میں بیان کیا کہ اتنے عرصہ میں یہاں کی زبان بالکل بدل گئی ہے۔ ہم لوگوں کو بازار میں بات چیت کرنے اور ٹیلی فون پر گفتگو کرنے میں سخت دقت ہوتی ہے، زبان کا یہ بگاڑ نتیجہ ہے غیر قوموں سے زیادہ اختلاط کا۔ کیا اس بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ اب انگلستان میں انگریزی کے بجائے کوئی جدید زبان رائج ہوگئی ہے؟ مشہور فارسی رسالہ کاوہ لکھتا ہے کہ جس مفہوم کو صحیح وسلیس فارسی میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ:

''این عبارت برائے بیان اوضاع حالیہ واتفاقاتے کہ رخ دادہ دمید ہد وافی نیست''۔

اسی کو آج کے ایرانی اخبارات عموماً یوں لکھتے ہیں:

''این فراز برائے افادۂ وضعیات کوران سیاست روزمرہ کہ عرض اندام کردہ مبہمیت نامحدودے رادر بردارد''۔

کیااس نامفہوم عبارت کو کلیۃً فارسی کی قلم رو سے خارج کردینا جائز ہوگا؟

غرض اصلاً و مستقلاً تو صوبہ کی زبان صرف ایک ہے۔البتہ امتداد زمانہ نے اس کی دو خاص شکلیں یا شاخیں پیدا کردی ہیں۔ایک تو وہ ہے جو خارجی اثرات سے تقریباً غیر متاثر رہی اور اب تک ایک بڑی حد تک اپنی قدیم خالص و بے آمیز حالت میں ہے۔اس نے اگر خارجی اثر کچھ قبول کیا ہے تو سنسکرت کا۔اس شاخ کو عرف عام میں ہندی سے موسوم کرتے ہیں۔دوسری شاخ وہ ہے جو سنسکرت،عربی، فارسی، یونانی، ترکی، انگریزی اثرات سے دل کھول کر شیر وشکر ہوئی اور تمام بیرونی اثرات کو آزادی و بے تکلفی سے قبول کیا۔اس کا نام اردو پڑ گیا۔اردو کی موجودہ ترکیب میں چونکہ متعدد مختلف زبانوں کے عناصر شامل ہیں اور ہر زبان کسی نہ کسی خاص تمدن کی مظہر و ترجمان ہوتی ہے۔اس لیے قدرتاً اردو بہ مقابلہ اپنے حریف کے زیادہ متمدن، ارفع اور ادائے خیالات ومطالب کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے،تاہم اگر کسی شخص یا جماعت کو ہندی ہی کے ذریعہ سے تحصیل علم میں زیادہ سہولت نظر آتی ہے،تو وہ بلا تکلف ہندی اختیار کرسکتا ہے۔کسی صوبہ میں دو زبانوں کا ہونا اس کی متحدہ قومیت کے بالکل منافی نہیں۔معارف کے کسی پچھلے نمبر میں دکھایا جاچکا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں ملکی کارروائیاں ایک ہی وقت میں دو بلکہ تین زبانوں میں ہوتی ہیں۔(معارف، مارچ ۱۹۲۲ء)

سرسید اور عماد الملک ـ سیاسی روش

وہ لوگ جواب تک ہر چیز کے جواب میں ''آیات محکمات'' کی طرح ''سرسید کی پالیسی، سرسید کی پالیسی'' چلاتے رہتے ہیں۔وہ یا تو سرسید کو غلط سمجھتے ہیں یا خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں، یا قوم وملک کو۔ہماری جماعت میں بفضل خدا اب بھی ایک بزرگ ایسا موجود ہے جو سرسید کی تمام جدو جہد میں اس کا دست و بازو تھا اور جس سے سرسید کے آرا وافکار کا کوئی راز پوشیدہ نہ تھا، یعنی نواب

عماد الملک! معارف نے اپنے تبصرہ میں نواب صاحب کے اس طویل خط کا ذکر کیا تھا، جو ممدوح نے سرسید کے نام ان کی سیاسی روش کی تائید میں لکھا تھا۔ اس تبصرہ میں موجودہ حیرت انگیز انقلاب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا۔ نواب صاحب اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''خط موسومہ سرسید مرحوم کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے متعلق میں صرف یہ کہوں گا کہ اگر آج سرسید مرحوم زندہ ہوتے تو آپ خود ان کے خیالات میں بھی عبرت انگیز انقلاب پاتے۔ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍ ۢ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ۔

(معارف، مئی ۱۹۲۲ء)

تارکین موالات اور مسلم یونیورسٹی

ایک صاحب نے شکایت کی کہ تارکین موالات کا یہ گناہ کبھی نہیں بخشا جاسکتا کہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی کو توڑ ڈالا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو وہ جواب دینا چاہتا ہوں، جو کسی اور نے نہیں دیا ہوگا۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی کو توڑنا تو چاہا، مگر وہ ٹوٹ کیوں گئی؟ انہوں نے تو ہندو یونیورسٹی کو بھی توڑنا چاہا، مگر وہ ٹوٹ نہ سکی۔ کیونکہ وہاں ایک مالوی موجود تھا۔ اگر کوئی مالوی آپ کے ہاں بھی ہوتا، تو وہ نہ ٹوٹتی۔ افسوس ہے کہ جہاں ہم سچے ''مومن'' نہیں، وہاں ''صحیح مشرک'' بھی نہیں۔ ع

یک کمر شایستۂ زنار نیست

کیا اس وقت ایک بھی ایسا کوئی عہدہ دار اعلیٰ یونیورسٹی میں موجود ہے، جس نے قوم کو اپنی گراں بہا خدمات سے زیر بار کیا ہو اور قوم کے اعتبار کو حاصل کیا ہو۔ طلبہ کے اندر اس نے علمی، اخلاقی یا کسی اور حیثیت سے اپنا اعتماد اور اثر پیدا کیا ہو اور جب یہ حال نہیں ہے، تو موالات ہو یا ترک موالات قوم اور طلبہ کو ان کی کسی رائے اور تجویز پر اعتبار واعتماد کیونکر آئے۔

گر گلہ ہے ''ایک'' کا تو نوحہ ساری قوم کا

(معارف، مئی ۱۹۲۲ء)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے چند مہینوں سے اپنی زندگی کا پھر ثبوت دینا شروع کیا ہے۔ اس کا قابل تعریف ماہوار تعلیمی رسالہ ''کانفرنس گزٹ'' پھر شائع ہونے لگا ہے۔ اسی کے ساتھ اصلاح

تمدن کا صیغہ جو مرحوم خواجہ غلام الثقلین کی وفات کے ساتھ مر گیا تھا۔ اب پھر اس کو ''نشاۃ ثانیہ'' دیے جانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے دفتر کی طرف سے ایک فارم مع ایک معاہدہ نامہ کے اس غرض سے شائع ہوا ہے کہ مسلمان اس معاہدہ نامہ پر دستخط کر کے یہ عہد کریں کہ وہ آیندہ سے سادہ زندگی بسر کریں گے۔ اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ پس انداز کریں گے اور دیگر اقتصادیات کو مدنظر رکھیں گے لیکن اگر کہیں ان اشتہارات سے قوم کی عملی زندگی اور اخلاق راسخہ میں فرق پیدا ہوسکتا تو آج ہماری قوم کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوتی۔ ہم تربیت کا کام ایک عارضی اشتہار و اعلان سے لینا چاہتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہماری کانفرنس کے ہاتھ میں سالہا سال سے ایک بہترین تربیت گاہ ہے۔ قوم کے لیے کس قدر مفید ہوتا اگر اس کی عملی دعوت پہلے وہاں سے شروع کی جاتی۔ (معارف، نومبر ۱۹۲۲ء)

بمبئی یونیورسٹی میں اردو

احاطۂ بمبئی کے مسلمان مدت سے اس کوشش میں تھے کہ بمبئی یونیورسٹی میں اردو کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔ اس کوشش کا بڑا حصہ بمبئی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے انجام دیا۔ الحمدللہ کہ اس کی یہ کوشش کامیاب ہوئی، اب اسکولوں اور کالجوں میں اس کو جگہ مل گئی ہے۔ خاص اردو اسکول الگ قائم ہوئے ہیں۔ پونہ میں اردو ٹریننگ اسکول چند سال سے قائم ہے، کالج کے اعلیٰ امتحانات ادب میں اردو بھی داخل ہوگئی ہے۔ اب اردو ٹکسٹ بکس بورڈ قائم ہوگیا ہے، جس کا مرکز پونہ ہے اور ہمارے دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر (الفنسٹن کالج) اس کے صدر ہیں۔ اس کے زیر اہتمام اردو نصاب کی ۴۳ کتابیں تیار ہورہی ہیں۔ اردو کتابوں پر انعام کا سلسلہ بھی جاری ہوا ہے۔ کیا الٰہ آباد یونیورسٹی کے ارکان اور حکام اس سے سبق لے سکتے ہیں؟ حضرت مسیحؑ کا قول کیسا سچا ہے ''نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں''۔ (معارف، دسمبر ۱۹۲۲ء)

مسلم یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد

گذشتہ دسمبر میں سب سے پہلی دفعہ ہماری قرطبہ اور غرناطہ کی درس گاہوں کو دوبارہ زندہ کرنے والی مسلم یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ سرسید اور محسن الملک کے عہد کے بعد سے اسٹریچی ہال نے یہ دل فریب نظارہ نہیں دیکھا تھا، جو ۲۸/ دسمبر کو اس کی نگاہوں کے سامنے گذرا۔ ''سوٹ پوش معززین اسلام'' کی اتنی عظیم الشان نمائش تین سال سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی، سو اس جلسہ میں

الحمدللہ کہ دیکھ لی گئی۔ تقسیم اسناد کے تمام مراسم میں صرف ہر ہائنس سرکار عالیہ بھوپال کا حصہ عمل لائق ستائش تھا۔ ان کی تقریر کی دعوت عمل و اصلاح کی آواز ممکن ہے کہ یونیورسٹی کے حکام پر گراں گذری ہو، مگر جو لوگ کہ یونیورسٹی کو یونیورسٹی دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ حرف حرف اس سے اتفاق کریں گے۔

مراسم تقسیم اسناد کا ایک دلکش منظر یہ تھا کہ چانسلر (سرکار عالیہ بھوپال) اور وائس چانسلر (راجہ صاحب محمود آباد) دونوں نے اسناد کی تقسیم کے وقت عربی فقرے استعمال کیے، جو کاغذ پر لکھے اور چھپے ہوئے موجود تھے۔ تاہم اس حیرت کی کوئی انتہا ہوسکتی ہے کہ تمام حاضرین نے بلا استثناء ایک عورت کی صحت تلفظ اور اعراب کو ایک ''مرد'' کے مقابلہ میں بہتر اور لائق تعریف پایا۔

ہماری یونیورسٹی اپنے عطائے خطاب کے اختیارات کو سب سے پہلی بار اس دفعہ کام میں لائی۔ یہ آیندہ چل کر ہماری جدید تعلیمی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہوگا کہ اس یونیورسٹی کے علمی خطاب یافتوں میں سرفہرست کس خوش قسمت کا نام ہے۔ لوگ بے قرارانہ پوچھیں گے، کیا وہ کوئی اس عہد کا بڑا عالم، بڑا مصنف، بڑا شاعر، بڑا انشا پرداز یا بڑا تعلیمی ماہر تھا۔ جواب ملے گا نہیں۔ وہ صرف ایک ایسے بیرسٹر کو ملا، جو اتفاق سے اس وقت وزیر تعلیم تھا، اور بس۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخی اہمیت کو مدنظر رکھ کر علی گڑھ کے حلقۂ علم اور ادارۂ تعلیم میں اگر کوئی موزوں تر اس خطاب کے لیے ہوسکتا تھا، تو وہ علمی حیثیت سے مولوی عبدالحق صاحب (ناظم ترقی اردو) اور تعلیمی کوششوں کے لحاظ سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ہم نے اپنی یونیورسٹی کے اس طرز عمل کے متعلق دیوان غالب میں فال دیکھی، تو یہ جواب ملا

غالب سوختہ جاں را چہ بہ گفتار آری
بد یارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

(معارف، جنوری ۱۹۲۳ء)

سوامی شردھانند اور مولانا آزاد سبحانی

جناب معظم علی اور مولانا آزاد سبحانی کی طرف سے اخبارات میں شردھانند جی کی ملاقات اور اسلام اور آریہ سماج میں مصالحت کی جو گفتگو شائع ہو رہی ہے۔ ہم اس کے متعلق اپنی عادت کے خلاف اپنی ناراضی کو نہیں چھپا سکتے۔ یہ کیا ذلیل خوشامد ہے، جو آج اسلام کی طرف سے اس کے بہادر

فرزند اس کے حریف کی اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ اس کے قتل سے باز رہے۔ شردھانند جی مسلمانوں کی غفلت میں اپنی کوششوں کا جو فائدہ اچانک اٹھا سکتے تھے، اٹھا چکے۔ اب لامحالہ ان کو سپر ڈالنا ہے کہ آیندہ زمین ان کے لیے ہموار نہیں۔ ایسی حالت میں ان سے چند مسلمانوں کا جا کر منت سماجت کرنا اسلام کی غایت درجہ توہین ہے اور اہانت آمیز قبول احسان ہے۔ مسلمانوں کو تو اس وقت تک دم نہیں لینا ہے جب تک وہ اپنے تمام کھوئے ہوئے بھائیوں کو نہ پالیں۔ اس وقت ممکن ہے کہ شردھا نند جی مسلمانوں پر احسان دھرتے ہوئے اپنے خطرناک کھیل سے باز آجائیں، لیکن دیکھنا کہ چند ہی سال کے بعد مسلمانوں کو اس ہنگامی مصالحت کی خبر سے غافل دیکھ کر وہ نئی زمین درست کر کے اپنا دوبارہ حملہ ضرور شروع کریں گے۔ آخر میں سوامی جی کو تسکین دینا ہے کہ گو ہندوستان کے محدود جغرافی حصہ میں وہ چند اعداد کی کامیابی حاصل کرلیں، مگر سال کے آخر میں جب وہ پورے حدود ہند میں اپنی میزان بٹھائیں گے کہ امسال کیا انہوں نے کھویا اور کیا پایا، تو اس وقت ان کا گھاٹا ان کے منافع سے زیادہ ہوگا۔ اور مجموعی طور سے ہندوؤں کی آبادی میں کوئی زیادتی نظر نہ آئے گی۔

فتنۂ ارتداد کے سلسلہ میں یہ تاریخی حقیقت بے نقاب ہونی چاہیے کہ ہندوستان میں بہادر نومسلم راجپوت اورنگ زیب عالم گیر کی خونی تلوار کے زخم خوردہ نہیں، بلکہ اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے لطف و کرم اور اسلام کی سادگی، مساوات اور اخوت عامہ کی تلوار کے گھائل ہیں۔ اورنگ زیب کی تلوار کو ٹوٹے ہوئے دو ڈھائی سو برس گذر چکے، مگر اب بھی وہ کون سی تلوار ہے، جو آج بھی ہندوستان کی نامسلم آبادی کو زخمی اور مجروح کر رہی ہے۔ کیا آریہ مبلغین کو اب بھی ہندوستان میں اورنگ زیب کی تلوار بے نیام چمکتی نظر آتی ہے۔ اگر آتی ہے، تو یہ خاک دولت آباد کے مدفون لاش کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ (معارف، مئی ۱۹۲۲ء)

جامعہ ملیہ کا دوسرا جلسہ تقسیم اسناد

۷ رفروری کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کا دوسرا سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ ہر صوبہ کے قومی کارکن جلسہ میں شریک تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مشرقی اور مغربی دونوں علوم کے ماہرین پہلو بہ پہلو جلوہ فرما تھے۔ ڈاکٹر پی، سی، رائے، ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر انصاری، خواجہ مجید، شیخ معظم علی، سید محفوظ علی، سید ہادی حسن سائنٹسٹ، تصدق شروانی وغیرہ ایک طرف۔ اور مولانا

حمیدالدین صاحب مفسر نظام القرآن، مولانا ابوالکلام، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا محمد سورتی، حکیم محمد اجمل خاں صاحب وغیرہ دوسری طرف، یہ منظر نمایاں کرتا تھا کہ جامعہ ملیہ کا مقصود مشرق و مغرب دونوں کو یکجا کرنا ہے۔

جلسہ تمامتر سادگی اور صفائی کا نمونہ تھا۔ پورا ہال، سائبان اور صحن حاضرین سے بھرا تھا۔ سنڈیکیٹ اور اسٹاف کے ارکان اپنے اپنے رنگ کی عباؤں میں تھے۔ ڈاکٹر رائے جو ہندوستان کے سب سے بڑے سائنٹسٹ اور خصوصاً بڑے کیمسٹ (ماہر کیمیا) ہیں۔ وہ صدر جلسہ تھے۔ انہوں نے انگریزی میں اپنا خطبۂ صدارت پڑھا، جو مسلمانوں کی علمی تاریخ کے بیانات سے لبریز تھا۔ انہوں نے کہا کہ جامعہ کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اسلاف کی علمی روایات کو عمل کی صورت میں پیش کرے۔ (معارف، فروری ۱۹۲۳ء)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

مسلمانان ہند کی مشہور تعلیمی کانفرنس (آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس) کا سالانہ اجلاس امسال بھی حسب دستور دسمبر کی آخری تاریخوں میں بہ مقام علی گڑھ منعقد ہوگا، ہم نہیں جانتے کہ صدارت کا انتخاب ہو چکا ہے یا نہیں، مگر ہمارے خیال میں اس وقت کے لحاظ سے مناسب تر انتخاب صاحبزادہ آفتاب احمد خان کا ہے۔ وہ مدت تک علم و ترقی کے مرکز میں رہ کر آئے ہیں۔ وہ بہت سی نئی باتیں قوم کو بتا سکتے ہیں۔

اب جو قوم کا مطمح نظر بدل چکا ہے، خیالات میں انقلاب، مقاصد میں تغیر اور حالات میں تبدیلی نمایاں ہے، تو ضرورت ہے کہ ہماری پرانی قومی مجلسوں کے ان مطالبات میں بھی انقلاب، تغیر اور تبدیلی ظاہر ہو۔ بہت سی باتیں آج سے تیس یا چالیس برس پیشتر ضروری تھیں۔ وہ اب بے سود ہوگئی ہیں اور بہت سی باتیں جو پہلے بے سود معلوم ہوتی تھیں، ضروری ہوگئی ہیں۔ بہت سی چیزیں جو پہلے ناممکن تھیں، ممکن ہوگئی ہیں اور بہت سے ممکنات نے اب ناممکن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس لیے اسی دلیل کی بنا پر جو اس تعلیمی مجلس کی سب سے پرزور اپیل تھی ع

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز

(معارف، دسمبر ۱۹۲۳ء)

اوقاف اسلامی اور گورنمنٹ

اس میں شک نہیں کہ موجودہ تحریک سے پہلے ہندوستان مسلمانوں کی یہ دلی خواہش تھی کہ گورنمنٹ اوقاف اسلامی کی نگرانی اپنے ذمہ لے لے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے اس کے لیے کچھ کوششیں بھی کیں۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم کو گورنمنٹ کی طرف سے سنا ہے، اس وقت یہ جواب ملا تھا کہ گورنمنٹ مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی اور علاوہ ازیں پہلے اس کے لیے مسلمانوں کی متفقہ خواہش تو ظاہر ہونا چاہیے۔ اب یک بیک ۱۹۲۳ء میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ مذہبی مداخلت کے خطرہ کا اور مسلمانوں کی متفقہ خواہش کے اظہار کا خیال کیے بغیر ایک قانون اوقاف تیار ہے اور حکومت اپنی غایت کرم اور رعایا پروری سے اس کی نگرانی کو آمادہ ہے۔ یکا یک اس انقلاب حال کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

مگر کل ڈاک سے ہمارے پاس علی گڑھ سے ایک مطبوعہ تحریر وصول ہوئی ہے، جس میں یہ ہدایت ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ''ہر جگہ جلسے کر کے گورنمنٹ کو تار دیں کہ ''اس جگہ کے مسلمان گورنمنٹ سے درخواست کرتے ہیں کہ ۱۹۲۳ء کے قانون اوقاف کا اس صوبہ میں جلد سے جلد نفاذ شروع کر دیا جائے''۔ اس تحریر سے تمام واقعات ہمارے سامنے روشن ہو گئے اور ہم نے ''دلالوں'' کے نام پڑھ کر ''کمپنی'' کے قیام کے اسباب معلوم کر لیے۔ کم از کم اتنا فائدہ تو اس سے ہے کہ اس تدبیر سے حکومت موجودہ اور عام مسلمانوں کے درمیان جو رضامندانہ تعلقات نہیں، یا ایک بے گانگی سی آ گئی ہے۔ اس عرض و معروض اور پیام و درخواست اور راز و نیاز کی تقریب سے کچھ نہ کچھ تو اس میں کمی آ جائے گی، اور باہمی حجاب کم ہوگا، اور اس طرح ٹوٹے ہوئے روابط پھر جڑنے شروع ہو جائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ متولی اوقاف کی آمدنی کو ذاتی اغراض میں صرف کرتے ہیں، مگر شاید اس اعتراض سے حکومت بھی بری نہیں خیال کی جا سکتی۔ جن اوقاف یا کورٹ آف وارڈس کی نگرانی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ کیا ان کے محاصل گورنمنٹ پرستوں کی پرورش، وفاداروں کے انعام و اکرام، قرض ہائے جنگ اور دیگر ان مدوں میں صرف نہیں کر دی جاتی، جن کے لیے حکام ضلع یا حکام صوبہ کے سرکاری بجٹ میں رقم نہیں ہوتی۔ بصورت اثبات کیا یہ خوف بے محل ہے کہ اس کشادہ دستی کا رقبہ آئندہ وسیع سے وسیع تر نہ ہو جائے گا۔ ذرا اس خطرہ کو تو دور کر لیجیے۔

بہر حال چونکہ یہ قانون صوبۂ متحدہ کی کونسل میں ۴۵ رایوں کی موافقت سے منظور ہوا ہے۔ اور صرف ۸ رائیں اس کی مخالفت میں تھیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کا جذبہ باایں ہمہ سیاسی مشکلات وعوائق یہ ہے کہ وہ اوقاف کی بدنظمیوں سے اس قدر تنگ آ گیا ہے کہ وہ ان کی نگرانی اور حفاظت کی ہر ممکن کوشش کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ بعض گوشوں سے اس قانون کی مخالفت کی بھنک بھی آرہی ہے، مگر یہ وہی گروہ ہے، جو اس قانون کی رو سے مدعا علیہ ہے۔ یعنی متصرفین اوقاف مگر اس کی پروانہ کرنی چاہیے۔

غریو و عربدۂ واعظان تلخ نوا
زمستی است کہ در لقمہائے اوقاف است

(معارف، اپریل ۱۹۲۴ء)

مسلکی اختلافات، احمدیت، علامہ مشرقی

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ شدھی اور سنگھٹن سے لڑتے لڑتے اب علماء بھی آپس میں لڑنے لگے اور چار پانچ برس کی خاموشی کے بعد اب پھر وہی ''سیرت اولیٰ'' عود کررہی ہے۔ ایک طرف بمبئی سے آواز آتی ہے کہ یہ وہابی ہے اور یہ مقلد ہے اور یہ غیر مقلد ہے۔ فلاں انجمن تبلیغ وہابیت پھیلا رہی ہے اور فلاں حنفیت مٹا رہی ہے۔ ''تقویۃ الایمان'' نام کتاب کی اخبار میں تعریف کیوں ہوئی، یہ تو کفر اور بدعقیدگی کی تعلیم دیتی ہے اور مردوں کو پکارنا، قبروں سے حاجت مانگنا، نذر و نیاز و فاتحہ کرنا اور غیر خدا کا توسل، سب کو شرک و کفر بناتی ہے۔

ادھر تو یہ تنگی ہے، ادھر پنجاب میں یہ وسعت ہے کہ غیر محتاط اہل حدیث ائمۂ مجتہدین کی شان میں گستاخی جائز رکھتے ہیں۔ آگے بڑھ کر اہل القرآن نام کا امت مسلمہ کا فرقہ زندہ ہوا ہے، جو انبیاءؑ وصحابہؓ کو بھی نادان و نافہم بتا رہا ہے اور چودہ سو برس کے عمل متواتر اور علم یقین کو خرافات کہہ رہا ہے۔ احمدی تحریک نبوت کا خاکہ اڑا رہی ہے۔ اب ایک ''مشرقی نژاد'' امرت سر میں پیدا ہوئے ہیں، جو عقائد قلب اور ایمانیات سے قطع نظر صرف چند اعمال تنظیم، اطاعت امیر، تحصیل علوم وغیرہ کو اسلام صحیح و کامل بتاتے ہیں۔ اور فرائض کی ایسی تاویل کرتے ہیں، جس سے نماز اور روزہ کی بھی تکلیف نہیں رہتی۔ انا للّٰہ۔

مشرقی صاحب نے جو مشرقی اور مغربی دونوں علوم کے علامہ ہیں۔ اپنے عقائد کی تشریح میں تذکرہ نام ایک کتاب کی پہلی جلد بہت دھوم دھام اور تزک واحتشام سے شائع کی ہے اور دھمکی دی ہے کہ یہ کتاب دس جلدوں میں لکھوں گا۔ شروع میں ڈیڑھ سو صفحوں کا عربی مقدمہ ہے، جس کی زبان نہایت غلط، سلط اور مضحکہ انگیز ہے۔ معلوم نہیں جب عربی پر قدرت نہیں تھی، تو اس میں لکھنے کی حاجت کیا تھی۔ اردو صفحات بھی خاصے ضخیم ہیں۔ فل اسکیپ سائز کے کئی سو صفحے ہیں، مگر عبارت زیادہ تر غیر مفہوم، مکرر اور حشو وزوائد سے پر معمولی سی بات کو صفحوں میں ادا کیا ہے۔

مشرقی صاحب کی تحقیقات عالیہ کا ایک نیا شگوفہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں سے جس جنت کا وعدہ کیا ہے اور جس دوزخ کی وعید کی ہے۔ ان سے مقصد اسی دنیا کی جنت اور اسی دنیا کی دوزخ ہے۔ ترقی، فلاح، سلطنت اور حکومت یہ تو یہاں کی جنت ہے اور تنزل، غربت، مفلسی یہ یہاں کی دوزخ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دنیا کے فوائد اور نقصانات بھی ہمارے اعمال کے نتائج اور عواقب ہوسکتے ہیں اور ہیں اور قرآن پاک میں اس کی تصریحات ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن پاک کی صریح تحریف کر کے ہم یہ عقیدہ ثابت کریں کہ جنت و دوزخ کے وہ تمام اوصاف جو قرآن پاک میں آخرت اور بعد موت کے واقعات کی حیثیت سے مذکور ہیں۔ وہ اسی دنیا میں ہیں اور وہ سب یہیں موجود ہیں۔

اگر یہیں یہ جنت ہوتی، تو صحابۂ کرام اپنی جانیں دے کر کیا اس کو کھوتے یا پاتے۔ جب انسان نے آنکھیں بند کر لیں، تو اس دنیا کی جنت اس کے کیا کام آسکتی ہے، جس کے حصول کے لیے وہ سعی و کوشش کرتے۔ اعمال انسانی میں خلوص اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک مابعد الموت کی سزا و جزا پر اس کو یقین کامل نہ ہو۔ چودہ سو برس سے مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے اور آج اس کے خلاف ایک مغربی التعلیم مشرقی کی زبان سے آواز بلند ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہم اہل ایشیا یورپ کی قوت وطاقت، سلطنت وحکومت اور عیش وآرام سے اس قدر مرعوب اور مبہوت ہو گئے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیوں کر ان کو حاصل کریں اور سمجھنے لگے ہیں کہ یہی ان کی جنت ارضی یعنی مضبوط سلطنت، وسیع مستعمرات، آراستہ مکانات، خوبصورت سامان، قیمتی لباس، امیرانہ سواریاں، لذیذ الوان نعمت، یہی اصل چیزیں ہیں۔ انھی کے حصول کے لیے

ہم پر قرآن نازل کیا گیا ہے، نمازیں فرض کی گئی ہیں، روزے واجب ہوئے ہیں۔ اعمال نیک کی تاکید کی گئی ہے، یہ اگر نہیں تو کچھ نہیں۔ افسوس ہے کہ ان پر جو فانی کی تلاش میں باقی کو بھول جاتے ہیں۔

ہمیں اس سے انکار نہیں اور نہ اس سے کسی مسلمان کو انکار ہوسکتا ہے کہ تعلیمات قرآنی پر صحیح طور پر عمل کرنے سے اس دنیا کی نیکیوں کے ساتھ ہم کو اس دنیا کی نیکیاں بھی ملیں گی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہی دنیاوی زندگی تمامتر ابدی زندگی ہے اور اسی کے عیش و آرام کے لیے سب کچھ کرنا چاہیے۔ فانیٰ تو فکون۔

یہ کتاب مطبع روز نامہ وکیل امرت سر میں بہت حسن وخوبی کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ وکیل امرت سر اور اس کا مطبع پنجاب میں اسلام کے صدق وحقیقت کے داعی تھے۔ آج یہ کیا ہے کہ چھپائی کے چند روپیوں کے منافع کے لیے ایسی گمراہ کن کتاب جس کے نتائج خدا جانے مسلمانوں میں کیا کیا پیدا ہوں گے، چھاپ دی جاتی ہے۔ کیا وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو) کا یہی مطلب ہے۔

اسلام کی سیزدہ سالہ زندگی میں سینکڑوں باطل فرقے پیدا ہوئے، جن کے ناموں کی تفصیل سے کتب ملل ونحل بھری پڑی ہیں۔ ان کے بانی مصنف تذکرہ سے بھی زیادہ اپنے اپنے وقت کے حکیم اور فلسفی تھے۔ مگر آج ناموں کے سوا ان کے کاموں کا کوئی حصہ اور ان کا کوئی عملی وجود باقی نہیں۔ اسی طرح یہ نیا مذہب بھی اس سے زیادہ ثابت نہ ہوگا، جس قدر سمندر کی سطح پر حباب اَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً۔

اور ہاں اس جدید فرقہ مشرقیہ کی ایک نئی تحقیق اور بھی قابل ذکر ہے۔ اس کو بہت زور سے ثابت کیا ہے کہ اصلی مسلمان اہل یورپ ہیں، جن میں قومی ہمدردی، تحصیل علوم کا شوق اور حسن تمدن وغیرہ۔ وہ تمام اصول عشرہ پائے جاتے ہیں، جو دنیاوی ترقی کے لیے ضروری ہیں، اور جو اصل اسلام ہیں۔ باقی جن قوموں میں یہ رسمی اسلام یعنی صرف توحید وغیرہ ایمانیات اور ظاہری اعمال، نماز، روزہ وغیرہ کا وجود ہے۔ یہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہیں۔

اس کتاب میں سب سے زیادہ غیظ وغضب کا اظہار طبقۂ علماء پر کیا گیا ہے اور ان کو ہر عیب اور عمل شنیع کا مورد قرار دیا گیا ہے اور یہ شاید اس لیے کہ بانی مشرقیت کو اگر اپنے جھوٹے دعوؤں

کی تکذیب کا خوف تھا، تو اسی جماعت حقہ سے۔

مشرقی صاحب سے سوال یہ ہے کہ جن اصول عشرہ کو وہ اصل اسلام جانتے ہیں۔ کیا وہ ایمانیات اور عبادات اور دیگر اعمال صالحہ کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔ اگر ہو سکتے ہیں تو ان کی نفی و انکار کی حاجت کیا تھی۔ اور اگر جمع نہیں ہو سکتے، تو مسلمانوں کی اس ترقی و سعادت کے عہد میں جس کو آپ سعادت و ترقی سمجھے ہیں، کیا مسلمان ان ایمانیات و عبادات و اعمال صالحہ سے خالی تھے۔

بات یہ ہے کہ اس مشرقیت کی ایجاد تمامتر موجودہ یورپ کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ اہل یورپ آج تمام دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور دولت مند اقوام ہیں۔ بااین ہمہ وہ ایمان کے لحاظ سے تمامتر ملحد اور عمل کے لحاظ سے ذاتی اعمال صالحہ اور عبادات سے خالی ہیں، تاہم ان کی ترقی، تمول، عیش کوشی غرض جنت ارضی کے حصول میں یہ چیزیں ان کی حارج نہیں۔ اس کا سبب ان کو یہ نظر آیا کہ اس ایمانی و عملی الحاد کے باوجود ان میں چند باتیں عموماً پائی جاتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ان میں باہمی محبت، اطاعت قومی، سائنس اور حکمیات وغیرہ علوم کا شوق اور بعض اصول ان میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہی چند اصول اسلام کے دفعات ہیں، باقی ہیچ۔

اگر یہ منطق صحیح ہے تو ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ چونکہ اہل یورپ کوٹ پتلون پہنتے اور ہیٹ لگاتے ہیں۔ کتوں کو چومتے اور چاٹتے ہیں۔ ازالۂ نجاست کے بغیر حوض میں غسل کرتے ہیں۔ منہ نہیں دھوتے، دانت نہیں صاف کرتے، کھانے کے بعد کلی نہیں کرتے، کوچہ و بازار، باغ و چمن، سقف و در پر ہر جگہ حیا سوز اعمال میں مصروف پھرتے اور شراب میں مخمور رہتے ہیں۔ اپنے سے ضعیف اقوام سے مکر و کید اور بدعہدی ان کا شیوہ اور اپنی ماتحت اقوام سے غرور، تکبر اور اظہار فخر ان کا خلق ہے۔ اور حصول زر کے لیے ہر قسم کا حیلہ و فن ان کے یہاں جائز ہے۔ اس بنا پر حسب حصول مشرقیہ معلوم ہوا کہ یہی طرز لباس، یہی طریقۂ عمل، یہی نمونۂ اخلاق، جو ہر جگہ تمام اہل یورپ میں مساوی نظر آتا ہے۔ ان کی ان ظاہری ترقیات کے اصلی اسباب ہیں، جن کی تقلید ہر ترقی خواہ مسلمان پر واجب ہے۔

ہم نے جدید طبقۂ تعلیم کے بعینہ ایسے ہی افراد کو دیکھا، لیکن یہ تو نظر نہیں آیا کہ وہ اپنے دنیاوی آقاؤں کے ذرا بھی ہم رتبہ ثابت ہو سکے اور نہ یہ نظر آیا کہ انہوں نے جنت ارضی کی کیا کیا سعادتیں حاصل کیں اور اس ''فردوس زمین'' کی کیا کیا نعمتیں ان کو ملیں۔ ان سے زیادہ بڑھ کر تو اس

جنت ارضی کے مالک اوراس فردوس زمین کے وارث ہم نے بمبئی وکلکتہ وکراچی کے مسلمان تاجروں کو پایا، جواس الحادقلبی وعملی سے تمامتر پاک اورصاف ہیں۔

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنا آپ اعادہ کرتی ہے،جس طرح یونانی فلسفہ وحکمیات نے باطنیہ کو پیدا کیا تھا۔آج ٹھیک اسی طرح یورپین فلسفہ وحکمیات جدید باطنیہ کو پیدا کررہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو مذہب میں اپنی تسلی نہ پاکراس کے حدود وقیود کی زنجیروں کواپنے پاؤں سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ مگر چونکہ تن تنہا اگراس آزادی کی آب وہوامیں آجائیں،تو''یوسف بے کارواں'' کی مثل صادق آتی ہے۔اس لیے ایک جماعت کواپنے ساتھ ملانے کے لیے ضرورت ہوئی کہ مذہب کی آڑ پکڑ کراوراس کے قالب میں اپنی اصلی روح کوچھپا کر دوسروں کودعوت دیں اور کامیابی کاانتظار کریں۔

باطنیۂ قدیم یعنی اسماعیلیہ، باطنیہ ایران جدید،یعنی بابیہ وبہائیہ اور باطنیۂ ہند جن کا ابھی کوئی نام نہیں۔سب اسی ایک اصل کے فروع ہیں کہ اپنے اصل الحاد فلسفیانہ کومذہب کے پردہ میں چھپا کر خلق کوضلالت وگمراہی کی دعوت دیتے ہیں۔کبھی نماز کے اوقات کم کیے جاتے ہیں،کبھی ارکان نماز میں تخفیف کی جاتی ہے،کبھی نماز وصلوٰۃ کے معنی کی تحریف کی جاتی ہے کہ اس سے مقصود محض امام وامیر کی اطاعت ہے۔روزہ نام امام وامیر کے اسرار کی حفاظت کا ہے، زکوٰۃ نام امام وامیر کی مالی خدمت کا ہے، حج نام امام وامیر کے محل اقامت کی زیارت کا ہے۔انبیاءؑ نے محض عوام کی خاطر مصالح کو پیش نظر رکھ کر اصل حقیقت کو ظاہر نہیں کیا اور مقدس جھوٹ کے وہ مرتکب ہوئے۔ورنہ اصل حقیقت وہی ہے، جوافلاطون وارسطواور یا اس عہد کے حکمائے زمانہ نے ظاہر کی ہے۔

اگر دراصل مذہب کی یہی حقیقت ہے اور مذہب کے ظاہری قیود اسی قدر بے معنی ہیں اور ایمانیات اسی درجہ فضول ہیں،تو خدا، قرآن، کتاب الٰہی ،نبوت اور مذہب کا پردہ ہی کیوں رکھا جاتا ہے۔صاف صاف اور کھلم کھلا مسٹر ظریف کی طرح الحاد، بے دینی اور مذاہب کی بیخ کنی ہی کا وعظ کیوں نہ کیا جائے۔آج ہارون ومہدی یا ملک شاہ وسنجر کی تلوار نہیں،جس کا خوف کیا جائے۔آزادی کا دور ہے، محتسب کا ڈر نہیں۔عدل برطانی کسی مذہب میں دخل انداز نہیں، پھر تستر اور تقیہ اور تبدیل ہیئت کی ضرورت کیا داعی ہے۔ جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج

(معارف، اگست ۱۹۲۴ء)

ہندو مسلم اتحاد

ستمبر کے آخر میں ہفتہ میں دہلی میں جو مجلس اتحاد منعقد ہوئی اس نے اپنے جانتے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو نزاعی امور پیدا ہیں۔ ان پر پوری طرح غور کیا اور ان کے متعلق فیصلے صادر کیے۔ لیکن ہم نے جلسہ کے اندر اور باہر بھی جہاں تک غور کیا، تمام رہنمایان ملک کے خیالات ان نزاعات کے صرف ظاہری اور سطحی اسباب پر مشتمل پائے۔ شاید اس لیے کہ زخم میں زیادہ گہرا نشتر نہ دیا جائے، جو تکلیف کا موجب ہو۔ صرف اوپر کی جلد کا صاف کر دینا کافی سمجھا گیا، لیکن یہ خیال نہیں کیا گیا کہ اوپر سے زخم اس طرح مندمل بھی ہو جائے گا، تو ڈر ہے کہ اندر اندر موجودہ محدود زخم آیندہ تمام جسم کو اپنے زہر سے پر مواد نہ کر دے۔

ہمارے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی نزاعات اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے، جب تک کہ دونوں قومیں ۱۸۵۷ء کے خاتمہ پر اپنے فاتحانہ اور مفتوحانہ جذبات، سزا و انتقام کو ختم نہ کر دیں اور اپنی تاریخ کا نیا دور نہ شروع کر دیں۔ جس میں گذشتہ آٹھ صدیوں کے تلخ واقعات کی یاد قطعاً موقوف کر دی جائے اور مستقبل کی اصلاح و درستی کی خاطر حال کو ماضی کی تکرار میں برباد نہ کیا جائے۔

ہر قوم کی حکومت کی تاریخ میں اچھے اور برے، منصفانہ اور ظالمانہ دونوں قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ اس کلیہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ بھی خالی نہیں۔ مگر ملک کی بھلائی اس میں نہیں ہے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مسلمانوں کی حکومتوں کی کچھ واقعی برائیاں اور کچھ گھڑ کر مفروضہ افسانے یکجا کیے جائیں۔ اور وہ انجمنوں کے جلسوں میں، لڑکوں کے مدرسوں میں، مطالعہ کی کتابوں میں، اخبارات کے کالموں میں، روزمرہ کی گفتگوؤں میں، کھیل کود اور تماشے کے ناٹکوں میں اس طرح بار بار دہرائے جائیں کہ وہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جائیں۔ دونوں قوموں کے درمیان ایک غیر مختتم تلخی اور ناگواری اور بدگمانی اور عداوت راسخ ہو جائے۔

واقعات کی حیثیت سے نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہندو اکابر نے اپنی قوم کو جنبش اور حرکت میں لانے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ قوم کی نفرت اور عداوت کے جذبات کو مشتعل کیا جائے اور اس کے لیے مسلمانوں کو منتخب کیا۔ ان کا فاتحانہ جرم اقدام اس کے لیے بہترین مسالہ پیدا کر سکتا تھا۔ اس طرح مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مواد یکجا کیا گیا اور اس کو تمام ملک میں ہندوؤں کے درمیان پھیلایا

گیا۔ مذہبی حیثیت سے سوامی دیانند جی نے اور سیاسی حیثیت سے تلک مہاراج نے مسلمانوں کے خلاف ایک جہاد عظیم کا سامان فراہم کیا۔ تمام ملک میں دیانند جی کی ستیارتھ پرکاش کی تبلیغ کی گئی، جس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر ممکن دلیل سے ہندو قوم کو آمادۂ جنگ کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قریوں تک میں آریہ سماج کا جال پھیلایا گیا۔ ان کے ہفتہ وار، ماہوار اور سالانہ جلسوں میں مقررین کا بہترین موضوع اسلام اور مسلمانوں کو برا بھلا کہنا، مسلمان سلاطین کے جھوٹے مظالم گنانا، اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکانا قرار دیا گیا۔ ان کے اخبارات، رسائل اور کتابوں میں باقاعدہ اسلام، بزرگان اسلام، انبیائے اسلام اور سلاطین اسلام کے خلاف سب وشتم کا سلسلہ قائم کیا گیا اور اس طرح ملک کے طول وعرض میں مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع تنظیم کھڑی کی گئی۔

تلک مہاراج نے عام ہندوؤں اور خصوصاً مہاراشٹر کے بہادروں کے مردہ جذبات میں نئی امنگ پیدا کرنے کے لیے شیواجی اور عالم گیر کی مری ہوئی ہڈیوں کو اکھاڑنا شروع کیا۔ شیواجی کو قومی ہیرو بنایا گیا۔ اس کے مقابل میں عالم گیر کو ہر ظلم اور برائی کا مصدر ٹھہرایا گیا۔ واقعات گھڑے گئے۔ تاریخیں بنائی گئیں۔ جعلی تحریریں بنانے کے کارخانے قائم کیے گئے۔ جھوٹے افسانے، ناٹک اور ناول لکھے گئے۔ ان کے دارالاشاعت قائم ہوئے۔ تھیٹروں اور تماشا گاہوں میں ان کی نقلیں دکھائی گئیں اور یہ سلسلہ مرہٹی سے شروع ہوکر گجراتی و بنگالی تک میں پھیل گیا اور اس زہریلے لٹریچر نے تمام ہندو نوجوانوں کے دل ودماغ کو مسموم کردیا۔ اور اس طرح ملک میں اب تک یہ نظام عمل پوری طرح قائم اور جاری ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بڑے بڑے ہندو اہل قلم نے قصداً ایسی کتابیں اور تحریریں لکھیں اور اب تک لکھ رہے ہیں۔ اور اس کام میں انگریز اہل قلم نے بھی ان کی پوری مدد کی، بلکہ رہنمائی کی۔ جن میں مسلمانوں کے عہد حکومت کو ہر طرح بدنام کرنے کی کوشش کی اور مسلمان سلاطین پر غلط الزامات قائم کیے اور ہندوؤں پر ان کے اَن گنت مظالم کو سلیقہ کے ساتھ اوراق میں ترتیب دے کر ان کو مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا ہے، جس کے ذریعہ سے تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں کے خیالات مسلمانوں کی طرف سے تاریخی طور سے ہمیشہ کے لیے برے کردیے گئے۔

ہندوستان کی ان دونوں قوموں میں نفاق ڈالنے کی کوشش گو تیسری قوم کی طرف سے شروع کی گئی، مگر بہت جلد دوسری قوم نے اس کو اپنا کام بنالیا اور اس طرح اے، بی، سی، ڈی کے آغاز سے آخر تعلیم تک ایک ہندو نوجوان کو مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے خلاف ایسی باقاعدہ تعلیم دی گئی ہے، جس سے پاک وصاف رہ کر اگر اب بھی کچھ تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے خواہاں ہیں، تو یہ صرف فطری صلاحیت کی پکار ہے۔ ورنہ ماحول کا یہ اقتضا تو ہرگز نہیں۔

اب ہمارا سوال ہے کہ ان حالات میں جب مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے آریہ سماج کا پورا نظام قائم ہے اور اس قسم کے لٹریچر کی کم از کم تیس چالیس برس سے عام اشاعت ہے۔ ناٹکوں اور افسانوں، سنجیدہ مضامین اور مصنّفین کی کتابوں کے ذریعہ سے ان کی تبلیغ ہے۔ کیا مسلمانوں کی طرف سے کوئی ایسا نظام سلسلۂ کتب، دارالاشاعت، مقررین کا گروہ ہے۔ انجمنوں کی تنظیم، اہل قلم کی کوششیں، ناٹک اور افسانے، مدارس و مکاتب کے نصاب تعلیم کوئی چیز ایسی موجود ہے، جس کا مقصد مسلمانوں میں ہندوؤں کی طرف سے نفرت اور عداوت کے جذبات کی باقاعدہ پرورش اور نشوونما ہو۔ مسلمانوں کی طرف سے جو کچھ ہے مدافعانہ ہے۔

فروری ۱۹۲۰ء میں جب وفد خلافت یورپ جارہا تھا، تو اتفاق سے پہلے جنم کے مشہور آریہ سماجی لیڈر لالہ لاجپت رائے چھ سات برس کے بعد امریکہ سے ہندوستان آرہے تھے۔ مصوع کے افریقی بندرگاہ میں ہم دونوں کا اجتماع ہوا اور ہندوستان کی موجودہ صورت حال یعنی ہندو مسلمانوں کے روز افزوں اتحاد کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ اب ہندوستان میں آریہ سماجی تحریک کی گذشتہ روش (پالیسی) میں انقلاب کی ضرورت ہے، تاکہ ہندوؤں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور عداوت پھیلانے کی سرگرمیوں کی جگہ مصالحت اور اتحاد کی اشاعت ہوسکے۔ لالہ جی نے اس خیال کی تائید کی مگر اخیر اکتوبر کی مجلس اتحاد میں جب مالوی جی کے اشارہ سے لالہ جی نے اپنی مشہور ترمیم متعلق اعلان حقوق (یعنی ہر شخص کو مذہبی آزادی ہو، مسلمان جس جانور کو جہاں چاہیں ذبح کرسکیں وغیرہ) کو تعویق میں ڈالنے کی غرض سے پیش کی، تو اس وقت ان کا وہ خیال جو مصوع میں ظاہر کیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ سمندر پار سے ہندوستان نہ آسکا۔

اس تفصیل سے اب یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ اگر ہم ہندو مسلمانوں کے نزاعات کا واقعی خاتمہ

کرنا چاہتے ہیں اوراس بدنصیب ملک میں خون کی ندیوں کے بدلے جوئے محبت بہانا چاہتے ہیں،تو اس کا اصلی علاج یہ ہے کہ آریہ سماجی روش میں تبدیلی کی جائے۔اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو تبلیغ اور پروپیگنڈا پورے نظام کے ساتھ تقریروں، تحریروں، کتابوں، رسالوں، اخباروں، تماشوں، ناٹکوں، افسانوں اور تاریخوں کے ذریعہ پھیلایا جارہا ہے۔ان کو یک قلم بند کیا جائے۔اسی کے ساتھ لازماً مسلمانوں کی مدافعانہ کوششیں بھی خود بخود بند ہوجائیں گی۔آریہ سماجی مقررین اور محررین، اپنے بیانوں اور گفتگو کا موضوع اپنے مذہب کی خوبیوں اور اچھائیوں کا اظہار قرار دیں، دوسرے مذاہب کو سب وشتم نہیں اور اسی طرح ہندو اور مسلمان اہل قلم تاریخ ہند کے اسلامی دور کے وہ واقعات تلاش اور یکجا کریں، جن سے دونوں میں مصالحانہ روح کی ترقی ہو۔

ہم نے اپنے کسی گذشتہ اشاعت میں مراٹھی کتاب ''مسلمانی ریاست'' کا ذکر کیا تھا اور مرہٹی داں دوستوں سے اس پر تنقید کی خواہش کی تھی۔اس کے متعلق ہمارے پاس متعدد مرہٹی داں مسلمان دوستوں نے کافی مواد بہم پہنچایا ہے اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے فاضل دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر ایم، اے الفنسٹن کالج بمبئی نے اس پر پوری تنقید لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ کتاب بڑودہ کے ایک ممتاز ہندو اہل قلم کی تصنیف ہے۔جس کے استناد کا یہ حال ہے کہ اس میں ایک ناول کے حوالہ سے واقعات لے کر شیواجی کی مداحی اور عالم گیر کی برائی کی ایک پوری داستان گھڑ کر کھڑی کی گئی ہے۔ یہ کتاب نصاب تعلیم میں داخل ہے۔کیا ایسی ہی کتابوں سے آپ ہندو مسلمان اتحاد کا خواب پورا کرسکتے ہیں۔(معارف، اکتوبر ۱۹۲۴ء)

ہندی اور اردو

کیا ہندوستان کی حکومت اور مالیات میں اردو بولنے والوں کا حصہ نہیں ہے،مگر اردو بولنے والوں میں کوئی معزز سائل نہیں۔مسلمان امراء میں غور کیجیے،تو حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم سرکار نظام اور بیگم صاحبہ بھوپال کی حیات بخش زرریزیوں کو نکال دیں تو نہ صرف اردو کی ترقی کا درخت بلکہ ہمارا تمام علمی باغ خشک ہوکر رہ جائے۔مگر صرف دو دریاؤں کی فیاضی سات سمندروں کا کیا مقابلہ کرسکتی ہے، کیا دیگر مسلمان امراء اپنے رقیب راجاؤں کے ان کارناموں کا جواب دیں گے۔

(معارف،نومبر ۱۹۲۴)

ہندواور مسلمان

بہار پروانشل ہندومہاسبھا کے اجلاس مظفر پور میں لالہ لاجپت رائے اور بھائی پرمانند نے تقریروں میں ہندوستان اور ہندوقوم کی فطری خصوصیات کی تفصیل میں فرمایا کہ یہ ملک اور یہ قوم ہمیشہ سے مردم خورواقع ہے۔ یونانی سیتھینس اور کتنی قومیں ہندوستان آئیں، مگر یہ مشکل تاریخ میں ان کے ناموں کی زندگی باقی رہ گئی۔ بحیثیت مستقل قوم کے ان کا وجود باقی نہیں، پھر کیا یہ تعجب انگیز نہیں کہ ایک ہزار برس کے باوجود بھی مٹھی بھر مسلمانوں کو ہندوقوم اب تک ہضم نہ کرسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہزار سال سے ہندوقوم کی تنظیمی اور سنگٹھنی قوت کمزور ہوگئی ہے اور اسی کو دوبارہ مضبوط کرنے سے اور ابھارنے سے ہماری امید برآسکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دیگر قوموں کے متعلق ہندوقوم کے ان حکیموں اور بیدوں کی تشخیص صحیح ہے۔ لیکن مسلمانوں کے متعلق ان کی تشخیص صحیح نہیں۔ اگر کوئی معدہ کسی غذا کو ہضم نہ کرسکے، تو اس کے صرف یہی معنی نہیں کہ معدہ کمزور ہے۔ بلکہ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ غذا اس قدر بھاری اور ثقیل ہے کہ کسی انسانی معدہ کے لیے اس کا ہضم اس کی طبعی قوت کے حدود سے باہر ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد نسل پر نہیں، بلکہ مذہب پر ہے۔ اس لیے ہندوقوم اس کو اپنے اندر جذب نہیں کرسکتی۔ کیونکہ اس سے پہلے ایک بڑے اور وسیع مذہب یعنی بودھ مت کو وہ اس سرزمین میں نگل چکی ہے۔ اس لیے ہمارے آریہ دوستوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمان چبینا نہیں، جس کے ہضم کے لیے تقویت معدہ کی ضرورت ہے، بلکہ لوہے کے چنے ہیں، جن کے چبانے اور نگلنے میں اپنے ہی دانت اور معدہ کا خطرہ ہے۔

کیا رہنمایان ہندوسبھا اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا آج ان کی طاقت دہلی اجمیر وراجپوتانہ و قنوج کے راجاؤں کی مجموعی قوت سے زیادہ ہے۔ یا وہ مرہٹوں سے زیادہ زور پیدا کرسکتے ہیں اور جب یہ قوتیں مسلمانوں کی پوزیشن کو ہندوستان میں شکست نہ دے سکیں، تو وہ کیونکر مسلمانوں کو ہضم کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ یہ مصلحین وطن اپنی قوم سے چھوت اور اچھوت کی بیماری دور کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ کیا صرف اپنی ہی قوم کے افراد کے اندر یا دوسری قوموں سے بھی میل جول اور ملاپ پیدا کرنے میں اس حقیر خیال کو نظرانداز کرنا چاہتے ہیں۔ اگر دوسروں کے مقابلہ میں بھی

چھوت چھات کو چھوڑنا چاہتے ہیں، تو بہتر یہ ہے کہ دوسروں کو مٹانے کے بجائے ان سے مل کر ہندوستان کی نئی تعمیر کا مسالہ تیار کریں۔

لیکن مسلمانوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کل کا مقابلہ میدان جنگ میں تیغ وخنجر کے ذریعہ سے تھا، جس سے وہ عہدہ برآ ہو سکے، لیکن آج مقابلہ کا میدان دوسرا ہے۔ آج امن وسلامتی اور خاموشی کے ساتھ ہندوستان کے گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں شدھی اور سنگٹھن کا جال پھیلایا جارہا ہے۔ جس سے کامیاب مقابلہ کے لیے غصہ وغضب، شجاعت و بہادری، جوش وخروش بالکل بے کار ہے۔ اس کے لیے غور وفکر، مسلسل جدوجہد، ہشیاری و بیداری اور کام اور عمل کی ضرورت ہے۔ لوہے کے چنوں کو معدوں کے ذریعہ سے ہضم نہیں کیا جاسکتا، مگر کیمیاوی صنعت سے ان کو پگھلا کر ان کو دوسری دھاتوں میں ملا دیا جاسکتا ہے۔ (معارف، اپریل ۱۹۲۵ء)

مدارس اور اصلاح نصاب

عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں تغیر وتبدل اور تجدید و اصلاح کا جو غلغلہ ندوہ نے آج تیس سال سے برپا کر رکھا ہے۔ مقام شکر ہے کہ اب وہ مفید اثر پیدا کر رہا ہے۔ صوبہ متحدہ کے امدادی عربی مدارس میں ہمارے دلی دوست مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم، اے انسپکٹر مدارس عربیہ کی مسلسل کوششوں سے ایک اہم نتیجہ تک یہ اصلاح پھیل رہی ہے۔ باقی غیر امدادی عربی مدارس تو وہ بھی زبان کی خاموشی یا انکار کے ساتھ عملاً دل سے وہ ادھر آہستہ آہستہ آرہے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ مسرت افزا پیام بھی ہے کہ احاطۂ مدراس کے علماء غالباً اسی مہینہ کے کسی ہفتہ میں جنوبی ہند کے سب سے مشہور اہم مدرسہ باقیات الصالحات کی دعوت پر اس لیے جمع ہوں گے کہ وہ اصلاح نصاب کے مسئلہ پر غور کریں اور احاطۂ مدراس کے تمام عربی مدارس میں ایک متحدہ اصلاحی نصاب جاری کریں۔ ۴؍ شوال کو بہار میں علمائے صوبہ بہار کا ایک جلسہ ہونے والا ہے، جس میں اسی مسئلہ نصاب پر متفقہ بحث و تمحیص ہوگی اور صوبہ کے کل عربی مدارس کی تنظیم ہوگی۔ اسی کے ساتھ سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون صاحب اپنے ایک والانامہ میں یہ مژدہ سناتے ہیں کہ انہوں نے ایک دو سال سے سندھ کے دارالصدر کراچی میں جو جامعہ اسلامیہ قائم کیا ہے۔ وہ اب بڑھ کر تمام سندھ کا احاطہ کر لینے والا ہے اور اسی کے ضمن میں عربی مدارس کی اصلاح و تنظیم بھی ہوگی۔ اب ہم اپنے صوبہ پر نظر ڈالتے ہیں، جس کا نام برعکس نہند نام

زنگی کافور متحدہ رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس کو مختلفہ کہنا چاہیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہاں ایک علم دوسرے کے نیچے آنا تقریباً محال ہے۔ اس لیے یہاں تمام مدارس کا متحدہ نظام میں داخل ہونا ناممکن ہے۔

ہمارے صوبہ میں تین چار بڑے عربی مدارس ہیں۔ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، نظامیہ فرنگی محل، شمس العلوم بدایوں اور بھی شاید ایک دو ہوں۔ اگر ان تمام مدارس کے مدرسین و منتظمین کی ایک متحدہ کانفرنس تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لیے کہیں یکجا ہو تو تمام ملک کے عربی مدارس اس سے متاثر ہوں گے اور بہت سے مفید امور انجام پائیں گے۔ فھل من مدکر۔

صرف کانپور اور دہلی میں چھوٹے بڑے جتنے عربی مدرسے ہیں۔ اگر صرف ان دو شہروں کے ان عربی مدرسوں کو باہم متحد و منظم کیا جائے، تو بڑی اصلاح ہو اور اس کے بجائے کہ ہر محلہ کی مسجد میں ایک الگ مدرسہ ہو۔ اگر شہر میں کل یکجائی قوت سے سب کو ملا کر صرف ایک دو مدرسے قائم کردیے جائیں، تو ایک طرف منتظمین کی پریشانیاں دور ہوں، طلبہ آرام پائیں اور مدرسین مطمئن ہوں۔ دہلی کا ایک مدرسہ فتح پوری جس کی ماہوار آمدنی ہزار روپے سے زیادہ ہے اور ہزاروں کی رقم اس کے پاس جمع ہے۔ اگر درست ہوجائے تو دہلی کے دوسرے مدرسوں کو چرم قربانی اور سورت و راندھیر کے تاجروں کی دست نگری سے نجات مل جائے۔ (معارف، اپریل ۱۹۲۵ء)

مدرسۃ العلوم کی گولڈن جوبلی

مسلمانوں کی واحد تعلیمی درس گاہ (مدرسۃ العلوم علی گڑھ) کی پنجاہ سالہ عمر کی خوشی میں جشن پنجاہ سالہ منائے جانے کا آیندہ دسمبر میں اعلان ہوا ہے۔ یہ رسم بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے منائی جائے گی اور اسی کے ساتھ قوم کی پچاس سال کی تعلیم کی، سیاسی اقتصادی جد و جہد پر بھی تبصرہ کیا جائے گا۔ ارکان علی گڑھ کو تعلیمی اور وہ بھی انگریزی تعلیم پر تبصرہ کا تو پورا حق ہے، مگر سیاسی اور اقتصادی تبصرہ شاید ان کے لیے موزوں نہ ہو کہ اس کے لیے انہوں نے بھی کچھ نہیں کیا ہے۔ تو جو سبق قوم کو انھوں نے پڑھائے نہیں، ان کے امتحان کا ان کو کیا حق ہے۔

مناسب ہے کہ اسی کے ساتھ کالج کے ان شاندار قومی، علمی، تعلیمی، سیاسی، اقتصادی، خدمات پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ جو پچاس سال میں اس کے سپوت ''فرزندوں'' نے انجام دیے ہیں۔ سپوت فرزندوں سے ہماری مراد وہ ناسعادت مند اور سرکش اولادیں نہیں ہیں، جو علی گڑھ کی حکومت

سے باغی ہوگئیں ہیں، ورنہ اگر ان کے خدمات بھی شامل کرلیے جائیں، تو ان کے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل ہوگا، لیکن ایک طرف ان کے خدمات کو اپنے مفاخر میں داخل کرنا اور دوسری طرف ان کو سیہ کار اور گم کردہ راہ کہنا آئین انصاف نہ ہوگا۔ اگر اس موقع پر جب مسلمانوں کی آل پارٹیز کانفرنس ہورہی ہے، تو علی گڑھ جوبلی کے وقت فرزندان کالج کی بھی ''آل پارٹیز کانفرنس'' منعقد ہو اور سب مل کر ہماری تعلیمی گتھیوں کو سلجھانے میں متفق و متحد نظر آئیں۔

علی گڑھ تحریک کی جو اصلی دقت ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے اہل حل وعقد ایک ساتھ تعلیمی، سیاسی، اقتصادی، تمدنی اور ہر قسم کی کوششوں کا اپنی چہار دیواری کے دائرہ کو مرکز بنانا چاہتے ہیں اور یہ متضاد عناصر کبھی یکجا نہیں ہوسکتے۔ اگر ارباب علی گڑھ صرف تعلیمی تحریک کو اپنا مخصوص مرکز عمل قرار دے لیں۔ اور جہاں گیری کا خواب نہ دیکھیں تو ان کے حق میں اور مسلمانوں کے حق میں بھی مفید اور نفع بخش ہو اور مختلف عناصر کے تصادم کا خطرہ بھی جاتا رہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ایسے شاہانہ موقعوں پر بڑی اہم تبدیلیاں جو عام حالات میں ناجائز سمجھی جاتی ہیں۔ وہ بہ اعلان کردی جاتی ہیں۔ تقسیم بنگال جیسی ''طے شدہ حقیقت'' کی ترمیم کے لیے دہلی کے شاہانہ دربار کا موقع مناسب سمجھا گیا اور بلا پس وپیش اس کی تنسیخ کردی گئی۔ آج سے پچاس سال پہلے جو تعلیمی نصب العین اور طریقۂ کار علی گڑھ میں قرار دیا گیا تھا۔ اگر آج پچاس برس کے بعد حالات کے تغیر سے ہماری طے شدہ تعلیمی پالیسی میں ترمیم وتنسیخ کی ضرورت ہے، تو اس کے اعلان کا یہ پنجاہ سالہ جوبلی بہترین موقع ہے۔

ہم نے بار بار لکھا ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ اس فرقہ میں بہترین شخصیت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی ہے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے خیالات میں بہت کچھ انقلاب ہوا ہے۔ ہم کو توقع ہے کہ ان کے اس انقلاب سے اس تحریک میں بھی انقلاب پیدا ہوگا۔ اب ضرورت ہے کہ ہمارے تعلیمی مسجد کا قبلہ مغرب سے مشرق کو بدل جائے اور آج آستانۂ حکومت کے بجائے آستانۂ ملت کو اپنا سجدہ گاہ بنایا جائے اور یونیورسٹی سے عہدہ داران سرکاری کے بجائے خادمان قومی پیدا ہوں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

تو بدیں آرزو مرا برساں

(معارف، جولائی ۱۹۲۵ء)

آل سعود اور ہندوستانی مسلمان

اس مہینہ کا سب سے اہم واقعہ مدینہ منورہ کی سمت ابن سعود کی پیش قدمی ہے۔ یہ دیکھ کر شریف کے طرف داروں نے ہندوستان میں مختلف قسم کی افواہیں پھیلا دیں اور اسی اثنا میں خواہ غلطی سے یا جان بوجھ کر رائٹر نے بیت المقدس سے یہ خبر تمام دنیا میں پھیلا دی کہ خدانہ کردہ روضۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو نجدیوں کی گولہ باری سے نقصان پہنچا ہے۔ اس خبر نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں اک آگ لگا دی اور ایک عجیب طرح کی کشمکش مختلف خیال کے مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوگئی۔ بحمد اللہ کہ اس افواہ کی لغویت ثابت ہوگئی ہے۔ تاہم بعض اکابر مسلمانوں کی جلد بازی سے جو نقصان پہنچ چکا ہے، بہ مشکل اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے دشمن باہم مل رہے ہیں اور ہم پھٹ رہے ہیں۔

مکہ معظّمہ کے بعض مزارات اور موالد پر تاریخی حیثیت سے زمیندار میں اور مدینہ منورہ کے حملہ کے متعلق ہمدرد میں میرے خیالات ظاہر ہو چکے ہیں۔ اور وہ اکثر ناظرین کے مطالعہ میں آچکے ہوں گے۔ اس لیے ان کے اعادہ کی حاجت نہیں۔ لیکن ہم کو لکھنؤ کے علماء اور تعلیم یافتہ اصحاب کی اس تاریخی واقفیت پر ہمیشہ حیرت رہے گی کہ مشہور ''جلسۂ تحفظ آثار متبرکۂ حجاز'' کی ولولہ انگیز تقریروں میں سب سے زیادہ ماتم حضرت آمنہ، حضرت ابوطالب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا اور حضرت عبدالمطلب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا) کے مزاروں کے یا صرف قبوں کے ٹوٹنے پر کیا گیا۔ حالانکہ حضرت آمنہ کا مدفن مکہ سے بیسیوں میل دور ابواء میں ہے۔ ابوطالب کا مزار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا نہیں، بلکہ شریف ابوطالب المتوفی ۱۰۱۲ھ کا ہے اور اسی طرح یہ عبدالمطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کا نہیں بلکہ شریف عبدالمطلب المتوفی ۱۰۱۰ھ کا ہے۔ لیکن جاہل مطوفون اور مجاوروں نے ان کو کہیں سے کہیں ملا دیا۔ صحیح آثار متبرکہ کی شرعی حیثیت سے کس کو انکار ہے اور ان سے تبرک طلبی سے کس مسلمان کا دل خالی ہے۔

اسی کے ساتھ ہم ابن سعود اور ان کے علماء سے کہنا چاہتے ہیں کہ اگر حقیقت میں وہ عقائد

صحیحہ کو مسلمانوں میں پھیلانا چاہتے ہیں، تو وہ زمین سے مزارات اور قبوں کو توڑ کر نہیں پھیلا سکتے۔ بلکہ وہ صحیح تعلیم، وعظ و پند اور حکمت وموعظت سے پھیلا سکتے ہیں۔ ابن سعود اول آج سے سوا سو برس پہلے کیا اس سے بہت کچھ زیادہ نہیں کر گزرا لیکن ٹوٹی دیواریں پھر بن گئیں۔ گرے ہوئے قبے پھر بلند ہو گئے۔ ٹوٹی ہوئی پتھر کی سلیں پھر درست ہو گئیں، شکستہ لکڑی کے ڈھانچے پھر کھڑے ہو گئے۔ اسی طرح جو خلاف شرع چیزیں آج توڑی گئی ہیں۔ اگر وہ صرف زمین سے توڑی گئی ہیں اور دلوں میں اسی طرح بنی کھڑی ہیں۔ تو کل وہ اسی طرح زمین پر پھر بن جائیں گی۔ اس لیے اصلاح کا مستحکم اور مضبوط طریقہ صحیح تعلیم اور کتاب وسنت کی اشاعت ہے۔

صحیح تعلیم صرف ان چند کتابوں اور رسالوں میں محدود نہیں ہے جو ابن عبدالوہاب کی تصانیف ہیں، بلکہ تمام ائمہ سلف اور ہر مذہب فقہی کے مستند علماء کی تصنیفات میں موجود ہے۔ بلکہ درحقیقت خود نفس قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کی اشاعت ہی ہر قسم کی بدعتوں کے استیصال کے لیے کافی ہے۔ اس میں کسی مذہب وفرقہ کے اشخاص کی دل آزاری کی ضرورت نہیں، اگر اعراب اور بدوؤں میں مذہبی تعلیم پھیل جائے، تو حجاز سے ہر قسم کی بدامنیوں اور لوٹ مار اور خلاف شرع امور کا خاتمہ ہو جائے۔ صرف تلوار کے زور سے امن ہمیشہ قائم نہیں رکھا جا سکتا، مگر یہ فرض تنہا ابن سعود کا نہیں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ہے۔

گذشتہ مہینہ کی خبروں میں روس سے ایک خبر آئی ہے کہ وہاں کے شاہی کتب خانہ میں اٹھارہ سو برس کی لکھی ہوئی ایک قدیم فارسی کتاب ملی ہے، جس کو عربی زبان کی مشہور داستان الف لیلہ کی اصل سمجھا جاتا ہے۔ اس پر بعض لوگوں کو تعجب ہے کہ ایک عربی کتاب جس میں زیادہ تر خلفائے عباسیہ کے متعلق حکایات ہیں۔ فارسی میں اٹھارہ سو برس پہلے کیسے موجود ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم کو خوشی ہے کہ اس سے ہمارے قدیم مسلمان محققین کی تحقیق اور دیانت داری کا ثبوت ملتا ہے۔ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں تصریح کی ہے کہ فارسی کتاب ہزار داستان (ہزار قصے) کا فارسی سے عربی میں ترجمہ ہوا، اور یہی الف لیلہ کی بنیاد اول ہے۔ اس کے بعد اس میں ہزاروں قصے، واقعات، حکایات کا بعد کو اضافہ۔ ردوبدل اور ترمیم وتنسیخ ہوتی رہی اور فارسی مذاق کے بجائے اس میں عربی مذاق کا لحاظ رکھا گیا، عموماً جن و پری کے قصے اصل فارسی کے ہیں، باقی اضافے ہیں۔ لیکن بہرحال موجودہ مواد

کے لحاظ سے الف لیلہ ہزار داستان سے بالکل الگ چیز ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس قسم کے قصوں کے لکھنے کا نمونہ ہزار داستان تھا اور اسی کے انداز پر قصوں کے لکھنے کی تحریک اہل بغداد میں پیدا ہوئی۔ الف لیلہ کے مصنّفین کی شخصیتوں کے ذکر سے تاریخ تمامتر خاموش ہے اور ایسی کتاب کے جس میں سلاطین کی خانگی زندگیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہو، مصنّفین کی گمنامی کا سبب بالکل ظاہر ہے۔

جناب مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی بی، اے جن کی مذہبی اصلاحی کوششیں بحمد للہ کہ روز افزوں ہیں۔ ان کی تحریک سے ایک صاحب نے تمام علمائے ہند کے فتاویٰ در بارۂ حرمت تعزیہ داری جمع کیے ہیں۔ اور ان میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی سے لے کر اس وقت تک کے علماء کے فتوے موجود ہیں، جن میں چند علمائے ندوہ اور علمائے دیو بند کے بھی فتوے شامل ہیں۔ اودھ میں رہ کر کوئی تحریک مذہبی اٹھے اور اس کا مرکز لکھنؤ کا ایک خاص گوشہ نہ ہو، اس سے بڑھ کر اس کے عدم جواز کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ایک جوابی اشتہار میں ''حاجی شبراتی'' کی طرف سے بحوالۂ جمیع علمائے فرنگی محل نہ صرف اس کے جواز بلکہ استحباب کا فتویٰ شائع کیا گیا ہے اور جس کو شک ہو، اس کو فرنگی محل کی ایک ''مقیم ہستی'' کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ اگر ''جمیع علمائے فرنگی محل'' اس کے جواز و استحباب کا فتوی دیتے ہوں، مگر آج سے چند سال پہلے جناب مولانا عبدالباری صاحب کی تالیف سے فتاوائے علمائے فرنگی محل کا مجموعہ ''فتاویٰ قیام الملۃ والدین'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے ص ۲۸۳، ۲۹۶ پر حضرت مولانا عبدالحئیٔ صاحب فرنگی محلی، مولوی خادم احمد صاحب، مولوی علی محمد صاحب، مولوی عبدالہادی صاحب وغیرہم کے فتاویٰ مراسم تعزیہ داری کے حرام اور معصیت ہونے کے متعلق موجود ہیں۔

کبھی یہ حکم رہے، کبھی وہ ارشاد رہے

اس اعلان میں ہدایت کے جلی عنوان کے نیچے عبارت ہے۔ ''اہل سنت کو چاہیے کہ لامذہبوں، دہریوں اور غیر مقلدوں اور دیوبندیوں اور ندویوں کے فتوؤں سے بچیں اور علمائے سلف کی پیروی کریں۔ ہمارے خیال میں اس کے بعد ایک فقرہ چھوٹ گیا ہے اور وہ یہ کہ یعنی صرف ہماری پیروی کریں''۔ کیا ہمارا یہ قیاس درست ہے۔

''علمائے سلف کی پیروی کرو'' بالکل صحیح، مگر وہ علمائے سلف کون ہیں؟ جنہوں نے اس کے

جواز کا فتویٰ دیا ہے۔کیا امام ابوحنیفہ، کیا امام محمد، کیا امام ابویوسف، کیا امام مالک، کیا تیسری صدی کے علماء اور ائمہ یا بعض علمائے فرنگی محل جو شیعہ شاہان اودھ کے زیر حکومت تھے۔اگر انھوں نے اس کے جواز کا کبھی مصلحتاً فتویٰ دیا ہو، تو وہ قابل قبول نہیں۔ورنہ عام علمائے فرنگی محل کا معیار تقویٰ، تو ہمیں یقین ہے کہ اس سے زیادہ بلند تھا۔(معارف، ستمبر ۱۹۲۵ء)

اجلاس ندوہ

نومبر کی ۲۸/و ۲۹/ کو ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ شہر انبالہ میں منعقد ہوا۔ پرانی اصطلاح کے مطابق ایک جلسہ کی کامیابی کے جو شرائط ہیں۔وہ بہمہ وجوہ مکمل تھے۔سوا سو مہمان بھی تھے، علماء اور واعظین کا مجمع بھی تھا، قومی کارکنوں اور رہبروں کی جمعیت بھی تھی، ڈائس پر معززین کی نشست بھی تھی، استقبال کے جلوس بھی تھے اور اسلامیہ اسکول انبالہ کے بوائے اسکاوٹس کی خوبصورت مگر پرہیبت صفیں بھی تھیں۔مگر ان تمام محاسن نظر کے ساتھ جو چیز سب سے زیادہ دلکش اور مسرت افزا تھی۔وہ مختلف الخیال علمائے دین اور رہبران ملت کا دوش بدوش اجتماع تھا۔جس کا منظر یوں بھی اور خصوصاً ان دنوں مسلمان دیکھنے کو ترستے ہیں۔

علماء میں مولانا ثناء اللہ امرت سری، مولانا محمد صاحب جونا گڑھی، مولانا حافظ احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء، مولانا مناظر احسن استاذ الحدیث جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مولانا مفتی عبداللطیف صاحب استاذ التفسیر جامعہ عثمانیہ، صدر یار جنگ مولانا شروانی، نواب حسام الملک، مولوی سید علی حسن خاں، مولانا عبدالماجد بی اے دریابادی، مولانا فاخر الہ آبادی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب پٹیالوی، مصنف رحمۃ للعالمین، مولوی حاجی سر رحیم بخش صاحب، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا حاجی حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ دارالعلوم ندوہ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری، مولانا قاری عبدالسلام صاحب عباسی، مولانا عبدالرحیم صاحب ریواڑی، مدرس عربی سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، مصنف ایجوکیشنل کانفرنس، مولانا شاہ نظام الدین صاحب جھجری، مولوی عقیل الرحمٰن صاحب ندوی سہارن پوری، مولوی فضل قدیر صاحب ندوی مہتمم مدرسہ اسلامیہ، مولوی محمد حسن صاحب ندوی واعظ، مولوی عبدالغفور صاحب شر ندوی اور خادم العلماء سید سلیمان ندوی،

رہبران قومی اور معززین میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو، منشی سید شمس الدین صاحب سابق سکریٹری حمایت اسلام لاہور، آنریبل شیخ عبدالقادر، غازی عبدالرحمٰن، منشی احتشام علی صاحب رئیس لکھنؤ، نواب زادہ صاحب کرنالی، منشی وحیدالحسن صاحب رئیس اناؤ اور دیگر اعیان و اکابر موجود تھے۔

جلسہ میں عام مجلسوں کے خلاف دستور، صرف تین تجویزیں پیش ہوئیں۔ ایک دارالاقامہ کی تعمیر کے لیے ہر صوبہ سے ۱۵ ہزار کا مطالبہ اور دوسری تجویز جس کو ندوۃ العلماء کے اس اجلاس کا حاصل کہنا چاہیے۔ حسب ذیل تھی:

> ''ندوۃ العلماء تیس سال سے جماعت علمائے کرام اور عامۃ المسلمین کی خدمت میں یہ دعوت پیش کر رہا ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے فرقہ وارانہ نزاع اور مذہبی بحث و مباحثہ کے غلط طریقوں کو جن سے ملت کی پراگندگی اور انتشار کو ترقی ہوتی ہے۔ بند کریں اس لیے یہ مجلس اس وقت جماعت علماء اور عام مسلمانوں میں جو بعض مذہبی تنازعات غلط طریقہ سے پھیل رہے ہیں۔ ان پر سخت افسوس ظاہر کرتی ہے اور استدعا کرتی ہے کہ مسلمانوں میں اس رسوا کن تفرقہ پردازی سے پرہیز کیا جائے''۔

سید سلیمان نے اس کو پیش کیا اور مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری، مولانا عبدالرحیم ریواڑی، مولانا ثناءاللہ صاحب امرت سری، قاضی محمد سلیمان صاحب نے تائید کی۔

تیسری تجویز اگر انجام کو پہنچ جائے تو اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت ہو۔ پنجاب اور اودھ کے بعض اضلاع اور بمبئی کی بعض قومیں ترکہ اور میراث میں اصول اسلام کے بجائے رسم و رواج کو شریعت قرار دیتی ہیں۔ پنجاب جیسے خطہ میں شریعت اسلامیہ کی یہ توہین حد درجہ افسوس کے قابل ہے۔ امسال قاضی محمد سلیمان صاحب نے اس تجویز کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا اور مسلمانان پنجاب سے درخواست کی کہ وہ اس قابل شرم رواج کو چھوڑ کر شریعت اسلام کو اپنا اصول بنائیں اور ضرورت ظاہر کی کہ قانونی حیثیت سے ندوہ اس کے متعلق کچھ کرے اور مسلمانوں میں اس کے لیے باقاعدہ تبلیغ و وعظ کا کام انجام دے۔ بات تو سچ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کام باہر سے کرنے کا جس قدر ہے، اس سے زیادہ خود مقامی علماء کو ادھر متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن

صاحب لدھیانوی نے اپنی تائیدی تقریر میں ادھر ہی توجہ دلائی۔

جلسہ میں جو تقریریں ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہمارے عزیز دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی تقریر ''روح اسلام'' پر تھی۔ مولانا شروانی کی تقریر حسب دستور دلآویز، موثر اور صحابہ کرام کے واقعات سے لبریز تھی۔ عنوان تقریر ''حیات قرآنی'' تھا۔ ہمارے برادر عزیز مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی کی تقریر ''مقاصد ندوہ'' پر ماقل و دل تھی اور ان کے متعلق ڈاکٹر کچلو کا یہ قول کہ ''ہم کو ایسے ہی مولویوں کی ضرورت ہے''۔ بالکل سچ ہے شیخ عبدالقادر کی تقریر علوم مشرقی و مغربی کی باہمی ترکیب و امتزاج پر مدلل اور معقول تھی۔ (معارف، دسمبر ۱۹۲۵ء)

کانگریس، خلافت، جشن طلائی علی گڑھ

سال کے اختتامی ہفتہ میں کانپور اور علی گڑھ کے ہنگامے یادگار رہیں گے۔ کانگریس میں پانچ چھ برسوں سے جو انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ وہ مخفی نہیں۔ کانگریس اب خوشنما لباسوں، گداگرانہ تجویزوں اور فصاحت و بلاغت کی نمائشوں سے خالی ہو گئی ہے۔ اب وہ صرف کام کرنے والوں کی جماعت بن گئی ہے۔ اس کا تخاطب اب حکومت سے نہیں، ملک سے ہے۔ اس کو اب آزادی کا مطالبہ گورنمنٹ سے نہیں بلکہ خود قوم سے ہے مسلمانوں کی شرکت نے اس کی ہمتوں کو بڑھا دیا ہے۔

ہم سال بھر تک ہندو مسلم بگاڑ کے افسانے بہت سنتے رہے۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ہندوؤں کی ایک تعداد مسلمانوں ہی سے لڑنا ہندوستان کی آزادی سمجھتی ہے اور ان کا اکھاڑہ ہندو مہا سبھا ہے۔ لیکن کانپور کی کانگریس نے یہ بات ثابت کر دی کہ ابھی تک سمجھدار ہندو مسلمانوں کی تعداد ملک میں کافی موجود ہے۔ مالوی جی اور پنڈت موتی لال نہرو کی تجویز و ترمیم بظاہر ایک خاص تحریک سے متعلق تھی، مگر درحقیقت وہ محض تجویز و ترمیم کی جنگ نہ تھی۔ بلکہ دو مقابل کے نظام کار اور طرز عمل کی لڑائی تھی، جس میں مالوی جی کو شکست فاش ملی۔

امسال کی کانگریس کے متعلق یہ شکایت بجا ہے کہ اس کے اعلانات اور سائن بورڈوں اور کتبوں میں اردو کو جگہ نہیں دی گئی تھی، جس کی وجہ سے ہندی نہ جاننے والوں کو دقتیں پیش آتی رہیں۔ تاہم اس کی داد دینی چاہیے کہ صدر استقبالی نے اپنا پورا خطبہ صاف ستھری اردو میں پڑھا۔ کانگریس کی صدر محترمہ نے بھی اپنی آدھی تقریر اردو ہی میں کی اور آدھی انگریزی میں کی اور اپنی لکھی ہوئی

تقریر اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں چھپوا کر تقسیم کی۔ پنڈت موتی لال نہرو اور دیگر اکابر نے اردو ہی میں تقریریں کیں۔

خلافت کا اجلاس کانپور گو تزک واحتشام سے خالی تھا۔مگر تین چیزیں بالکل صاف اور کھلی تھیں۔ یہاں اعزاز واحترام کا مدار جیب کی گرانی اور دنیاوی اعزاز پر نہ تھا، کام پر تھا۔تمام مہمانوں میں سلوک اور برتاؤ کی یکسانی اور مساوات کارفرما تھی۔ دوسری چیز یہ تھی کہ یہ محض خوش پوش بات بنانے والے لوگوں کا مجموعہ نہ تھا۔ بلکہ صرف کام کرنے والوں اور کام چاہنے والوں کا مجمع تھا۔تیسری چیز یہ تھی کہ اس کے احاطہ میں مذہب صرف فیشن کے لیے نہ تھا بلکہ دل اور عمل کے لیے تھا۔

مجلس خلافت کے متعلق ایک بات صاف صاف کہنی چاہیے کہ اس مجلس کی اصل بنیاد گو خلافت کے قیام اور حجاز کی حقیقی آزادی پر رکھی گئی تھی۔تاہم کچھ ملکی کام بھی اس نے اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔خارجی ملک کے معاملات میں ہم عملی کام بجز تہنیت اور اظہار افسوس اور وفد بھیجنے ،مشورہ دینے اور روپیہ جمع کرنے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔حالات بدلتے جارہے ہیں اور اسی نسبت سے ہم کو اپنے رویہ میں بھی تبدیلی کرنی چاہیے۔ نئے انقلاب کی سب سے بڑی یادگار ہمارے پاس جامعہ ملیہ ہے۔ مجلس خلافت کو اب اس کو اپنا کام سمجھنا چاہیے اور اسی اصل کے ماتحت اس کو اپنی تمام تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کرنا چاہیے۔

امسال کے اجلاس خلافت میں سب نے اس کو محسوس کیا ہے کہ کوئی بڑا کام استقلال اور مضبوطی سے مسلمانوں سے اس وقت تک بن نہیں آسکتا۔جب تک ان میں دماغی انقلاب واصلاح پیدا نہ ہوں اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تک میں مکتب، دارالمطالعہ اور مدرسہ شبینہ کا جال بچھا دیا جائے۔اس کے متعلق امسال ایک برمحل تجویز منظور کی گئی ہے اور گویا یہی تجویز امسال کے اجلاس کا حاصل ہے اور یہی اصل کار ہے۔

امسال کانپور سے علی گڑھ جانے والوں کو یہ صاف نظر آ گیا کہ دونوں مجمعوں کی ذہنیتوں میں کیا فرق ہے۔علی گڑھ کے میدان میں داخل ہونے کے ساتھ چہل پہل، رونق اور نمائش کا پوری طرح اظہار ہورہا تھا۔ ڈھائی ہزار طلبہ کے ساتھ چند ہزار مہمانوں کی لال ٹوپیوں اور سیاہ کپڑوں میں آمدورفت نظر فریب منظر تھا۔اور یہ ملی جلی صورتیں شرکائے جلسہ کی کثرت وقلت کے مسئلہ کے لیے

ہمیشہ پردہ پوش رہتیں، معلوم ہوتا تھا کہ ادھر پانچ چھ برسوں سے جن فیشن ایبل لیڈروں، رہنماؤں، سرکاری عہدہ داروں، رئیسوں اور قومی تماشائیوں کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ سب کے سب ایک دفعہ ابل پڑے تھے کہ ہمارا پرانا زمانہ قسمت سے پھر عود کر آیا۔ ہمارے جاہ و جلال کا تخت دوبارہ بچھے گا اور قوم کی باگ ایک دفعہ پھر ہمارے ہاتھوں میں آئے گی۔

علی گڑھ کی سب سے نمایاں جگہ یعنی صدر نشیں کی نشست گاہ کے اوپر علی گڑھ کے کسی خوش مذاق شاعر کا جلی حرفوں میں کپڑے پر لکھ کر یہ شعر آویزاں کیا گیا تھا۔

وفا شعاری و حب وطنی و دیں پرستی کی علامت

کہ اپنے قومی نشاں میں تاج اور کھجور اور ہلال بھی ہے

یہ صحیح و فصیح و بلیغ شعر جس کے موزوں پڑھنے میں متعدد باکمال شاعروں کو کافی زحمت اٹھانی پڑی۔ درحقیقت علی گڑھ کی اصلی اور اندرونی ذہنیت تھی جو اس کے ذرہ ذرہ سے نمایاں تھی۔ منتظمین کار کو داد دینی چاہیے کہ انہوں نے علی گڑھ کا دل نکال کر سب کے سامنے رکھ دیا تھا۔

اردو کی بے کسی کا یہاں بھی وہی عالم تھا۔ کانفرنس تک تو کچھ خیریت تھی۔ ورنہ سات روز کے اندر کم کسی مشہور لیڈر نے اردو کو شرف بخشا۔ الا یہ کہ انگریزی نے خود ان کو اپنی واقفیت کے شرف سے محروم کیا ہو۔ تاہم دو چار سیکھے اور رٹے ہوئے فقروں کا برمحل اور بے محل بول دینا تو ضروری تھا۔ اردو کتب فروشوں نے بھی مسلم یونیورسٹی کا نام سن کر اپنی کتابوں کی دکانیں سجائی تھیں، مگر شاید ہی کسی سپید پوش سیاہ پوش نے ادھر نظر اٹھائی ہو اور اس پر اردو کی بے کسی کا اسی اسٹیج پر ماتم ہے۔

وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

جوبلی کا اجلاس ہر حیثیت سے نہایت شاندار تھا۔ کئی ہزار کا مجمع تھا۔ بجز دو طبقہ کے ہر طبقہ کے مسلمان بھی تھے، انگلستان اور ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے نمایندے بھی تھے۔ وائسرائے حضور نظام، دیگر حکام اور مسلمان رؤسا کے تہنیت نامے بھی آئے تھے۔ افغانستان کی تعلیمی نمایندگی بھی ہو رہی تھی اور لوگوں کو اس سے بے حد دلچسپی بھی تھی۔ قوم کے مدعیان رہنمائی اور مشاہیر بھی تھے۔ اور یہ ایک دلچسپ نظارہ تھا مگر ان لال ٹوپیوں کے بیچ میں ہماری آنکھیں جبہ و دستار کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں۔ السنۂ مغربی کی یونیورسٹیوں کے نمایندوں کی صف میں ہم اپنی مشرقی درس گاہوں کے فضلاء کو

بھی دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے مگر وہ نہ تھے۔

بہرحال ایک خاص خیال کے مسلمانوں کا نہایت مغتنم مجمع فراہم ہوگیا تھا۔موقع تھا کہ واقعی علی گڑھ تحریک کے پنجاہ سالہ جدوجہد پر ایک تبصرہ کیا جاتا اور اگر مسلمان دوسرے رہنماؤں کی غلط پیروی میں برباد ہورہے ہیں، تو ان کو صحیح ہدایت کی جاتی اور مسلم یونیورسٹی کو صحیح مسلمان یونیورسٹی بنانے کے لیے غور کیا جاتا اور امراء کی جیبوں کو ٹٹولنے کے علاوہ ارباب دانش کے سینے بھی ٹٹولے جاتے اور آیندہ کے لیے قوم کی تعلیمی و علمی جدوجہد کے لیے ایک پروگرام بنایا جاتا۔علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو فائدہ بھی پہنچایا ہے اور نقصان بھی پہنچایا ہے۔کاش اصحاب علی گڑھ سکون خاطر کے ساتھ پچاس برس کے قطع مسافت کے بعد ایک دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتے کہ ہم کہاں تک صحیح راستہ پر چلے اور آیندہ منزلوں کے طے کرنے کے لیے کیا ضرورتیں ہیں اور کیا صحیح مشورے ہیں۔

قیامت ہے مسلم یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ جوبلی کا نادر موقع جو پچاس برس کے بعد آیا تھا اور اب پچاس ہی برس کے بعد آئے گا۔اس کی افتتاحی اور صدارتی تقریر جو پنجاہ سالہ تجربوں کا نچوڑ اور حسب وعدہ قوم کی پنجاہ سالہ جدوجہد اور سعی و کوشش کا جائزہ اور آیندہ پچاس برس کا پروگرام ہوتیں۔ وہ محض وقتی زبانی خوش کن ظرافتوں، چٹکلوں اور گزشتہ دعووں کا اعادہ تھی۔ **اللھم ارحم امۃ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم**۔

تعلیمی اور علمی حیثیت سے جوبلی میں سب سے بہتر تقریر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر (پنجاب) کی تھی۔انھوں نے بالکل بجا طور پر مسلم یونیورسٹی کو ایک علمی یونیورسٹی بنانے کا صحیح مشورہ اور صحیح نقشہ پیش کیا، جس میں مشرقیات، علوم عربیہ اور اردو کو صحیح جگہ دی گئی تھی۔کاش شیخ صاحب کی یہ مفید تقریر آیندہ ہمارے مسلم یونیورسٹی کا نظام عمل اور طریقۂ کار بن سکتی۔جامعہ عثمانیہ کے کامیاب تجربے کے بعد اب اردو کے ذریعہ تعلیم بننے میں کسی کو کیا عذر ہوسکتا ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس کی بہار کے دن تو مدت ہوئی گذر چکے۔امسال توقع تھی کہ اس غیر معمولی مجمع کے موقع پر اس کی کرسیاں بھی خالی نہ رہیں گی۔مگر واقعہ ایسا نہ ہوا، لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اپنے قدیم طلب گاروں کی موجودگی میں بھی اس کی یہ بے رونقی افسوس کا باعث تھی۔چند سال سے مسلمان خواتین کو کانفرنس میں اپنے مناسب حق نہ ملنے کی پر خاش تھی۔امسال یہ حق زبردستی

حاصل کرلیا گیا اور خود کانفرنس کے اسٹیج سے دو خاتونوں کی طلب حق کے لیے "بغاوت انگیز" تقریریں ہوئیں۔ کانفرنس کی تجویزیں اسی پرانی بولی اور اصطلاحوں میں تھی، جواب صرف ایجوکیشنل کانفرنس کے "ٹوری ممبروں" کی زبانوں سے سنی جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سالانہ عرض و معروض کا آخر حاصل کیا ہے، بجز اس کے

حافظ وظیفۂ تو دعا کردن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر صاحبزادہ سر عبدالقیوم کی طرف سے جو صدارتی خطبہ پڑھا گیا۔ ہمارے خیال میں خیالات اور مشوروں کے لحاظ سے اس کے اکثر حصے بے حد عمدہ تھے۔ خصوصاً تعلیمی نصب العین، مطالعہ و تحقیق (طلبہ میں) اور ذریعہ تعلیم کے عنوانوں کے ماتحت نہایت عاقلانہ اور سودمند تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ صاحب زادہ صاحب کا یہ پورا خطبہ عملی نقطۂ نظر سے حد درجہ قابل غور ہے اور یہ وہی روح ہے، جو ان کے ماتحت اسلامیہ کالج کے بعض مسلمان فاضل پروفیسروں میں ہے۔

متاع خویش ز ہر دکاں کہ باشد

امید ہے کہ اسلامیہ کالج پشاور بھی ان سے عملاً فائدہ اٹھائے گا۔

تنظیم کانفرنس علی گڑھ میں ہوئی مگر اس کا علی گڑھ میں ہونا پسند نہ آیا۔ اور آج نہیں تو کل تنظیم کے کارفرماؤں کو اس سے بے جوڑ اور انمل صحبت پر خود افسوس آئے گا۔ تنظیم کے مقاصد سے کسی مسلمان کو شاید ہی اختلاف ہوسکتا ہو۔ بحث صرف اس کی ہے کہ آیا اس کام کے لیے کسی الگ مجلس کی بھی ضرورت ہے یا نہیں اور جن لوگوں کو ملانے کے لیے یہ الگ بن رہی ہے۔ وہ آگے چل کر کچھ مفید بھی ہوسکیں گے یا نہیں۔ بہر حال اس قابل غور نقطہ سے آگے بڑھ کر جو کچھ بھی اس کے ہال میں کہا گیا، درست تھا۔ شیخ عبداللہ یوسف علی صاحب کی تقریر میں صحیح ضرورتوں کا احساس اور صحیح علاج درج ہے۔ تنظیم کی تجویزوں میں سب سے اہم چیز ایک خدام الاسلام تربیت گاہ کا قیام ہے۔

مسلم یونیورسٹی کانووکیشن میں سب سے پہلے ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری کے لیے ہمارے کارواں کے آخری نقش قدم نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی کا نام پیش ہوا۔ موصوف کا اس

اعزاز کے لیے استحقاق ہدایت سے بھی زیادہ روشن ہے کہ اس سے اگر نواب صاحب کے سابق علمی اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، تو ہماری یونیورسٹی کے سابق علمی اعزاز میں ضرور اضافہ ہوا۔

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

علی گڑھ میں ہز ہائنس مہاراجہ الور کی تشریف آوری کئی حیثیتوں سے یادگار رہے گی۔ اولاً تو نفس ایک والی ملک کی مسلمانوں کے ایک علمی و تعلیمی مجمع میں آمد۔ دوسرے اس موقع پر ملک کے مسلمان والیان ریاست کا تغافل اور ایک ہندو خودمختار رئیس کی فرض شناسی، پھر نہ صرف آنا بلکہ تقریر کرنا اور ایسی تقریر کرنا کہ اس کی فصاحت و بلاغت، شاعرانہ نزاکت، تاریخی حوالوں، اخلاص ومحبت کی زبان ہندو مسلم اتحاد کی خواہش، مذاہب کا سچا ادب دیکھ کر لوگ عش عش تھے۔ اور بڑے بڑے طمطراق والے بھی حیرت سے انگشت بدنداں تھے اور اسی تعجب و حیرت کے سکون اور جوش وخروش کے نعروں میں مہاراجہ صاحب نے ۲۵ ہزار کے عطیہ کا اعلان کیا۔

مہاراجہ صاحب کو جو ایڈریس یونیورسٹی کی طرف سے دیا گیا۔ اس میں اس بات کا خاص طور سے تذکرہ تھا کہ ''افسوس ہے کہ ہمارے پاس دینیات کے صیغہ کے لیے سرمایہ نہیں''۔ ہندو والی ملک نے نہایت خندہ جبینی سے مسلمانوں کی دینیات کی تعلیم کے لیے ۵ برس کے لیے ۸ ہزار سالانہ کا عطیہ پیش کیا اور انہوں نے قبول کیا اور صدر سے لے کر پائیں تک اس کے لیے اس زورشور کی تالیاں گونجیں کہ کان کے پردے اڑ گئے۔ اس خوشی اور شادمانی کے غل میں ایک حزیں و مغموم آواز عالم سروش سے آئی۔

نام رقیب بر لب جانانِ من گذشت
واقف نہ شد کسے کہ چہ برجانِ من گذشت

اور کسی کے متعلق تو معلوم نہیں لیکن نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے متعلق سنا ہے کہ انہوں نے یہ آواز سنی۔ کیا ہمارے رؤسائے دین پرور اس پانچ سال کی رقم کو خود دائمی نہیں بنا سکتے۔

مسلم لیگ کا اکھاڑا امسال نہایت شاندار تھا۔ وہ تمام سیاسی رہنما جو اسی مسلم لیگ کی کرسی سے اٹھ اٹھ کر سرکاری مناصب عالیہ حاصل کر چکے تھے۔ اپنی اپنی باری پوری کر کے پھر اسی مسلم لیگ

کی کرسیوں پر فرصت کے خالی گھنٹوں کو پر کرنے کے لیے جلوہ فرما تھے۔سر عبدالرحیم کا خطبۂ صدارت ان کے عظیم الشان روایات کے بالکل خلاف تھا اور صرف اس لیے اس کو پسند کیا جاسکتا ہے کہ وہ مہا سبھا کی صدارتی تقریروں کا جواب بالمثل تھا۔ دو روز کے اجلاس میں جو کچھ ہوا، وہ الفاظ کی سحر کاری، مذہب کی نمائش اور لفظ آزادی کے مجازی استعمال سے زیادہ نہ تھا۔(معارف،جنوری ۱۹۲۶ء)

علی گڑھ میں علوم مشرقیہ

مسلم یونیورسٹی کے بعض ارکان کی کوشش ہے کہ یونیورسٹی میں علوم مشرقیہ کا بھی ایک صیغہ قائم ہو۔ کیونکہ مسلم یونیورسٹی کے لیے جب روپیہ فراہم کیا جارہا تھا،تو مسلمانوں کو اس کی توقع دلائی گئی تھی ۔اس لیے اب اس وعدہ کے وفا کرنے کے دن آگئے ہیں۔ چنانچہ اس غرض سے منتظمین یونیورسٹی کی دعوت پر چند ایسے علماء جو جدید ضروریات سے آگاہ اور نصاب ہائے تعلیم اور درس گاہوں کا تجربہ رکھتے تھے۔علی گڑھ میں جمع ہوئے اور متواتر سات اجلاسوں میں جو ۱۱ر فروری سے ۱۷ر فروری تک منعقد ہوتے رہے۔مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھا اور اس کے لیے ایک نقشۂ عمل اور ایک نصاب میٹرک سے ایم،اے تک کا تیار کر کے یونیورسٹی کے سامنے پیش کر دیا۔

اس مجلس کے ارکان حسب ذیل اصحاب تھےئ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی،مولانا سلیمان اشرف صاحب صدر علوم مشرقیہ مسلم یونیورسٹی،مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی صاحب استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد،مولانا امجد علی گھوسوی صدر مدرس مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر اور خاکسار۔مولانا عبدالعزیز صاحب میمن راجکوٹی استاذ ادبیات عربی مسلم یونیورسٹی نے بھی خاص خاص موقعوں پر شرکت کی۔علوم مشرقیہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔عقلیات، دینیات اور ادبیات اور ہر ایک کا علاحدہ علاحدہ نصاب ترتیب دیا گیا ہے۔جو ایف،اے کے پہلے سال سے ایم،اے تک ختم ہوجائے گا۔ ہمارا کام ختم ہوگیا۔اب نہیں کہا جاسکتا کہ منتظمین وارکان یونیورسٹی اس کو رد کریں گے یا قبول کریں گے۔ ہندو یونیورسٹی نے اپنے ہاں سنسکرت لازمی کردی ہے اور ہم کو ابھی ردوقبول میں پس وپیش ہی ہے۔(معارف،فروری ۱۹۲۶ء)

مسلم یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد

گذشتہ ماہ کا اہم تعلیمی واقعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا جلسہ تقسیم اسناد ہے۔اس جلسہ کی

اہمیت متعدد وجوہ سے قابل ذکر ہے۔ ہر ہائنس سرکار عالیہ بھوپال متع اللہ المسلمین بطول بقائہا کی تشریف آوری۔ ہز ہائنس نواب افتخار الملک سکندر صولت فرماں روائے بھوپال کی مسند نشینی کے بعد یونیورسٹی میں پہلی آمد۔ سائنس کالج کے سنگ بنیاد کی رسم ہر ہائنس فرماں روائے بھوپال کا اس کے لیے تین لاکھ کا شاہانہ عطیہ۔ ان کامیابیوں پر مسلم یونیورسٹی کے کارکن اصحاب تہنیت اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ہر ہائنس کے صادقانہ اور پر جوش خطبے جو جلسۂ عطائے اسناد اور نصر اللہ خان ہوسٹل کے افتتاح کے موقع پر دیے۔ وہ ان تمام محاسن سے لبریز ہیں، جن کی ایک حقیقی دیندار، روشن ضمیر، روشن خیال اور باخبر مسلمان سے توقع کی جاسکتی تھی۔ اگر درحقیقت مسلم یونیورسٹی کی روح وہی ہو جس کی سرکار عالیہ نے تمنا اور آرزو کی ہے۔ تو مسلمانوں کا یہ دارالعلوم یقیناً ان کی تجدید ونشات کا گہوارہ بن جائے۔

مسلم یونیورسٹی میں شعبہ علوم دینیہ کی جو حیثیت ہے وہ کسی باخبر سے مخفی نہیں۔ اس شعبہ کی ترقی کا جب ذکر آتا ہے تو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم مشرقیہ کی تجویز کے وقت کا سرسید مرحوم کا دلایا ہوا خوف فوراً اس کے کارکنوں کے دلوں پر چھا جاتا ہے کہ مبادا یہ فرسودہ علوم، جدید تعلیم کی طرف سے مسلمانوں کو غافل نہ کر دیں، حالانکہ اب یہ حال ہو چکا ہے کہ اگر آپ وظائف کی طمع دلا کر ہمت نہ بڑھائیں، تو یونیورسٹی کا کوئی طالب علم بھی ان بوسیدہ علوم کے مردہ ڈھانچہ کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہ کرے۔ لیکن ابھی تک خوف وہی مستولی ہے۔

اس لیے ہر ہائنس نے تقسیم اسناد کی تقریر میں بجا طور پر کارکنوں کو شعبہ علوم دینیہ سے غفلت پر تنبیہ فرمائی:

> ''اس موقع پر میں اپنے اس افسوس کو ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتی کہ جداگانہ قومی یونیورسٹی کا جو مقصد اولین تھا وہ موخر ہوتا جاتا ہے، یعنی اس کے شعبہ علوم اسلامیہ، دینیات اور اسلامی تاریخ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ کوئی خاص کوشش بھی اس کی ترقی کے لیے میدان عمل میں نہیں آئی۔ آج میں کسی قدر صفائی کے ساتھ یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر اس شعبہ پر فوری توجہ نہ کی گئی تو اس کے

یہی معنی ہوں گے کہ ہمارے مقدم جانشینوں نے جو وعدے قوم سے کیے تھے، ہم ان کے ایفاء کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے تعلیم دینیات میں اخلاق اور اسلامی تاریخ وسیر کی کمی اور بے اصولی پر بھی توجہ دلانی ہے''۔

ہر ہائنس نے اس پر افسوس کیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں ''آغاز اسلام'' کے ابتدائی رسالہ کے سوا عہد رسالت اور خلافت راشدہ کی تاریخ نہیں پڑھائی جاتی، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس عہد کی تاریخ کو اس لیے نظر انداز کیا گیا ہے تا کہ مسلم یونیورسٹی کے مشترکہ اسلامی ہال میں جنگ جمل اور جنگ صفین دوبارہ نہ چھڑ جائے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اس عہد کی تاریخ پر تقدس کا رنگ ہے، جس کے چھونے کی ہمارے نئے اساتذہ ہمت نہیں کرتے اور آخر یہ کہ اس عہد اقدس کے متعلق ''محققین یورپ'' نے اپنی دانست میں جو تنقیدی تاریخیں لکھی ہیں ان کی اگر کورانہ تقلید کی جائے تو پھر مسلمانوں میں مخالفت کا طوفان اٹھ جائے اور اگر ان کی تنقیدی تاریخوں کی تنقید کی جائے تو اس کے لیے احادیث وسیر کی اصلی واقفیت کی حاجت ہے۔ اور یورپ کے معیاری اساتذہ تاریخ میں یہ جوہر گراں مایہ کمیاب اور اس سے زیادہ اس عہد مقدس کے ساتھ وہ عقیدت، دلآویزی اور تعلق خاطر کمیاب، بلکہ نایاب ہے، جس کے بغیر اس عہد کی تاریخ کو ہاتھ لگانا مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے بے سود ہے۔

اسی سلسلہ میں سرکار عالیہ نے اس کی بھی تاکید کی کہ درس میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی باقاعدہ پڑھایا جائے اور فرمایا کہ:

''ہم کو اسلامی تاریخ کے متعلق نہ صرف تعلیم ہی کا انتظام کرنا ہے بلکہ مستقل طور پر تحقیقات جدیدہ کے انتظام کی ضرورت ہے اور میں متمنی ہوں کہ جس طرح کالج کے دور اول نے شبلی جیسا زبردست مورخ پیدا کیا اسی طرح آپ کی یونیورسٹی کا دور اولین متعدد شبلی پیدا کرے''۔

مگر شاید سرکار عالیہ کو یاد نہیں رہا کہ شبلی سا مورخ کالج نے پیدا نہیں کیا تھا بلکہ انہیں مدرسوں نے پیدا کیا تھا، جنہوں نے سرسید، وقار الملک، محسن الملک، حالی اور نذیر احمد کو پیدا کیا۔

ہر ہائنس نے نصر اللہ خان ہوسٹل کے افتتاح کے موقع پر سب سے پہلے اس طبقہ کو یاد کیا جس کو اس موقع پر کمتر یاد رکھا جاتا ہے اور فرمایا کہ یہ قوم کے غریب افراد کے لیے میں نے بنوایا ہے

اور اس کے بعد فرمایا:

''میں اس رقبۂ علمی میں ایسی عمارتیں دیکھنے کی متمنی ہوں جو جمہور مسلمانوں کی اکائیوں اور دہائیوں سے تعمیر ہوں، کیونکہ قومی تعمیر دراصل غریبوں کی مدد سے ہوتی ہے اور اسی سے قوم کی زندگی اور روح کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت ہمیں ان کو فراموش نہیں کرنا چاہیے''۔

ہر ہائنس نے نہایت موثر لہجہ میں مسلم یونیورسٹی کے متعلق اپنی دلی تمنا کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

''حضرات! ہماری قوم نے انتہائی جدوجہد کے بعد یہ یونیورسٹی قائم کی ہے اور اس کو مسلم یونیورسٹی کے مبارک نام سے موسوم کیا ہے، تو قدرتی طور پر ہم اس دارالعلوم میں ''مسلم'' کی نسبت سے جو برکت حاصل ہونی چاہیے اس کے آرزومند ہوتے ہیں۔ پس اس نسبت سے ہم اس کے طلبہ کو ارکان اسلام کا پابند اور اسلام کی ترقی میں سرگرم کوشش دیکھنا چاہتے ہیں، بلاشبہ یہ ایک رنجیدہ بات ہوگی کہ اس دارالعلوم اسلامی کے مسلمان دنیوی کاروبار میں اس قدر منہمک ہوجائیں کہ نہ تو ان کو اپنے ہادی برحق کی پیروی اور نہ ارکان اسلام کی پابندی کا خیال رہے''۔

امسال پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید سلطان احمد صاحب مسلم یونیورسٹی کے کانووکیشن کے خطیب اسناد منتخب ہوئے تھے۔ سید صاحب نے اس موقع پر جو نہایت سنجیدہ اور پر معلومات خطبہ دیا، اس کا خاص نقطۂ بحث یہ تھا کہ طلبہ کو دماغی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی اور اخلاقی تربیت بھی ضرور دی جائے۔ اور ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ خیر جسمانی ترقیوں کی تو کچھ کھیل کود سے تلافی ہوجاتی ہے۔ مگر جس کا اصلی رونا ہے وہ یہ ہے کہ ان درس گاہوں میں اخلاق کی بنا اور تربیت کی طرف ایک ادنیٰ سی توجہ بھی نہیں کی جاتی۔ اگر یہ سرکاری درس گاہیں مذاہب اور اقوام کے اختلاف کے باعث غیر مذہبی تعلیم اختیار کرنے پر مجبور ہیں تو کم از کم دنیاوی اخلاق و سیرت یعنی کیرکٹر کی بنا و تربیت ہی کی طرف توجہ کی جاتی لیکن جب ہندوستان ہی کو بے کیرکٹر کے افراد کا مجموعہ بنانا منظور ہو تو تعلیم کے انتظام سے پہلے سیاست کے بیرونی دباؤ کو کم کرنا ضرور ہے۔

مقرر نے ثانوی تعلیم کے لیے دیسی زبانوں میں تعلیم کی حمایت کی، مگر اعلیٰ تعلیم میں دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کو خودکشی کا مرادف بتایا، بہرحال جس حد تک دیسی زبان میں تعلیم پر سب متفق ہوں اسی کا تجربہ کرلیا جائے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ آیندہ کی اعلیٰ تعلیم دیسی زبان میں خودکشی ہے یا آب حیات ہے۔ مردہ اور زندہ قوموں کی مثالیں سب آنکھوں کے سامنے ہیں، اگر عرب اپنی ترقی کے عہد میں یونانی کو ذریعہ تعلیم بناتے اور یورپ کی قومیں اپنی زبانوں کو چھوڑ کر لاطینی میں تعلیم دیتیں اور جاپان انگریزی کے ذریعہ اپنے ملک میں اعلیٰ تعلیم کا رواج دیتا تو کیا نتائج وہی ہوتے جو ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ غیر زبان میں، غیر ماحول میں، غیر اصطلاحات میں جو تعلیم دی جائے گی وہ بھی غیر ہی ہوگی۔ اپنی نہیں ہوسکتی۔ (معارف، دسمبر ۱۹۲۶ء)

جامعہ ملیہ

ہندوستان کی آزاد قومی درس گاہوں میں جامعہ ملیہ، دہلی ایک ایسی درس گاہ ہے جس نے اپنا نصب العین ایسے اشخاص کا پیدا کرنا قرار دیا ہے جو مذہبی واقفیت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم کی تعلیم سے بہرہ ور ہوں۔ اور اپنے دل میں ملک وملت اور قوم و مذہب کا درد رکھتے ہوں۔ اور جو ان کی خدمت اپنا مشغلہ زندگی بنا سکیں اور اسی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے اپنی روزی کا سامان پیدا کرسکیں۔ جامعہ کے قیام کو ابھی صرف سات برس ہوئے ہیں۔ یہ مختصر مدت اس فیصلہ کے لیے کافی نہیں کہ وہ اپنے نصب العین میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ (یا بقول اصحاب جامعہ ہوئی ہے)

اس مدت میں اس جامعہ کی طرف سے متعدد طلبہ کامیاب ہوکر عملی میدان میں قدم رکھ چکے ہیں اور انہوں نے عموماً قومی خدمت کے لیے یا تعلیم وتدریس یا تحریر وانشاء اور اخبار نویسی کی زندگی اختیار کی ہے۔ سادگی، حسن خلق، اپنے وطن اور مذہب کے ساتھ محبت انہوں نے اپنا ممتاز شعار قرار دیا ہے۔ ان کی مذہبی پابندی بھی تمام دنیاوی درس گاہوں کے طلبہ سے اچھی ہے۔

اس کی بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو چند ایسے ایثار کرنے والے لائق مسلمان اساتذہ مل گئے ہیں۔ جنہوں نے نہایت خوشی سے اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں اور وہ شب وروز اس کی دھن میں مصروف ہیں۔ جب تک ان کا یہ ایثار، اخلاص اور انہماک باقی ہے۔ اس کی کامیابی

غیر مشکوک ہے۔

جامعہ نے اتنے ہی دنوں میں اپنا ایک اچھا خاصہ مشرقی ومغربی علوم کا کتب خانہ قائم کرلیا ہے۔ اردو اکاڈیمی کے نام سے ایک علمی مجلس کی بناڈالی ہے۔ علمی وسیاسی واقتصادی مسائل کے لیے جامعہ نام ماہوار رسالہ اور تعلیم کی اشاعت کے لیے پیام تعلیم پندرہ روزہ صحیفہ جاری کیا ہے۔ ساتھ ہی مفید تصانیف وتراجم کا سلسلہ بھی شروع کررکھا ہے جس میں اس کوروز بروز خاصی کامیابی ہورہی ہے۔

یکم اگست سے جامعہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہوا ہے۔ اس میں طلبہ کے داخلہ اور قیام اور تعلیم کے مفصل قواعد مطبوعہ موجود ہیں۔ اور وہ دفتر جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے مل سکتے ہیں۔ ایک طالب العلم کے لیے مختلف قسم کی فیسوں کی مجموعی تعداد پندرہ روپیہ کے قریب ہے، جونسبتاً انگریزی کالجوں سے ارزاں ہے۔ اس وقت اس کے ابتدائی، ثانوی اور انتہائی درجوں میں دوسو طلبہ تعلیم پارہے ہیں اور امسال مزید اضافہ کی توقع ہے۔

اس سلسلہ میں نامناسب نہ ہوگا اگر اصحاب جامعہ کی خدمت میں چند مخلصانہ گذارشیں پیش کی جائیں۔ ہمیں یہ ڈر ہے کہ اس کی مختصر مذہبی وعربی تعلیم میں ''مجتہدیت'' کی شان پیدا کرنے کی نہ کوشش کی جائے کہ اگر ایسا ہوا تو جامعہ کے یہ ''پڑھے جن'' مسلم یونیورسٹی کے ان پڑھ جنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں اور اسی طرح یہ بھی خطرہ ہے کہ اس کی معاشرت وسیاست میں ''ہندویت'' کا رنگ نمایاں نہ ہو، ''فرنجیت'' اور ''ہندویت'' اسلام سے مغایرت میں دونوں یکساں ہیں۔ ان میں فرق صرف بدیشی اور سودیشی کا ہے، جامعہ کے افتتاح کے وقت حضرت شیخ الہندؒ نے اس کے نصب العین کے متعلق جو الفاظ فرمائے تھے، ضرورت ہے کہ وہ ہر وقت اس کے ہر استاد اور طالب العلم کے سامنے رہیں۔

نیز یہ بھی پیش نظر رہے کہ جامعہ یورپ کے صرف سیاسی استیلاء سے آزادی کی تحریک نہیں، بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر اس کے دماغی وذہنی استیلاء سے آزادی کی تحریک ہے۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ ہم یورپ سے اس کے نئے علوم اور سائنس کے سبق نہ سیکھیں لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ہم اپنے مذہبی حقائق، مشرقی علوم اور آئین اصلاح وتجدید کا درس بھی اسی سے حاصل کریں اور اس کی تصدیقی سند ومہر کو ہم ان کے لیے صحت کا معیار جانیں۔ ''پیرس کے جامعی طالب العلم'' کے

شائع شدہ خیالات اس راز کی غمازی کررہے ہیں، دیکھیں ہمارا ''یوسف'' مصر سے جب کنعان آتا ہے تو اہل وطن کے لیے کیا تحفہ لاتا ہے۔ دعا ہے کہ ''برہان ربانی'' اس کے ''دامن خیال'' کو کشمکش کے نتیجہ سے محفوظ رکھے۔

جامعہ اس وقت قوم کے ارباب نظر کی نگاہوں میں آزمائش اور امتحان کے دور میں ہے۔ ضرورت ہے کہ وہ ہر راہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھے تاکہ دوسرے چالیس برس کے بعد مسلمانوں کو یہ فیصلہ نہ کرنا پڑے کہ ہم پھر غلط راستہ پر چل کھڑے ہوئے ہیں اور منزل مقصود کی سمت اور ہے۔

اسی کے ساتھ اس کے متعلق کچھ قوم کے بھی فرائض ہیں۔ اس کے ماہوار مصارف بڑی کفایت شعاری کے بعد غالباً اب ڈھائی تین ہزار ماہوار ہیں۔ بظاہر اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جناب حکیم صاحب کی بڑی دوڑ دھوپ اور محنت اور جانفشانی کے بعد بعض ریاستوں سے اس کو کچھ ماہوار امدادیں ملی ہیں۔ کچھ دہلی سے مقامی اعانتوں کا سامان ہوا ہے، کچھ لوگ باہر سے کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے ہیں، کچھ فیس کی رقمیں مل جاتی ہیں۔ مگر یہ صورت حال کب تک قائم رہ سکتی ہے۔ اس پراگندہ روزگاری سے پراگندہ دلی کا پیدا ہونا لازم ہے۔ ہماری قوم کو شکایت تھی کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان ایثار نہیں کرتے، مگر اب ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان ایثار کرنے والوں کو یہ شکایت نہ ہو جائے کہ قوم ہماری واجبی قدردانی نہیں کرتی۔ (معارف، اگست ۱۹۲۷ء)

ندوہ کی مالی مشکلات

ایک مرکزی دینی عربی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اہتمام وانتظام کا بار ہمارے سپرد بھی ہے۔ خدا جانتا ہے کہ اس کے مصارف وضروریات کے پورا کرنے کی فکر کس طرح شب و روز اس کے کارکنوں پر مسلط رہتی ہے مگر کامیابی کا کوئی ذریعہ نہیں سوجھتا۔ اس کی عظیم الشان درس گاہ سالہا سال سے نامکمل پڑی ہے۔ جوں توں کر کے ۳۴ ہزار لگا کر اس کے دارالاقامہ کا سلسلہ شروع کیا گیا، پچاس طلبہ کے لیے ۱۴ کمرے گو کسی طرح تیار ہو گئے مگر بیچ کا دارالمطالعہ ہنوز ناتمام اور اس پر بھی ایک ہندو ٹھیکہ دار کے سات ہزار کے ہم مقروض اور صرف اس کے رحم وکرم کے تقاضے پر آج ایک سال سے جی رہے ہیں۔ پچھلے سال کانپور کے اجلاس ندوہ میں جن جن صاحبوں نے جو کچھ لکھایا

وہ بار بار کے تقاضوں کے بعد بھی ہنوز ایفائے عہد کا منتظر.....

یوں ہوں میں شکوہ سے پُر، راگ سے جیسے باجا اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

قوم کے حساس دل اصحاب کو متنبہ رہنا چاہیے کہ اگر ہمارا یہی تغافل قائم رہا تو یہ عربی درس گاہیں، ایک ایک کر کے حکومت کے تعلقات میں گرفتار ہوتی چلی جائیں گی۔ بہت سی چلی گئی ہیں اور کچھ جانے کو تیار ہیں کہ ان کے ارکان کو ان کا وجود بہر حال عزیز ہے۔ ایسی حالت میں قوم کے خدمت گذار اور دین و مذہب اور اس کے علوم کے خدام کا وجود بھی مفقود ہو جائے گا۔ صرف تمام ملک میں ''مولوی'' کے بجائے ''ہیڈ مولوی'' ہی ''ہیڈ مولوی'' نظر آئیں گے۔ اس دردناک منظر کا تخیل آپ کے سامنے ہے؟ اور اگر ہے تو اس کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں؟ (معارف، اگست ۱۹۲۷ء)

ندوہ کا اجلاس امرت سر

امسال ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس امرت سر میں تھا۔ نومبر کی ۲۵/۲۶/۲۷ تاریخیں اس کے لیے مقرر تھیں۔ جناب مولانا غلام حسین صاحب وزیر امور داخلیہ و وزیر تعلیمات ریاست بہاولپور اس کے صدر تھے۔ جلسہ میں علماء اور تعلیم یافتہ اصحاب اور عام مسلمان شریک تھے۔ ریاست بہاولپور کو ندوۃ العلماء سے اس کے آغاز کار سے جو تعلق رہا ہے مولانا ممدوح کی صدارت نے اس کو اور بھی مستحکم اور نا قابل شکست بنا دیا۔ دار العلوم کی درس گاہ کی عمارت تمام تر اسی ریاست کی ایک شاہی خاتون کی مرہون منت ہے۔ ہماری امید تھی کہ اس درس گاہ کا نا تمام حصہ بھی اسی ریاست اسلامیہ کے دست جود و سخا سے انجام کو پہنچے۔ چنانچہ اس اجلاس میں جناب معلیٰ القاب ہز ہائنس فرماں روائے ریاست بہاولپور خلد اللہ ملکہ کی طرف سے پندرہ ہزار کی گراں قدر امداد مرحمت فرمائی گئی۔ ہز ہائنس کی اس توجہ و التفات شاہی سے متاثر ہو کر ریاست عالیہ کے ارکان و عمائد نے بھی دس ہزار کی رقم فراہم کی اور ریاست کی طرف سے دار العلوم کے صیغۂ وظائف میں تین سو سالانہ کی جو رقم عنایت ہوئی تھی۔ وہ بڑھا کر پانچ سو سالانہ کر دی گئی۔

جہاں تک مسلمانان شہر کا تعلق ہے۔ جلسہ کے اہتمام، حسن انتظام اور مہمان نوازی کے مصارف کے علاوہ ان سے خود ندوہ کو مالی امداد ان کی حیثیت سے کم ملی۔ جلسہ عام میں دو ڈھائی ہزار کا عام چندہ ہوا۔ مگر اس کی تلافی کا وعدہ جنوری میں کیا گیا ہے یعنی ڈھائی ہزار کی مزید رقم اس مہینہ میں

جمع کی جائے گی۔ارکان ندوۃ العلماء اس ایفائے عہد کے لیے چشم براہ ہیں۔

اس اجلاس کا معنوی ماحصل یہ رہا کہ یہ طے پایا کہ دارالعلوم میں مدرسین اور مبلغین کی تیاری کے لیے دو درجے کھولے جائیں۔بڑی مشکل یہ ہے کہ نئے مدرسے جو نئے انداز پر کھل رہے ہیں۔ان کے لیے لائق مدرسین نہیں ملتے اور روز بروز تدریس کا فن کم ہو رہا ہے۔اس طرح لائق اور قابل مبلغین کا قحط ہے۔میری طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی اور اس پر ایک گھنٹہ تک تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ہم کو خوشی ہے کہ حاضرین نے اس ضرورت کا اعتراف کیا اور اس کے لیے مسرت کے ساتھ آمادگی کا اظہار کیا۔تجویز تھی کہ ہونہار اور مستعد طلبہ کو اس کام کے لیے دو دو برس کے لیے پینتیس پینتیس روپیے تک کے وظیفے دیے جائیں اور ان کو دارالعلوم میں تدریس و تبلیغ کی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ اب تک اس شعبہ میں جن صاحبوں نے مالی امداد کا وعدہ فرمایا وہ حسب ذیل ہیں: ساہوکار جمال محی الدین صاحب مدراس ۳ وظیفے، مولانا غلام حسین صاحب صدر اجلاس و وزیر داخلیہ و تعلیمات بہاولپور، ۱ وظیفہ، جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۱ وظیفہ، جناب حاجی نظام الدین صاحب ناظم مالیات حمایت اسلام لاہور ۱ وظیفہ، مسلمانان ہوشیار پور ۱ وظیفہ، جناب منشی امتیاز علی صاحب وکیل فیض آباد ۱ وظیفہ، انجمن اسلامیہ امرت سر ۱ وظیفہ۔دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبہ جو اس درجہ میں داخل ہونا چاہیں، اپنی درخواستیں معتمد تعلیمات دارالعلوم کے پاس بھیج سکتے ہیں۔

حسب دستور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی دل گداز اور موثر تقریر جلسہ کی روح تھی۔دارالعلوم کے طلبہ نے عربی اور اردو میں جو تقریریں کیں وہ نہایت حوصلہ افزا تھیں۔مولوی عبدالرحمٰن کاشغری کا عربی قصیدہ اور محمد اکبر اور نجم الدین طالب علم کی تقریریں بہت پسند کی گئیں اور ان کو انعامات دیے گئے۔اور تین فارغ التحصیل طلبہ، مولوی عبدالرحمٰن کاشغری، مولوی قاری محمد منیر لکھنوی اور مولوی عتیق احمد بھاگل پوری کو سند فراغ دی گئی۔(معارف، دسمبر ۱۹۲۷ء)

انجمن ترقی اردو

انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد دکن) نے اردو کی ترقی کے میدان میں ایک نیا قدم اٹھایا ہے۔ یعنی مخصوص سائنس کے مضامین اور مسائل کی اشاعت کے لیے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء اس کا نام

''سائنس'' ہے اور اس کا پہلا پرچہ ۱۱۰ صفحوں کی ضخامت پر، رسالہ اردو کی تقطیع پہ ٹائپ میں نکلا ہے۔ رسالہ میں شذرات اور اخبار علمیہ اور تبصرے کے علاوہ متعدد سائنٹفک مضامین نے اس کی اس اشاعت میں جگہ پائی ہے۔ ڈاکٹر مظفر الدین قریشی (جامعہ عثمانیہ) نے اس کی ادارت کے فرائض اپنے ہاتھ میں لیے ہیں۔ ترجموں کے علاوہ بعض مستقل مضامین بھی اس میں لکھے گئے ہیں۔ یورپ کے بعض علمائے سائنس نے بھی اس میں مضامین لکھنے کا وعدہ کیا ہے، جن میں سے ایک دو کے مضمون اس پہلے پرچہ میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ مضامین میں سہولت اور عام فہمی اکثر ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی مختلف لوگوں کی طرف سے خالص سائنٹفک رسالوں کے نکالنے کی ناکام کوششیں کی گئی ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ کی کوشش بڑے ساز و سامان کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ اس لیے اس کی بقاء کی توقع کی جاسکتی ہے۔ قیمت آٹھ روپے سالانہ ہے۔ (معارف، فروری ۱۹۲۸ء)

تاریخ ہند اور ہندو اہل قلم

ہمارے ہندو اہل قلم اور علم پرور احباب جس طرح اسکولوں اور کالجوں کے ہندو طلبہ اور عام ہندوؤں کو عموماً تاریخ کے پردہ میں گھڑے ہوئے افسانے سنا سنا کر گمراہ اور متعصب بناتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال ہمارے کانوں تک پہنچی ہے۔ احاطہ بمبئی کے ایک مقام ماہی کنتھا ایجنسی سے گجراتی ہندو ہیڈ ماسٹروں کی تالیف سے ابتدائی گجراتی اسکولوں کے لیے ایک مجموعۂ مضامین شائع ہوا ہے۔ جس کا نام ''سمود سنگرہ'' ہے۔ اس کتاب کی تیسری جلد کے صفحہ ۱۶۲ میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ''سچی بہادری'' ہے۔ اس مضمون میں بصورت مکالمہ درگا داس (ملازم جسونت سنگھ) اور دلیر خان اور سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی ''ارمینین بیوی (یا لونڈی) گلنار بیگم'' اور کام بخش شہزادہ کی باہمی گفتگو قلم بند کی گئی ہے۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ کی یہ ارمنی بیگم درگا داس پر جو اس وقت عالم گیر کے ہاں قید تھا، عاشق ہوگئی تھی اور اس غرض سے وہ چھپ کر قید خانہ گئی ہے کہ درگا داس کو ڈرا دھمکا کر اور سمجھا بجھا کر اپنی محبت پر راضی کرلے۔ لیکن بہادر شریف راجپوت صاف جواب دیتا ہے اور اس ننگ کو گوارا نہیں کرتا۔ اتنے میں بیگم کا فرزند شہزادہ کام بخش داخل ہوتا ہے اور بیگم شہزادہ کو درگا داس کے قتل کا حکم دیتی ہے۔ ابھی کام بخش کی تلوار ہوا ہی میں بلند ہوتی ہے کہ شہنشاہ کے افواج قاہرہ کا سپہ سالار دلیر خان داخل ہوتا ہے اور اس گفتگو کو سن کر بیگم اور کام بخش کو ملامت کرتا ہے اور اس

بہادر راجپوت کی شرافت سے متاثر ہوکراس کو رہا کردیتا ہے اور اپنے ۵۰۰ سواروں کی حفاظت میں اس کو راجپوتانہ بھیج دیتا ہے۔

یہ ہے اس ''تاریخی افسانہ'' کا خلاصہ جو گجرات کے بچوں کو پڑھانے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ واقعہ کیا ہے درگا داس جو جسونت سنگھ والی جودھپور کا ملازم تھا اور اس کی صوبہ داری کابل کے زمانہ میں اس کے ساتھ تھا اور جو کابل میں اس کے مرنے کے بعد اس کے دونوں بیٹوں کو لے کر بادشاہی اجازت کے بغیر راجپوتانہ بھاگا تھا۔ اور جس نے اکبر (اورنگ زیب کے لڑکے) کو بغاوت پر آمادہ کر کے اور اس کو ساتھ لے کر سنبھاجی مرہٹہ کے پاس چلا آیا تھا۔ وہ کبھی گرفتار ہی نہیں کیا گیا، گلنار بیگم اورنگ زیب کی مدخولہ کنیز کا نام تھا جو کام بخش کی ماں تھی۔ گلنار کو بعض یورپین سیاحوں نے ارمنی بتایا ہے، بعضوں نے اودے پوری لکھا ہے۔ بہرحال کوئی بھی ہو، کیا کوئی بے غیرت سے بے غیرت عورت یہ کرسکتی ہے کہ اس قسم کے ناجائز تعلق کے بیچ میں اپنے جوان لڑکے کو واسطہ بنائے۔ پھر ایسی حالت میں کہ کام بخش اس کا لڑکا پورا جوان ہو چکا ہے۔ اس کی ماں کی عمر چالیس سے کیا کم ہوگی، کیا اس سن وسال کی عورت اس عشق کے سودائے خام میں گرفتار ہوسکتی ہے اور کیا اورنگ زیب سے واقف کار کبھی گلنار کے اس فقرہ کو تسلیم کرسکتا ہے۔ ''مجھے شہنشاہ کی پروا نہیں وہ خود میرے حکم کا غلام ہے''۔

اس قسم کی بے اصل اور بے بنیاد مضامین کی اشاعت سے ہندو مرہٹی، گجراتی اور بنگالی انشا پردازوں کا مقصود کیا ہے؟ اگر صرف اپنی خیالی انشا پردازی کا زور قلم دکھانا ہے تو اس کے لیے جاندار مخلوقوں کے بجائے جو گو اس وقت مردہ ہیں بے جان مخلوقات کی طرف سے مکالمہ زیادہ مناسب ہے کہ نہ وہ خود جواب دینے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ کوئی ان کی حمایت میں زبان کھولے گا اور اگر تاریخی واقفیت کا اشتہار مقصود ہے، تو ابھی خالص ہندوستان کی خاک میں اس جوہر کے پیدا ہونے کے لیے زمانہ درکار ہے، پھر اس مکالمہ کو افسانہ کہا جائے یا تاریخ؟ کیا ہمارے ہندو اہل قلم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح اپنی تاریخ کو انھوں نے ''خرافات کہن'' بنالیا ہے۔ اسلامی تاریخ کو بھی اسی درجہ پر لے آئیں؟

ہم نے ہندو مورخوں سے بارہا کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہندوستان کی بھلائی مقصود

ہے، تو منافرت اور کشمکش کے واقعات پھیلانے کے بجائے اگر وہ ان واقعات کا انتخاب کریں جن سے ملک کی ان بڑی دو قوموں میں میل ملاپ اور اتحاد پیدا ہو، تو یہ اس بدنصیب ملک کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ ورنہ اس قسم کی خرافات نگاری سے نہ وہ علم کی خدمت کررہے ہیں اور نہ قوم کی۔

(معارف، اگست ۱۹۲۸ء)

سر راس مسعود، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا مسئلہ ایک مدت سے زیر بحث تھا۔ بحمداللہ کہ فروری کے اوائل میں کورٹ کے پورے ایوان نے متفقہ آواز سے اس کا جو فیصلہ کیا۔ اس نے نہ صرف علی گڑھ بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی تسلی اور سکون کی فضا پیدا کردی۔ سید راس مسعود کا انتخاب اس وقت بہترین انتخاب تھا۔ روایتی اور خاندانی اثرات کو چھوڑ کر ہم نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جو نئی تعلیم یافتہ جماعت میں مشرقیت کا بہترین حامل ہے، جس کو ایک بڑی اسلامی سلطنت کے تعلیمی نظام کا عملی تجربہ ہے۔ جس کو یورپ اور مشرق کے بہترین تعلیمی نظامات کے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اور جس کو ''لبرل کنسرویٹو'' دونوں جماعتوں میں اعتبار حاصل ہے۔ ہم کو پوری توقع ہے کہ یہ انتخاب یونیورسٹی کی بہت سی بیماریوں کا کامیاب علاج ثابت ہوگا۔

ع سالے کہ نیکو است از بہارش پیدا است۔ ہم کو یونیورسٹی میں جس نایاب عنصر کی تلاش ہے وہ ایثار ہے۔ ہم کو خوشی ہے کہ سید راس مسعود نے یونیورسٹی کے لوگوں کو سب سے پہلے اسی کا سبق دیا۔ سب کو معلوم ہے کہ عین اس وقت جب قوم نے ان کے سامنے وائس چانسلری کا آنریری عہدہ پیش کیا، ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست نے ان سے ایک ہزار کے پنشن کے علاوہ دو ہزار ماہوار کے ایک ممتاز عہدہ کے قبول کرنے کی خواہش کی۔ مگر انہوں نے پورے ایثار کے ساتھ قوم کی بے دام اور بے مزد نوکری کو ایک ریاست عظمیٰ کے اعلیٰ ترین منصب اور گراں قدر معاوضہ کے مقابلہ میں قبول کرلیا۔ یونیورسٹی کی سرنو تعمیر میں اسی قسم کی مثالوں اور نظیروں کی ضرورت ہے۔

ہم کو اس انتخاب سے جو سب سے بڑی توقع ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ سید راس مسعود پر تقریباً ملک کے ہر طبقہ کو یکساں بھروسہ ہے اور خود علی گڑھ کے تعلیم یافتوں میں موالات و ترک موالات کے سبب سے نااتفاقی کی جو خلیج حائل ہوگئی ہے۔ سید راس مسعود کے آجانے سے وہ پوری طرح پٹ جائے

گی اور یہ علی گڑھ کے معاملات کی درستی کی راہ میں بہت بڑی کامیابی ہے۔(معارف، اپریل ۱۹۲۹ء)

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی اخبار

یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ پنجاب کے مسلم آؤٹ لک کے سوا ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بھی قابل ذکر انگریزی اخبار نہیں۔ ہفتہ وار مسلمان کلکتہ خدا جانے کس طرح جی رہا ہے۔ وہاں مسلم کرانیکل بڑی شان سے ہفتہ وار نکلا تھا مگر شاید وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا۔ علی گڑھ کا ''میل'' اب شاید ''مال گاڑی'' ہے۔ پچھلے سال صوبہ متحدہ سے مسلمانوں کی متحدہ طاقت سے ایک روزانہ انگریزی اخبار نکلنے والا تھا مگر طاقتیں متحد نہ ہوئیں۔

اس سلسلہ میں الٰہ آباد سے امید کا ایک نور چمکا ہے یعنی اسٹار (ستارہ) نام ایک ہفتہ انگریزی صحیفہ نکلنا شروع ہوا ہے، جو سیاسی، اصلاحی، علمی اور تعلیمی تمام ضرورتوں پر حاوی ہے۔ غالباً ڈاکٹر شفاعت احمد خان اس کے روح رواں ہیں۔ اب تک اس کے جتنے پرچے نکلے ہیں وہ ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔ طرز سیاست میں لوگوں کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ اب یہ انگریزی داں مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اس کو خرید کر اس کی ہمت افزائی کریں۔ سالانہ چندہ ۱۲/روپے ہے۔ پتہ: اسٹار الٰہ آباد۔(معارف، دسمبر ۱۹۲۹ء)

اردو اور انگریزی حکومت

اردو معلمین و مدرسین کے لیے اصول تعلیم پر میسور گورنمنٹ کا ایک ایسی اہم کتاب کو شائع کرنا خود ظاہر کر رہا ہے کہ ریاست مذکور نے اپنی مسلمان رعایا کی خاطر اردو مدرسوں اور مکتبوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ اور ان کے لیے وہ باقاعدہ معلم و مدرس بھی تیار کرتی ہے۔ یہ تو اس دور افتادہ خطہ کا حال ہے، جہاں ایک ہندو ریاست کا حکمران ہے، جہاں ہندوؤں کی کثیر آبادی ہے، جہاں کے مسلمانوں کی بھی اردو مادری زبان نہیں لیکن ایک پاس ہی کے صوبہ بہار پر نظر ڈالیے، جہاں اردو نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ہندوؤں کی بھی مادری زبان ہے۔ جہاں انگریزی حکومت قائم ہے، جو پچھلے دور میں اردو کا ایک مرکز رہا ہے، جس کے دارالسلطنت کو اردو کے ایک علمی و ادبی زبان بنانے میں دخل کامل رہا ہے اور عجیب تر یہ ہے کہ یہ کوشش خود یہاں کے ہندو فرماں رواؤں کے ذریعہ انجام پائی۔ آج وہاں کی عدالتوں میں اردو کو بار نہیں اور اردو خط وہاں سرکاری دفاتر سے خارج ہے۔

پچھلے سال صوبہ بھر کے مسلمانوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ سرانٹی مکڈانلڈ کی اس ''لعنت'' کو ملک سے دور کیا جائے۔کونسل میں تحریک پیش ہوئی، نامنظور ہوئی اور آخر ہندو ممبروں کی ایک واک آؤٹ کی پالیسی کا نقصان ان پر ثابت کرنے کے لیے ان کی غیر حاضری میں دھوکے سے یہ تجویز پیش کرا کے منظور کرالی گئی، مگر گورنمنٹ کو تو اس سے صرف ہندو ممبروں کو سبق دینا تھا۔اس لیے جب عمل کا وقت آیا تو مسلمانوں کو جواب ملا کہ ''ہم اقلیت کو خوش کرنے کے لیے اکثریت کو ناراض نہیں کر سکتے''۔

موجودہ سیاسی تحریک کے موقع پر مسلمان سوراجیوں نے گورنمنٹ کی اس پالیسی کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو ترغیب دی کہ ''جب گورنمنٹ اقلیت کو خوش رکھنے کے لیے اکثریت کو ناراض نہیں کر سکتی تو اقلیت کو خود اپنے خوش رہنے کے لیے چاہیے کہ اکثریت کو اپنے سے راضی کرلے''۔اس دلیل نے سینکڑوں کونسلوں کی متفقہ تجویزوں سے زیادہ موثر ہونے کا ثبوت دیا اور ''اکثریت کی ناراضی'' کا خیال کیے بغیر ''اقلیت کو خوش'' کرنے کی یہ تدبیر کی گئی کہ پٹنہ کمشنری میں اردو خط کی امتحاناً اجازت دے دی گئی مگر ساتھ ہی اردو کے ساتھ رومن خط کو بھی اس اجازت میں شریک کر کے اردو کے دائرہ کو کم کرنا ضروری سمجھا گیا۔نہیں معلوم رومن خط کی اجازت صوبہ کی اقلیت کو خوش کرنے کے لیے ہے یا اکثریت کے یا کسی ''اقل قلیل جماعت'' کے۔

بہرحال اب اس کمشنری کے اردو داں اور اردو پسند اصحاب کا یہ فرض ہے کہ اس حق کو عنایۃً عارضی اور امتحانی طور پر قبول کرنے کے بجائے اپنی کوششوں سے مستقل طور سے حاصل کریں اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اردو اخبارات، رسائل اور کتابیں شائع کی جائیں۔پریس اور مطابع قائم کیے جائیں۔سرکاری دفاتر اور ڈاک خانوں سے اردو فارم بہ کثرت مانگے اور استعمال کیے جائیں۔اردو انجمنیں اور مجلسیں بنائی جائیں۔صوبہ کے اردو مصنّفین اور اہل قلم کی حوصلہ افزائی کی جائے۔دیہاتوں میں اردو مکتبوں کے قیام پر زور دیا جائے اور ان کے لیے خود صوبہ کے اندر ابتدائی کتابیں تیار کی جائیں۔(معارف، اکتوبر ۱۹۳۰ء)

انگریزی ترجمہ قرآن

مسٹر مارمڈیوک پکتھال جو ایک راسخ العقیدہ انگریز مسلمان ہیں۔اور مدت تک مصر وٹر کی

اور ہندوستان میں رہ چکے ہیں اور بالفعل حیدرآباد دکن کے ایک اسکول میں ہڈ ماسٹر ہیں۔ عربی کے ایک متوسط درجہ کے فاضل ہیں لیکن مصر کے قیام کے سبب سے عربی سے بہت کچھ آشنا ہیں۔ ان کا مدت سے ارادہ تھا کہ وہ انگریزی میں قرآن پاک کا ''روح پرور ترجمہ'' کریں۔ میری ان کی ملاقات انگلستان سے ہے، مگر غالباً ۱۹۲۷ء میں وہ جب انگلستان سے کولمبو ہوکر ہندوستان واپس آرہے تھے، تو مدراس میں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس وقت انہوں نے اس ترجمہ کا ذکر کیا اور سورۂ روم کا جو ترجمہ انہوں نے کیا تھا، وہ دکھایا اور یہ بھی کہا کہ کسی امریکن دارالاشاعۃ نے اس کے چھاپنے کا ذمہ لیا ہے۔ اسی دوران میں انہوں نے احمدی ترجمہ کو ''بے روح ترجمہ'' کا خطاب دیا تھا۔ اور خود وہ جس ترجمہ کو چاہتے تھے۔ اس کے لیے شعلہ زن یا آتشیں (Fiery) صفت ظاہر کی تھی۔

مسٹر موصوف کا یہ شوق دیکھ کر سرکار نظام خلد اللہ ملکہ نے ان کو معاوضۂ کثیر کے ساتھ دو برس کی لمبی رخصت عنایت کی اور وہ مصر اور انگلستان میں رہے۔ آخری اطلاع کے بموجب یہ سن کر مسرت بے اندازہ ہوئی کہ موصوف نے اپنا ''آتشین'' ترجمہ تیار کرلیا اور مصر کے بعض مشہور علماء نے اس کی صحت پر مہر توثیق ثبت کی۔ خدا کرے کہ ان کا یہ کام ایسا ہی انجام پایا ہو اور مذہب کی طرف سے مغرب کے افسردہ دلوں کی گرمی اور حرارت کا باعث ہو۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۳۰ء)

ہندوستانی مسلمان اور حرمین میں علمی خدمت

حرمین محترمین کی علمی خدمت گذاری کی عزت جہاں بہت سے مسلمان قوموں کو حاصل ہوئی، وہاں ہندوستانی مسلمانوں کو بھی حاصل ہوئی۔ گجرات کی اسلامی سلطنت جب تک قائم رہی، اس کی طرف سے مکہ معظّمہ میں مدرسہ قائم رہا۔ اسی مدرسہ کے ناظر و مدرس اعلیٰ قطب الدین نہروالی تھے، جو اعلام اور تاریخ یمن کے مصنف ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بنگالہ کی خودمختار اسلامی سلطنت بھی اس شرف سے محروم نہ رہی۔ زمانہ نے جب رنگ بدلا، تب بھی یہ اعزاز ہندوستانی مسلمانوں کے حصہ میں آیا۔ مکہ معظّمہ میں مدرسۂ صولتیہ اور دوسرا مدرسۂ فخریہ ہندوستانی مسلمانوں ہی کے چندوں سے چل رہے ہیں۔ مدینہ منورہ میں مدرسۂ نظامیہ ہے۔ اس کے خدمت گذار بھی ہندوستانی ہی ہیں اور سرکار نظام خلد اللہ ملکہ کو ان سب کی اعانت کا فخر حاصل ہے۔

اب چند سال سے مدینہ منورہ میں ایک اور بڑا مدرسہ مدرسۃ العلوم الشرعیہ کے نام سے مولانا

سید احمد صاحب مہاجر مدنی (برادر مولانا حسین احمد صاحب) نے قائم فرمایا ہے۔ مولانا کی ذات بابرکات مدینہ منورہ میں ایک عجیب ہستی ہے۔ ایسی مخلص، متواضع، دردمند، شاید ہی کوئی شخصیت وہاں ہو اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو وہاں ہر دل عزیزی بھی عطا فرمائی ہے۔ موصوف بڑے ہی ایثار کو کام فرما کر بڑی محنت سے وہاں مدینہ منورہ کی شایان شان ایک دینی درس گاہ کے قیام میں کوشش فرما رہے ہیں۔ چنانچہ چند سال سے وہاں یہ مدرسہ قائم ہے۔ دس بارہ مدرس جو ہندوستان، مراکش اور عرب مختلف ملکوں کے ہیں، درس دیتے ہیں۔ دو ڈھائی سو طلبہ جو مسلمانوں کے ہر ملک و دیار کے ہیں، اس میں پڑھتے ہیں۔ مدرسہ کی عمارت بھی ہے۔ مختصر کتب خانہ بھی ہے۔

اس مدرسہ میں مدرسین اور کارکن جو کام کر رہے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سب سے بڑے مدرس کی تنخواہ ۲۵ روپیہ ہے اور کم سے کم دس بارہ روپیہ۔ جن کو دیار عرب جانے کا اتفاق ہوا ہے، ان کو وہاں کی گنی اور گرانی کا پورا علم ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ دس، بیس، تیس روپیوں کی وہاں کیا قیمت ہے۔ ضرورت ہے کہ حساس مسلمان اس مدرسہ کی طرف توجہ فرمائیں اور مسلمانان ہند کے اس تازہ پرفخر کارنامہ کو نشو و نما اور ترقی کا موقع دیں۔ یہ درس گاہ ایسے ہاتھوں میں ہے، جن کے صدق و دیانت و راست بازی پر پورا یقین ہے۔ ابھی پچھلے چند سالوں میں جو علماء و اکابر مدینہ منورہ گئے ہیں۔ انہوں نے اس کی نسبت بہتر سے بہتر رائے کا اظہار فرمایا ہے، جو لوگ اس کار خیر میں حصہ لینا چاہیں، وہ کوٹھی حاجی علی خان صاحب دہلی یا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب، جھاؤلال امین آباد لکھنؤ کے پتہ سے روپے بھیج سکتے ہیں۔ مدرسہ کی سالانہ روداد ہر سال شائع ہوتی ہے۔ سال گذشتہ کی روداد گذشتہ ماہ ہندوستان میں شائع ہوئی ہے۔ (معارف، مارچ ۱۹۳۱ء)

مسلم یونیورسٹی اور سر راس مسعود

ہماری مسلم یونیورسٹی میں نواب مسعود جنگ راس مسعود کا ورود مسعود جب سے ہوا ہے، اس میں ترقی و انقلاب کے کچھ آثار نظر آنے لگے ہیں۔ عربی کے ذمہ دار مشنری پروفیسر بحمد للہ کہ رخصت ہوئے، اس کی جگہ پروفیسر یوسف ہارویز (سابق پروفیسر کالج و مصحح طبقات ابن سعد) کا آنا طے تھا، مگر افسوس ہے کہ ان کی وفات کی خبر آئی۔ اگر کرنکاؤ صاحب خدانخواستہ نہ آسکیں، تو ضرورت ہے کہ کوئی مسلم الثبوت یورپین مستشرق اس کے لیے بلایا جائے۔ یورپین مستشرق اس لیے کہ صیغہ عربی کی

سرکاری امداد میں یہ شرط ہے، ورنہ دور کے ڈھول کے سوا اس اسراف میں کوئی فائدہ نہیں۔

اسی سلسلہ میں یہ قابل ذکر بات ہے کہ یونیورسٹی کے ہر دارالفنون کی طرف سے ایک ایک رسالہ نکلنے لگا ہے۔ اسکول کے طلبہ کا الگ، انٹرمیڈیٹ کالج کا الگ، مسلم یونیورسٹی کا الگ، مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ تمام مسلمانوں کے ایک دارالعلوم کی طرف سے ہر رسالہ جو نکلتا ہے۔ ادبیات لطیفہ، داستان و حکایات اور شعر و سخن کے سوا اس میں دماغ کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ نہ کوئی سائنٹفک ریسرچ ہے، نہ تاریخی تحقیق ہے، نہ فلسفیانہ دماغ سوزی ہے، نہ کوئی اور متین و سنجیدہ بحث و فکر ہے۔ بارے اب یونیورسٹی نے اس جانب اپنی عمر میں پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اس کے شعبۂ حیوانیات کی انجمن حیوانیات کی طرف سے ایک رسالہ "حیوانیات" شائع ہونا شروع ہوا ہے، جس میں تمام مضامین علم حیوانات اور اس کی مختلف شاخوں پر ہیں۔ اردو کی خوش قسمتی پر جس قدر ناز کیا جائے وہ کم ہے کہ آج اس میں یہ ترقی ہوئی ہے کہ اس میں سائنس کے ایک خاص شعبہ پر ایک خاص رسالہ شائع ہونے لگا ہے اور اس لحاظ سے ڈاکٹر مرزا اور جناب عنایت علی خان صاحب کی جس قدر ہمت افزائی کی جائے وہ کم ہے۔

لیکن دوسری طرف اپنی محرومی کا گلہ ہے۔ اپنی خوش بختی کا اتنا یقین نہیں کہ سائنس کے صرف ایک شعبہ حیوانیات کے قدردان اتنے انسان مل جائیں گے جو اس رسالہ کو یونیورسٹی کے شعبۂ مذکور پر بار دوش نہ بننے دیں۔ اسی لیے اگر یونیورسٹی کی سائنس کے کل شعبے مل کر ایک سائنٹفک اردو رسالہ ایسا نکالتے، جس میں مختلف علوم کے مختلف ابواب ہوتے، جن میں ایک علم الحیوانات بھی ہے تو امید ہوسکتی تھی کہ یہ رسالہ کامیاب ہوجائے۔ (معارف، مارچ ۱۹۳۱ء)

انجمن حمایت اسلام اور اشاعت قرآن

ہندوستان میں ہر سال شاید لاکھوں کی تعداد میں ہر مطبع میں قرآن پاک کے نسخے چھپتے ہیں، مگر تجارتی کشمکش اور نفع اندوزی کے جذبہ کا برا ہو کہ جس قدر زیادہ قرآن چھپتے جاتے ہیں، اتنے ہی زیادہ غلط اور زیادہ بے پروائی سے چھپتے ہیں۔ مدت سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ قرآن پاک کا کوئی عمدہ، مستند، صحیح اور خوبصورت ایڈیشن چھپے۔ مصر کی حکومت نے پانچ چھ برس ہوئے اپنے سرکاری اہتمام سے اس قسم کے نسخے چھپوائے ہیں۔ سرکار نظام نے بھی چند پاروں کا اہتمام کیا۔

ہندوستان میں انجمن حمایت اسلام لاہور تمام مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہے کہ اس غریب انجمن نے بادشاہوں کے کرنے کے جو کام تھے۔ ان کا بوجھ خود اٹھالیا اور ساٹھ ستر ہزار روپے خرچ کر کے اکثر اہل علم کے مشورہ اور رائے سے قرآن پاک کا ایک سستا لیکن صحیح، عمدہ، خوبصورت اور مستند ایڈیشن چھاپنے کا اہتمام کیا اور عمدہ خط کا عکس لے کر اس دیدہ ریزی اور صحت کے ساتھ اس کام کو انجام تک پہنچایا کہ اس نے اعلان کیا ہے کہ اس میں ایک زیر زبر کی غلطی نکالنے والے کو بھی فی غلطی ایک اشرفی انعام ملے گا۔ حسن خط، حسن صحت اور حسن صورت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی معنوی خوبیاں بھی اس میں جمع کی گئی ہیں۔ ہر حرف اپنی جگہ پر اور ہر اعراب اپنے محل پر ہے۔ آیتوں پر نمبر لگائے گئے ہیں۔ عمدہ کاغذ اور عمدہ جلد کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ حوالے کی سہولت کے لیے متعدد فہرستیں دی گئی ہیں۔ قیمت قسم خاص اعلیٰ درجہ کے کاغذ، سنہرے کناروں اور چرمی مخملی جلد کے ساتھ ۲۵/روپے، قسم اول سفید اعلیٰ ولایتی کاغذ، کپڑے کی نفیس جلد ۵/روپے، قسم دوم چکنا دیسی کاغذ، کپڑے کی جلد ۳/روپے، قرآن ابھی زیر طبع ہے۔ پیشگی بھیج کر خریدنے والے انجمن مذکور کے اس کام میں امداد کا ثواب بھی حاصل کر سکیں گے۔ (معارف، جون ۱۹۳۱ء)

صلاح الدین خدا بخش اور تاریخ اسلام کی غلط تعبیر

کلکتہ کے اسلامی اخبار جمہور نے ہم کو مطلع کیا ہے کہ مسٹر صلاح الدین خدا بخش کا ایک انگریزی مضمون کلکتہ کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں چھپا ہے۔ جس میں واقعۂ کربلا کی تفصیل ایسے الفاظ میں کی گئی ہے، جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سخت قابل اعتراض ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے موصوف کے بہت کم مضامین طبع زاد ہوتے ہیں۔ وہ اکثر کسی نہ کسی یورپین فاضل کے مضمون، رسالہ اور تالیف کا ترجمہ اپنے نام سے چھاپا کرتے ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی قسم کا ہوگا۔ مناسب تھا کہ صاحب مضمون اپنے نام کے بجائے ان خیالات کے اصل مصنف کا پتہ دیتے تا کہ ان کی حیثیت ''نقل کفر'' کی ہوتی۔

یورپین فاضلوں نے ایک قسم کا اپنا یہ دستور بنالیا ہے کہ جس بات کو عام مسلمان مانتے ہوں، وہ اس کے خلاف ثابت کر کے اپنی فضیلت کا ثبوت پیش کریں۔ عام مسلمان بنوامیہ کے ''ضرر'' کو ان کے ''نفع'' سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ پرنس کیتانی جس نے تاریخ اسلام کی نئی ترتیب دی ہے، اس

نے سارا زور اس پر صرف کیا ہے کہ بنو امیہ کے محاسن وفضائل کا انبار لگا کر ان کی خطاؤں کو بھی صواب ثابت کیا جائے۔ عجب نہیں کہ مسٹر خدا بخش موصوف کا یہ مضمون بھی اسی قسم کے ماخذ کی خوشہ چینی ہو۔

ابھی پنجاب کے اخبارات میں ایک نئے فتنہ کی اطلاع شائع ہوئی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ اسلام میں مسٹر خدا بخش کی ترجمہ کی ہوئی جرمن فاضل ڈاکٹر وائل کی کتاب ''تاریخ اقوام اسلامیہ'' (ہسٹری آف اسلامک پیپلز) اور انگریزی مستشرق ڈاکٹر نکلسن کی ''تاریخ ادبیات عرب'' (لٹریری ہسٹری آف عربیا) ایم اے اور بی اے کے امتحانات میں داخل کی گئی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اسلام، عقائد اسلام، داعی اسلام علیہ السلام اور صحابۂ کرام کی نسبت نہایت گمراہ کن اوہام، نظریات اور فحش الزامات ہیں، جن کو سننا بھی ایک مسلمان گوارا نہیں کر سکتا اور کس قدر افسوس کی یہ بات ہے کہ خود مسلمان ان کتابوں کے ترجمے کرتے ہیں اور خود مسلمان ہی ان کو کورس میں داخل کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کا بہت بڑا کام انجام دیا۔

زنا دانی بر او کرد ہمدم کار من ضائع
عجب تر ایں کہ برمن منت بسیار ہم دارد

لیکن غور کے قابل اصلی سوال یہ ہے کہ پچاس برس کی جدید تعلیم میں کیا ہماری قوم میں کوئی ایک بھی ایسا مورخ، تاریخ اسلام کا مصنف یا فاضل پیدا نہ ہوا جو اپنی تاریخ اسلام کا آپ مصنف ہوتا؟ سید امیر علی مرحوم کی استثنائی مثال کو چھوڑ کر کوئی ایک نظیر بھی پیش کی جا سکتی ہے، جس کا قلم تاریخ اسلام کے لیے مدافعانہ کارفرما ہو اور اس کی انگریزی ادبیت اس لائق ہو کہ اس کے قلم کی لکھی ہوئی تحریر یونیورسٹی کے نصاب کے معیار کے مطابق ہو۔ یہ کام جدید لائق تعلیم یافتہ اصحاب کا تھا کہ وہ اس فرض کو انجام دیتے اور مسلمان طالب علموں کے دل ودماغ کی نشوونما اور تربیت کے لیے سر و سامان بہم پہنچاتے۔ اب اگر ایسا نہیں کیا گیا اور نہیں کیا جا سکتا، تو اسلامی تاریخ کا شعبہ قائم کر کے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے نوجوان مسلمانوں کی اسلامی روح کو قتل کیوں کرتے ہو۔

مسلمانوں کی اسی علمی بے بضاعتی کا نتیجہ ہے کہ عربی کا کورس مقرر کیا جائے تو اس میں بیروت کے کیتھولک پادریوں کی کتابیں پڑھائی جائیں۔ اسلامی تمدن کا درس دینا ہو تو مصر کے عیسائی مصنف جرجی زیدان کی ان کتابوں کو پڑھاؤ، جن کو مارگولیوتھ کے قلم نے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔

عربی ادب کی تاریخ پڑھانی ہو تو نکلسن کی ''تاریخ ادبیات عرب'' ان کے درس میں داخل کرو۔ اگر فرق اسلامی کی تاریخ جاننی ہو تو وان کریمر کے ان مضامین کا مطالعہ کرو، جن کو ایک مسلمان نے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے۔ اگر اقوام اسلامی کی تاریخ کی تعلیم مقصود ہو تو ڈاکٹر وائل کی کتاب ان کے ہاتھ میں دو اور انتہا یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں ادب عربی سکھانی ہو تو عربی انجیل پڑھوائی جائے۔ ہماری اس تلخ نوائی سے ہمارے دوستوں کی بزم عیش تو مکدر نہیں ہو رہی ہے۔

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

مگر اس سے زیادہ ماتم انگیز کیفیت یہ ہے کہ مسلمان اخبارات اور مسلمان رہنماؤں کو یہ جوش اسی وقت آتا ہے جب یہ خیالات کسی نامسلم کے قلم سے ادا ہوتے ہیں۔ اگر وائل اور نکلسن اور مارگولیوتھ یہ کریں تو قتل کر دیے جائیں۔ اگر تیج یہ زبان درازی کرے تو اس کی زبان کھینچ لی جائے۔ اسٹیٹسمین کوئی ناشایستہ مضمون لکھے تو اس کے دفتر پر حملہ کر دیا جائے۔ اگر راج پال گستاخی کرے تو گردن زدنی ٹھہرے اور ہمارے اخبارات پشاور سے لے کر کلکتہ تک اپنی مشہو اسلامی غیرت وحمیت کے مظاہرہ میں آسمان زمین ایک کر دیں، مگر کیا یہ سارا جوش، غضب اور طوفان غیظ انہیں کے مقابلہ میں ہے، جن کے نام اسلامی قسم کے نہ ہوں۔ اگر کوئی مسلمانوں جیسا نام رکھ کر عقائد اسلامی کا مضحکہ کرے، حور و بہشت کا مذاق اڑائے، بعض صحابہ کرام پر عامیانہ طرز میں جھوٹے شرمناک الزام تراشے، تمام ائمۂ اعلام اور علمائے اسلام کو ایک طرف سے بلا استثنا عامیانہ دشنام طرازی کا نشانہ بنائے، عقائد اسلامی کے بعض کمزور ماخذوں کی تلاش میں اپنے مزعومہ علم و دانش کا مظاہرہ کرے تو ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک کسی مسلمان کی غیرت وحمیت کی رگ میں جنبش نہیں ہوتی۔ اگر مغل پورہ کالج کا کوئی پرنسپل اور کسی آریہ یا عیسائی مشنری اسکول کا ماسٹر اسلام، عقائد اسلام اور صحابہ کرام کے خلاف گستاخی کرے تو دفعتاً اس کے خلاف ہم مورچہ لگا دیتے ہیں اور زبان وقلم کا کوئی حملہ نہیں ہوتا جو مسلمان طالب علموں کی دینی حفاظت کی خاطر نہیں کیا جاتا، لیکن اگر یہی سب صورتیں کسی مسلمان نام صاحب قلم کے زیر ترتیب رسالہ سے مسلسل اور باقاعدہ ہر مہینہ پیش آئیں تو کیا یہ مسئلہ اس قدر بھی قابل غور نہ ہو کہ خود مسلمانوں کو اپنے سرمایہ سے اس زہر کے پھیلانے میں کہاں تک مدد

دینی چاہیے۔ امید ہے کہ مسلمان اور اسلامی اخبارات ذرا اس پر غور فرمائیں گے۔

اصلی مرض کیا ہے۔ یہ ہے کہ ہمارے دلوں سے خود ہمارے علماء، مصنّفین اور مورخین کی قدر و منزلت گر گئی ہے۔ آج ہم کو مصنف ''فلسفہ مذہب'' کی طرح قرآن کی کسی آیت اور رسول کی کسی حدیث کی صحت کا یقین اس وقت تک نہیں آتا، جب تک اس کی تائید میں کسی گولڈزیر، کسی انگریزی ڈاکٹر، کسی ڈاکٹر ٹائلر کا قول نظر سے نہ گذرے۔ یہی حال آج اسلام کی تاریخ وتمدن کا بھی ہے کہ وہ جب تک نولڈیک، زاخاؤ ڈوزی، نکلسن، مارگولیوتھ کے قلم سے نہ نکلے مسلم نہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ دشمنوں کے گھر سے زہر کے بجائے نوشدارو ملنے کی توقع کرنا کس قدر بے سود ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۳۱ء)

دارالعلوم ندوۃ العلماء

آج کل میرا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہے کہ طلبہ اور حضرات مدرسین اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ طلبہ کی تعداد گو کم ہے مگر ہندوستان کے ہر گوشہ کے لڑکے موجود ہیں، بلکہ بیرون ہند کے بھی متعدد طلبہ ہیں۔ ایک طرف کاشغر و ختن اور نیپال اور دوسری طرف برما، سوماٹرا، مال دیپ، عمان اور مکہ معظّمہ کے طالب العلم یہاں موجود ہیں۔ مدرسین میں شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کا وجود ایسی نعمت ہے جو دارالعلوم کو کم ملی ہے۔ شیخ موصوف مراکش کے باشندہ ہیں اور مصر و شام و عراق وحجاز میں اکثر قیام پذیر رہے ہیں اور درس دیتے رہے ہیں۔ علوم ادبیہ و دینیہ میں ان کا پایہ بلند ہے اور ممالک اسلامیہ کی سیر وسیاحت نے ان کو بہت کچھ وسیع الخیال بنادیا ہے اور ان سب سے فوق ان کی دینداری اور تقویٰ وصلاح ہے۔ امید ہے کہ ان کی برکات سے یہ درس گاہ پوری طرح مستفید ہوگی۔

طلبہ کی تعداد کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ عملاً عربی تعلیم گویا غریبوں کے لیے مخصوص ہوگئی ہے اور اہل استطاعت نے اس سے کنارہ کشی کرلی ہے۔ جہاں ہم ہر چیز میں اہل یورپ کی نقل کرتے ہیں، کاش مذہب کی خدمت میں بھی ہم ان کی تقلید کرتے۔ اسلامی علوم اور مذہبی تعلیم کا فرض کفایہ امیر و غریب سب پر یکساں واجب ہے، پھر تعجب ہے کہ اس فرض کی طرف مستطیع والدین توجہ نہیں فرماتے۔ اگر یہ عدم التفات اسی طرح بڑھتا رہا تو شاید ہم کو ایک دن خدانخواستہ قرآن پاک وحدیث

وفقہ کے لیے بھی پارسیوں کی طرح یورپ وامریکہ کا محتاج ہونا پڑے گا۔

غیر مستطیع طلبہ بہ کثرت ملتے ہیں اور مل سکتے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ دارالعلوم کے اعلیٰ تخیل کے مطابق وظائف کا اتنا انتظام نہیں ہوسکتا۔ دارالعلوم میں پہلے ۲۰ غیر مستطیع طلبہ کے وظائف تھے اوراب چالیس کردیے گئے ہیں۔ تاہم یہ حال ہے کہ بیسیوں درخواستیں ہر مہینہ رد کرنی پڑتی ہیں۔ اگر ہمارے ذی استطاعت مسلمان ہم کو اپنے بچے نہیں دے سکتے تو ان کا بدل روپیہ تو دیں کہ ہم ان روپیوں سے قوم کے نادار بچوں کو اس فرض کے انجام دینے کے لیے تیار کرسکیں۔ آٹھ آٹھ روپے ماہانہ کے دس مزید وظیفوں کا بھی انتظام ہوجائے تو موجودہ پریشان حال طلبہ کا سامان ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، جناب شاہ مصطفیٰ احمد صاحب رئیس گیا اور مولوی سید نواب علی صاحب ایجوکیشن ممبر اسٹیٹ جوناگڑھ کو جنہوں نے ہماری تحریک پر ایک ایک وظیفہ کا اجرا منظور کیا ہے۔ امید ہے کہ دوسرے دردمند مستطیع مسلمان بھی ادھر توجہ فرمائیں گے اور بقیہ آٹھ وظیفوں کی امداد سے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرماکر عنداللہ ماجور ہوں گے۔ (معارف، نومبر ۱۹۳۱ء)

ادارہ معارف اسلامیہ، لاہور

پنجاب کے اہل علم اصحاب نے ''ادارہ معارف اسلامیہ'' کے نام سے ایک خالص علمی مجلس کی بنیاد ڈالی ہے جس کے مقاصد یہ ہیں (۱) ہندوستان کے تمام محققین علوم اسلامیہ کے درمیان اشتراک عمل، اتحاد ذہنی واجتماعی اور وسائل امداد باہمی کے قیام میں سہولتیں بہم پہنچانا۔ (۲) محققین کی ایسی مشکلات کو جو بسا اوقات ان کے مشاغل علمیہ میں پیش آتی ہیں، حتی الامکان رفع کرنے کی کوشش کرنا۔ (۳) محققین کو نتائج تحقیقات علمیہ کی اشاعت کی غرض سے جمع کرنا۔ (۴) بیرونی ممالک کے مستشرقین کو وقتاً فوقتاً افادۂ علمیہ کی غرض سے دعوت دینا۔ (۵) ارتقائے تمدن اسلامی کے سلسلہ میں اسلام کی مختلف خدمات کو منظر عام پر لانا۔ (۶) عام طور پر اسلامی تحقیقات کے لیے قوم میں تحریص وتشویق کی تحریک جاری رکھنا۔ (۷) آمدنی کافی ہونے پر ایک دارالکتب، ایک دارالاشاعت اور مشرقیات کا ایک دارالنفائس (میوزیم) کھولنا۔

اس ادارہ کی وسعت کار حسب ذیل دائروں پر مشتمل ہوگی۔ ادبیات ولسانیات، اخبار و آثار، جغرافیہ و سیاحت، مذہبیات، فلسفہ، عمرانیات، فنون لطیفہ، علوم حکمیہ، صنعت وحرفت اور

قومیات۔ ان تمام علوم وفنون کے الگ الگ دائرے ہوں گے اوران کے متعلق تحقیق وتلاش کا کام ہوگا۔ اور مجوزہ کتب خانہ میں اس کے متعلق کتابیں اور سامان تحقیق مہیا ہوں گے۔

اس وقت تک اس میں لاہور کے اورینٹل کالج ،ٹریننگ کالج اور اسلامیہ کالج کے مسلمان پروفیسروں نے شرکت کی ہے۔ اور سر اقبال اور سر عبدالقادر نے ان کی رہنمائی اور سربراہی قبول کی ہے۔ رکنیت کے لیے پانچ روپے سالانہ اور اس کے کسی عام علمی جلسہ میں شرکت کی فیس دو روپے ہوگی۔ مجلس نے امرائے اسلام کے دست کرم کو اپنی امداد کے لیے جنبش دی ہے اور سب سے پہلے اس کی اعانت کے لیے وہ ہاتھ اٹھا ہے، جو ہمیشہ اس قسم کے کاموں کے لیے اٹھا کرتا ہے یعنی اعلیٰ حضرت سرکار نظام خلد اللہ ملکہ نے اس کے لیے دو ہزار سالانہ کی اعانت منظور فرمائی ہے۔

مجلس کا ارادہ ہے کہ آیندہ ماہ فروری ۱۹۳۳ء میں لاہور میں اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرے اور تمام اہل علم اور ماہرین علوم اسلامیہ سے درخواست کی ہے کہ وہ اس میں شرکت کریں اور کسی مسئلہ پر اردو میں یا عربی وفارسی یا انگریزی میں کوئی تحقیقی مقالہ پیش کریں۔ خط وکتابت کا پتہ پروفیسر شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۳۲ء)

علی گڑھ میں ایک خطبہ۔ ہندوستان میں ہندوستانی

پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی طلب اور اصرار پر ایڈیٹر معارف نے ۲۰/ مارچ ۱۹۳۳ء کو مسلم یونیورسٹی کی انجمن اردوئے معلیٰ میں ''ہندوستان میں ہندوستانی'' پر ایک خطبہ پڑھا۔ جلسہ کی صدارت نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی نے فرمائی۔ گو لوگ دو روز پیشتر سے حسین رؤف بے کے استقبال وآمد اور جلسوں کی بھر مار سے تھکے تھے۔ تاہم یونین کا ہال پورا بھرا تھا۔ معلومات کے لحاظ سے تو یہ خطبہ چنداں اہم نہ تھا لیکن اپنے اصلاحی مشوروں کے لحاظ سے بہت زیادہ دلچسپی سے سنا گیا۔ جن میں سب سے اہم بحثیں یہ تھیں: قومیت کی تکوین میں زبان کا درجہ اور مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کی زبان طلبہ کی طرف سے ان دونوں تجویزوں کا خیر مقدم جس گرم جوشی سے کیا گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی اپنے تعلیمی انقلاب کا اعلان کرے۔

اس خطبہ میں ایک تجویز یہ بھی تھی ہم کو اپنی اس زبان کی اشاعت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آیندہ اس کو اردو کے بجائے ''ہندوستانی'' کے نام سے پکاریں۔ اردو ایک نئی اصطلاح ہے جس

کی عمر سوڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں اور جس میں کسی قسم کی وطنی وقومی جذبہ کی جھلک نہیں اور نہ تمام ملک کی وسعت کے تعلق کا اس لفظ سے اظہار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستانی جو اس کا صحیح ترین نام ہے، ان تمام جذبات اور خیالات کو حاوی ہے۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زبان کا ''ہندوستانی'' نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے۔ خطیب نے تاریخی حوالوں سے اس کو ثابت کیا کہ یہ قطعی غلط ہے اور کم ازکم دسویں صدی کی تاریخوں میں انگریزوں کے اثر سے بہت پہلے اس زبان کا یہ نام پڑ چکا تھا۔

اس خطبہ کا ایک فقرہ جس پر اس ہال میں سب سے زیادہ پسندیدگی کا اظہار کیا گیا، یہ تھا کہ ''یہ درس گاہ مسلمانوں کی پنجاہ سالہ امیدوں کا قبلہ رہی ہے'' اور اب بھی صدیوں تک رہ سکتی ہے۔ صرف شرط اتنی ہے کہ ''وہ اپنا رخ مغرب سے پھیر کر مشرق کی طرف کرلے اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کے بجائے وہ اپنی نظر سے دیکھے''۔(معارف، اپریل ۱۹۳۳ء)

مسلمانوں کا سیاسی انتشار

مسلمانوں کا سیاسی انتشار اب کچھ چھپا راز نہیں۔ ہم نے پہلے مسلم لیگ بنائی، پھر خلافت قائم کی، پھر جمعیت کھڑی کی، بعدازیں مسلم کانفرنس کو پیدا کیا، پھر جماعت احرار میدان میں آئی اور ان میں سے ہر ایک کو مسلمانوں کی سیاسی نمایندگی کا دعویٰ ہے اور ہر ایک پوری قوم کی زبان ناطق بننے کی مدعی ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا کوئی پروگرام اب تک نہ قابل عمل ہوسکا ہے اور نہ آیندہ ہوگا۔ اس سے پہلے کہ مسلمانوں کو اصلاح کی دعوت دی جائے، ضرورت ہے کہ ان انجمنوں کی شکست وریخت کی جائے۔ ان میں سے بعض کو دفن کردیا جائے۔ بعضوں کے مقاصد بدل دیے جائیں اور صرف ایک سیاسی انجمن قائم رکھی جائے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ احرار اور معتدلین دو گروہوں میں منقسم ہوکر دو سیاسی مجلسیں بنالیں۔ لیکن یہ تو نہ ہو کہ دو جمعیۃ العلمائین، ایک شہر میں، بلکہ ایک ہی محلہ میں قائم ہوکر ''جمعیۃ علمائے ہند'' کہلائیں اور اصلی کو نقلی سے تمیز کرنا مشکل ہوجائے۔ حالانکہ شعراء کے تخلص کی طرح ابھی نئی انجمنوں کے لیے ناموں کی کمی نہیں۔

ملکی حالات کے انقلاب کے سبب سے ضرورت ہے کہ ہم اپنے حالات پر پھر ایک نظر ڈالیں اور گذشتہ تعصّبات کو چھوڑ کر فکر وعمل کی وحدت کی نئی کوشش کریں اور اس ذمہ داری کو محسوس

کریں جو پوری قوم کی گمراہی اور غلط روی سے ہمارے رہبروں کے سر پر عائد ہوگی۔ ذاتی کدوکاوش اور پرانی مخالفتوں اور رایوں کے اختلافات کو اگر اب بھی مسلمانوں نے دفن نہیں کیا تو وہ نہ ملک کے کام آسکیں گے اور نہ حکومت ہی کی خوش نودی کی وہ ''دولت'' پاسکیں گے۔ جس کے لیے ہمارے بہت سے افراد بہت بے تاب ہیں۔ سلطنتیں دوستی کا پیمان صرف اس طاقت اور قوت سے باندھتی ہیں جو ان کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ مختلف الآراء، کمزور دل اور ناتوان جماعت کس برتے پر کسی کو اپنے ساتھ عہد و پیمان باندھنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ (معارف، ستمبر ۱۹۳۳ء)

مسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کی تجویز

مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے گذشتہ اجلاس میں ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی کہ اس یونیورسٹی کے کالجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کی اجازت دی جائے۔ وائس چانسلر صاحب کی تحریک سے یہ تجویز علمی مجلس کے سپرد کردی گئی ہے کہ وہ اس کا مناسب فیصلہ کرے۔ وہ فیصلہ کیا ہوگا اس کی خبر نہیں۔

اس موقع پر یہ گذارش بے جا نہ ہوگی کہ ہم اپنے طور وطریق اور طرز تمدن کو خیر باد کہہ کر، جن قوموں کی ریس کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے انہیں سے پوچھنا چاہیے کہ آیا وہ اس کو اپنے تمدن کے حق میں زندگی سمجھ رہی ہیں یا موت، بہرحال جو کچھ ہونا ہے وہ ہوکر رہے گا، تاہم ہماری چیخ پکار اگر سنگ دل کو رحم دل نہیں بنا سکتی ہے، تب بھی جب تک جسم میں زندگی ہے، چوٹ لگنے پر دل سے آہ! تو ایک دفعہ نکل ہی جائے گی۔

خوشی کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی نے اردو امتحانات اور ڈگریوں کے مسئلہ میں ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ ایک دن یہ حقیقت بھی تسلیم کرلی جائے گی کہ اردو زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح یہ حق رکھتی ہے کہ اس کو بھی اعلیٰ معیاری امتحانوں میں جگہ دی جائے۔ (معارف، نومبر ۱۹۳۳ء)

اردو زبان کی ابتدا اور اس کا ارتقا

ہندوستان کبھی ایک ملک نہ تھا۔ اسلامی فتوحات نے اس کو زبردستی ایک ملک بنا دیا۔ ایک ملک کے لیے ایک واحد زبان کی ضرورت ہوئی۔ شروع شروع میں ہر صوبہ کی دیسی زبان میں مسلمانوں نے اپنے عربی و فارسی الفاظ ملا کر ہر صوبہ کی زبان کو ''ہندی'' کا لقب دیا۔ آخر شاہ جہاں

کے زمانہ سے خاص پایۂ تخت دہلی کی ہندی نے سارے ملک میں ٹکسالی زبان کی حیثیت سے رواج پایا۔ ابتداءً وہ ''زبان اردوئے معلیٰ''، یعنی پایۂ تخت یا شاہی قلعہ کی زبان کہلائی اور آخر میں انگریزوں کے عہد کے آغاز میں ''اردو زبان'' اس کا نام قرار پایا۔ یہ اس زبان کی سب سے مختصر تاریخ ہے۔

اس زبان کو یہاں ملک کی ضرورت نے پیدا کیا۔ ضرورت نے اس کی اشاعت کی اور ضرورت نے اس کو ترقی دی۔ اس مختلف بولیوں والے ملک میں اس زبان کی جیسی سخت ضرورت تھی۔ اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک صدی کے اندر اندر یہ پورے ملک میں پھیل گئی اور لکھنے پڑھنے میں خواہ اس کو کہیں جگہ ملی ہو یا نہ ملی ہو۔ مگر بول چال میں اس کو ہر جگہ، جگہ ملی۔ اور ہر صوبہ میں اس کو فروغ حاصل ہوا۔ آج ہندوستان کا کون سا صوبہ ہے، جہاں اس زبان کے مکتب، مدرسے اور اخبار اور رسالے نہیں۔

بلکہ یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ زبان ایک طرف کابل و بخارا تک اور دوسری طرف عراق و حجاز تک اور تیسری طرف افریقہ کے سواحل تک اپنا قدم جما چکی ہے۔ ہر سال ہندوستان سے جو حاجی حجاز یا جوزائر عراق جاتے ہیں، وہ اپنے ملک کی زبان جاننے والے ہر جگہ پاتے ہیں۔ بمبئی اور کراچی سے ہر ہفتہ جو جہاز یورپ کی سمت روانہ ہوتے ہیں۔ وہ مشرق کی انتہائی حد پورٹ سعید اور اسکندریہ تک اس زبان کو لے جاتے ہیں اور اس طرح ان سواحل میں یہ زبان اپنی ضرورت سے آپ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ افغانستان میں یہ دیکھ کر کس قدر تعجب ہوا کہ بادشاہ سے لے کر وزرا اور عام اہل منصب تک اس زبان کو نہایت خوبی سے بولتے اور سمجھتے ہیں اور اسی کو ہندوستان کی واحد زبان جانتے ہیں۔

اب اگر ہندوستان کی کوئی قوم، یہ کوشش کرتی ہے کہ صدیوں کی اس محنت کو مٹا ڈالے اور متھرا یا بنارس کی کسی بولی کو ''ہندی'' کا نام اور ہندوستان کی واحد مشترک زبان قرار دے کر نئے سرے سے اس کو دنیا میں روشناس کرے تو ہر حیثیت سے یہ ایک شدید غلطی ہوگی۔

ہندو بھائی اگر یہ چاہتے ہوں کہ اس زبان کے لکھنے کے لیے اپنا کوئی علاحدہ خط جیسے ناگری مقرر کریں تو اس کا ان کو اختیار ہے لیکن اس خط کے پردہ میں زبان کو بدلنے کی کوشش، ملکی افتراقات کی تمام سیاسی چالوں کے مقابلہ میں یہ ادبی افتراق کی چال ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی ہوگی۔ ملک کی دو بڑی قومیں جو اس وقت تک کم از کم شمالی ہندوستان اور دکن میں ایک ہی زبان بولتی

چالتی اور سمجھتی ہیں، ان کو دو زبانوں میں بانٹ کر دونوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا کر دینا ہے۔

حقوق طلب مسلمان ہندوستان میں اپنے ایک تہائی حقوق کا مطالبہ ہر چیز میں کرتے ہیں۔ اسی سیاسی اصول کی بنا پر اگر اس ادبی نزاع کا بھی فیصلہ کر دیا جائے، تو یہ ''مذاق'' حسن مذاق سے کم نہ ہوگا۔ عام اردو زبان میں عربی اور فارسی لفظوں کا میل ایک تہائی سے زیادہ نہ ہوگا۔ اگر اس تہائی حق کو ہندو بھائی مان لیں تو ہندی کی نئی بھاشا کو پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو اور دونوں قومیں مل کر ''ہندوستانی'' کے پھیلانے اور بڑھانے میں ہر طرح کی کوشش ایک ساتھ کریں۔ یہ تجویز اس وقت ایک مزاح کی صورت ہے مگر مزاح کو سنجیدگی سے بدل دینا کتنی دیر کا کام ہے۔

ہندوستان میں ہندوستانی یعنی اردو زبان بولنے والے اور سمجھنے والے کتنے ہیں اور ان کی تعدادی نسبت ہندوستان کی دوسری بولیوں کے بولنے والوں کے ساتھ کیا ہے؟ اس کا جواب سرکاری مردم شماری کے کاغذات سے مل سکتا ہے لیکن اس سے اکثر اس زبان کے بولنے والوں کو تشفی نہیں ہوتی۔ زبانی پیمائش کی تحقیقات بھی اس بارہ میں سند کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لیے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے یہ قرارداد منظور کی ہے کہ ہندوستان میں اس زبان کے بولنے والوں کی تحقیقی اور حقیقی تعداد کا پتہ چلایا جائے اور اس کے لیے اس نے یہ تجویز کی ہے کہ ہر صوبہ میں اس زبان کی پیمائش کا کام کیا جائے اور جس میں حسب ذیل معلومات فراہم کیے جائیں۔ اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد، سالانہ تصانیف، اخبارات اور مطابع کی تعداد اور ہر صوبہ میں اس زبان کی تاریخی اور ادبی حیثیت وغیرہ۔

یہ کام گو حقیقت میں بہت کٹھن ہے اور سلطنتوں کے انجام دینے کے لائق ہے لیکن اگر قومیں کسی بات کے کرنے کا عزم مصمم کر لیں تو پھر ان کی عملی طاقت کس بات میں سلطنتوں کی قوت عمل سے کم ہے۔ انجمن نے اس کام کے لیے تقریباً ساٹھ ہزار کے خرچ کا اندازہ کیا ہے اور اس کے لیے اپیل کی ہے۔ (معارف، جون ۱۹۳۴ء)

اردو زبان کا صوبہ وار جائزہ

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے اردو زبان کے صوبہ وار جائزہ کی جو تجویز ملک کے

سامنے پیش کی ہے۔اس کے مطابق اس نے (مالی دقتوں کا لحاظ کیے بغیر) عملی کام شروع کر دیا ہے۔ انجمن کے سکریٹری جناب مولوی عبدالحق صاحب نے پنجاب اور صوبۂ متحدہ کا سفر کر کے اس کام کی تکمیل کے لیے کمیٹیاں قائم کر دی ہیں۔ ہمارے صوبہ میں یہ کام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ لاہور میں بھی کمیٹی اپنا کام کر رہی ہے۔ برہما اور بعض دوسرے مقامات میں بھی کام شروع ہو گیا ہے۔ بہار میں بھی اس کے لیے نوجوان تیار ہو رہے ہیں اور اب سکریٹری صاحب نے ہم کو اطلاع دی ہے کہ وہ اس کے لیے مدراس جا رہے ہیں۔اس تجویز کے مطابق کام کیا کرنا ہے،اس کے لیے احباب انجمن مذکور سے مطبوعہ کاغذات منگوا سکتے ہیں۔(معارف،اگست ۱۹۳۴ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں کی
سیاسی جدوجہد کی یادگار

مسلمانوں کی گذشتہ سیاسی جد و جہد کی صحیح یادگار گو بالواسطہ سہی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہے۔ یہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے جدید تعلیمی و ذہنی انقلاب کا مظہر ہے، جو خود جدید تعلیم یافتہ اشخاص کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ہم اس کے ذریعہ اس ذہنیت کو بدلنا چاہتے ہیں جو انگریزی حکومت کے ساتھ مسلمانوں کے اندر بلکہ ہندوستانیوں کے اندر پیدا ہو گئی ہے کہ تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت ہے۔حالانکہ تعلیم کا اگر کوئی دنیاوی نصب العین ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک بہتر کاروباری آدمی پیدا ہو، ہم نے ''مسلمانوں کی آئندہ تعلیم'' میں جواب جامعہ کی طرف سے مستقل رسالہ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔اس کی پوری پوری حقیقت ظاہر کر دی ہے۔

جامعہ کی ابتدا کس بے سروسامانی اور کس مپرسی کے ساتھ ہوئی۔ بارہا وہ وقت آیا جب اس کی زندگی کی کشتی بھنور میں پھنس پھنس کر نکلی ہے اور آخر اس کے کارکنوں کی ان تھک کوششوں کی بدولت وہ دن آیا کہ یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو اس کی عمارت کا سنگ بنیاد ایک معصوم بچہ کے ہاتھوں سے رکھا گیا۔ اہل جامعہ نے اس عمارت کی تعمیر و تکمیل کے لیے ڈھائی لاکھ کی اپیل کی ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کے جلسۂ سنگ بنیاد تک ۳۲ ہزار چندہ ہو گیا۔

ہم نے اس خیال کو بارہا ظاہر کیا ہے

بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم

مسلمانوں کے سامنے بغیر کافی تیاری کے کوئی عام تحریک پیش نہ کی جائے۔ اور اگر پیش کی جائے تو اہل تحریک کا فرض ہے کہ اس کو جس طرح بنے مسلمانوں سے پورا کرائیں، تاکہ ان کی اخلاقی قوت روز بروز بڑھے اور کسی کام کو نادھ کر اس کے پورا کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہو۔ یہ ڈھائی لاکھ کی رقم کچھ زیادہ نہیں۔ اہل ثروت کو بھی تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف غریبوں کے پیسوں سے پوری ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے صرف عزم اسلامی چاہیے۔ ویرزقه من حیث لا یحتسب۔

(معارف، مارچ ۱۹۳۵ء)

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس آگرہ

ہماری قدیم تعلیمی مجلس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پچھلے مہینہ آگرہ میں ہوا اور مختلف تعلیمی ضروریات پر گفتگوئیں ہوئیں اور تجویزیں پاس ہوئیں۔ ہمارے پرانے ماہر تعلیم ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب اس جلسہ کے صدر تھے۔ موصوف خود بھی ملک کے موجودہ نظام تعلیم کے سخت مخالف ہیں۔ اس لیے پہلے سے یہ توقع تھی کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کو اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر بیان کریں گے۔ چنانچہ گو ان کا خطبۂ صدارت مختصر ہے، مگر پر معنی ہے۔

انہوں نے سچ کہا کہ سرسید کے مقاصد والی ایجوکیشنل کانفرنس کا زمانہ ختم ہوگیا اور اب نئے حالات اور نئے دور خیالات میں ہماری کانفرنس کو اپنے طریق عمل اور نصب العین دونوں میں تبدیل و تغیر کی ضرورت ہے۔ اسی لیے انہوں نے آیندہ اس کانفرنس کے لیے حسب ذیل تین شعبے تجویز کیے۔ مسلمانوں کی بیکاری دور کرنے کا شعبہ، دوسرا دیہاتی ترقی کی تجویز کو عمل میں لانے والا شعبہ اور تیسرا کونسل اور اسمبلی کے ممبروں سے تعلقات پیدا کر کے کانفرنس کی تجاویز کو منظور کرانے والا۔ کیونکہ اب تجاویز کو منظور کر کے سرکاری دفتروں میں بھجوا دینا بے معنی ہے۔

ہمارے خیال میں اس وقت سب سے اہم چیز دیہاتی تعلیم و ترقی میں مسلمانوں کے حصہ کا مسئلہ ہے۔ ہندوؤں نے گاندھی جی کے حسب منشا اس کے لیے عمل شروع کر دیا ہے اور چندے جمع ہورہے ہیں۔ دوسری طرف حکومت بھی اس بازی کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتی اور ایک کرور روپیہ اس کام کے لیے منظور کر چکی ہے لیکن مسلمانوں کی محفلوں میں عملاً اب تک اس کی بھنک بھی نہیں پہنچی ہے۔ اگر ایجوکیشنل کانفرنس اس کام کو مستعدی سے اپنے ہاتھ میں لے تو بڑا کام کرے گی۔

(معارف، اپریل ۱۹۳۵ء)

ہندی اور ہندوستانی (اردو)

مولوی حاجی سر رحیم بخش مرحوم نے اس مہینہ ۴ر مئی ۱۹۳۵ء کو اسّی برس کے قریب عمر پا کر اپنے وطن ٹھسکہ میرانجی ضلع کرنال میں وفات پائی۔ انہوں نے اسکول کے ایک معمولی مدرس عربی و فارسی کی حیثیت سے ملازمت شروع کی اور ترقی کر کے چیفس کالج لاہور کے بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہیں موجودہ ہز ہائنس نواب صاحب بہاولپور کے والد مرحوم زیر تعلیم تھے۔ اور ان کی نگرانی میں تھے۔ ممدوح الشاں جب مسند نشیں ہوئے تو اپنے لائق اتالیق کی دیانت ومحنت و جفاکشی کو دیکھ کر اپنی سرکار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر رکھ لیا۔ یہاں بھی انہوں نے خوبی سے کام انجام دیا، جس کی وجہ سے سرکار برطانیہ اور سرکار بہاولپور دونوں کو ان پر برابر کا اعتبار ہو گیا۔ اس لیے نواب ممدوح کی وفات اور نواب حال کی نابالغی میں وہ مجلس نیابت کے صدر مقرر ہوئے اور بڑی عزت و ہر دل عزیزی حاصل کی۔ اس کے بعد ریاست سے پنشن پائی اور قومی و ملکی کاموں میں مصروف رہنے لگے۔

غربت سے امارت اور معمولی درجہ سے اعلیٰ رتبہ تک ترقی کی مثالیں دنیا میں کم نہیں۔ لیکن ایسی مثالیں کہ ادنیٰ سے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچنے کے بعد بھی اس کو اپنی پہلی حالت فراموش نہ ہو اور اس نعمت کے شکرانہ میں دینی و قومی خدمات میں انہماک زندگی کا فرض قرار پا جائے، بہت کم ہیں۔ مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی۔ ندوۃ العلماء کو بہاولپور میں جو کامیابی ہوئی، وہ تمام تر مرحوم ہی کے اخلاص کا نتیجہ تھی۔ ندوۃ العلماء کے ارکان نے ان کے ان خدمات کی قدر پہچان کر ان کو سرپرست و حامی ندوۃ العلماء کا منصب دیا تھا۔ اخیر زمانہ میں انہوں نے تبلیغی کاموں میں دلچسپی لی اور اپنی دولت کا اچھا خاصا حصہ نیک کاموں میں خرچ کیا۔ ان کی زندگی سادہ تھی اور ہمیشہ سادہ رہی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے۔ اس لیے وہ علمائے دیوبند کا بھی ادب کرتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی تھے اس لیے وہاں بھی ان کو خدمت کا موقع ملا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کو قبول فرما کر ان کو اپنی مغفرت کی عزت سے نوازے۔

اس وقت ملک کی دو زبانیں ہندی اور ہندوستانی (اردو) ملک کی عمومی زبان بننے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے اس میں شک

نہیں کہ وہ اپنے حامیوں کی ان تھک کوششوں کی ممنون ہے۔ایک زبان جوصرف چند مذہبی کتابوں میں تھی، انگریز دوراندیشوں کی قوت فکر سے وہ کلکتہ کے فورٹ ولیم میں سب سے پہلی دفعہ ہندوستانی کے بالمقابل رکھ کر ملک کی دوسری زبان کی حیثیت سے رواج پائی اور کچھ دنوں کے بعد وہ دونوں مسلمان اور ہندو کی الگ الگ زبان کی حیثیت سے باہم حریف پہلوانوں کی صورت میں نظر آنے لگیں۔پھر صوبہ ہائے متحدہ کے انگریز حاکموں اور ہندو کارکنوں کی کوششوں نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ وہی زبان جس کے جاننے والے اور پڑھنے والے اس صوبہ سے باہر نہ تھے۔وہ اب پورے ملک کی زبان بننے کا دعویٰ کررہی ہے۔اس کی اشاعت کی مرکزی انجمنیں ہیں،صوبہ صوبہ میں اس کی شاخیں ہیں، اہل دولت اس کی مدد کررہے ہیں اور اہل قلم اس کو پھیلا رہے ہیں۔اب ایک طرف وہ کشمیر، دوسری طرف راجپوتانہ، تیسری طرف بڑودہ گجرات اور چوتھی طرف مدراس میں اپنے قدم جمارہی ہے اور ہندو ریاستیں،اس کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لے رہی ہیں۔

اس کے بالمقابل ہندوستانی (اردو) کے لیے اس کے حامی کچھ نہیں کررہے ہیں۔نہ اس کے لیے تبلیغی انجمنیں ہیں، نہ اس کی اشاعت کے لیے صوبہ صوبہ میں شاخیں ہیں، نہ اس مقصد پر کسی صوبہ میں ایک پیسہ کوئی خرچ کررہا ہے اور نہ حیدرآباد دکن کے سوا کوئی اسلامی ریاست اس کے لیے کچھ کررہی ہے، نہ ان صوبوں میں جہاں وہ مادری زبان نہیں، اس کے سکھانے اور پڑھانے کے لیے اعزازی یا تنخواہ یاب معلم، ہندی کی طرح دورے کررہے ہیں، تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ لوگوں کی ضرورت کے مطابق ہونے کے سبب سے ہندوستان کے ہر صوبہ میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی پھیلتی جارہی ہے اور یہی چیز ہے جو اس کی زندگی کی ضامن اور اس کی یقینی کامیابی کی کفیل ہے۔

سرکار دکن اس زبان کے لیے جو کچھ کررہی ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ اس لیے یہ کررہی ہے کہ وہ ایسی مملکت پر حکمران ہے جہاں پہلے بھی بہ کثرت چھوٹی چھوٹی مقامی بولیاں رائج تھیں اور اب بھی ہیں۔ان مختلف بولیوں والی سرزمین کو ایک واحد مملکت کی صورت میں بدلنا جس کی ہر سلطنت کو اپنے قیام اور بقا کے لیے ضرورت ہے، نہ تو وہاں کے مذاہب اور مذہبی فرقوں کو زبردستی ایک کردینے سے ہوسکتا ہے، نہ تمدن و معاشرت کی یکسانی اس کو ایک کرسکتی ہے، نہ تمام قومیتوں کو ایک قوم کی صورت میں بدل دیا جاسکتا ہے۔اس لیے سب سے آسان، سب

سے کم خرچ اور سب سے بے ضرر جو صورت ہے وہ یہی ہے کہ کم از کم پوری مملکت کی ایک تعلیمی و سرکاری زبان ہو، جس میں اس ملک کا علمی سرمایہ بھی محفوظ رہے۔

ہندوستانی زبان وہاں کوئی بیرونی زبان نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی زبان ہے جو وہاں کی مختلف بولیوں کے سبب سے وہیں بہ تقاضائے بشری بڑھی، پھیلی اور علمی و ادبی قالب میں ڈھلی اور دکھنی کہلائی۔ اس لیے یہ ایک ایسی زبان ہے جس کو اس ملک دکن سے خاص تعلق ہے، بلکہ بزرگوں کے بقول یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ وہیں کی پیداوار ہے اور وہیں سے دوسرے صوبوں اور ملکوں میں اس کی ادبی اور علمی حیثیت قابل قبول ہوئی۔ اور اسی لیے سرکار دکن پر اس کی قدر دانی فرض اور اس کی ترقی کی کوشش واجب ہے اور اسی لیے وہ اپنے اسی قدیم فرض کو ہمیشہ کی طرح آج بھی انجام دے رہی ہے۔

ہندی نہ تو اندور کی زبان ہے، نہ کشمیر کی، نہ بڑودہ کی، نہ گوالیار کی، نہ مدراس کی۔ یہ ایک خاص صوبہ کی شاعری کی قدیم زبان تھی جس کو پورے ملک کی عام زبان بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے اور اب دیہاتی اور تحصیلی مکتبوں اور اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک میں اس کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں اور اس طرح ملک میں دو مختلف زبانیں پیدا کر کے آیندہ کے لیے ہندوستان میں دو ایسی مختلف قومیں بنائی جا رہی ہیں، جن میں باہم ملنے جلنے، سمجھنے بوجھنے اور بولنے چالنے کا بھی وہ موقع نہ ہوگا۔ جو آج اس وقت بھی باقی ہے اور اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ فورٹ ولیم کلکتہ میں جو بیج لگایا گیا تھا۔ اب وہ پورا تناور درخت بن جانے والا ہے۔ (معارف، جون ۱۹۳۵ء)

ہندی اور ہندوستانی (اردو)

اخباروں سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ہندوؤں نے جن میں ان کے اہل قلم اور اہل سیاست دونوں شامل ہیں۔ ایک نئی مجلس کی بنیاد اس غرض سے ڈالی ہے کہ ہندی اس ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے۔ چنانچہ پچھلے مہینہ اس کا جلسہ بہت دھوم دھام سے ناگپور میں ہوا اور یہ طے پایا کہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ''ہندی یعنی ہندوستانی'' ہے۔

آج تک اس زبان کے جس کو اب غلطی سے اردو کہا جاتا ہے۔ دو نام تھے۔ ایک ہندی اور دوسرا ہندوستانی۔ پہلا نام مدت ہوئی کہ ناگری خط میں لکھی جانے والی بھاشا کا مشہور کیا گیا اور اس کو یہ شہرت دی گئی کہ امتیاز کے لیے دوسری زبان کا نام اردو رکھنا پڑا اور کبھی کبھی اس کو ہندوستانی بھی کہا

جانے لگا اور خیال تھا کہ آہستہ آہستہ یہ نام پھیل کر اردو کے غلط نام کو مٹا دے گا مگر ہندو مدبر یہ جانتے ہیں کہ نام میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ اردو ہندوستانی بن کر ملک کی عام زبان ہونے کی سینکڑوں دلیلوں کی ایک دلیل ہو جاتی۔ اس لیے ناگپور میں ''ہندی یعنی ہندوستانی'' کی عجیب وغریب تشریح سے ایک ہی حملہ میں دونوں پر قبضہ جما لیا گیا۔

ہم نے ہندی کے حامیوں کی اس چال کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا اور آج سے چند سال پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مقالہ کے ضمن میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم اپنی اس زبان کو اردو کے بجائے ہندوستانی کے نام سے یاد کریں، پھر معارف میں اس کی تحریک برابر جاری رکھی اور بعض صوبوں نے اس تحریک پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا تھا، گو بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن غور سے دیکھیے کہ ہندو اہل نظر ہماری اس تحریک پر کتنے چوکنے ہوئے۔ ان کو اس کے سوائے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ اپنی بھاشا کے لیے ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لقب فوراً اختیار کریں۔

مولوی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو نے جو اس کانفرنس میں شریک تھے۔ اس کانفرنس کی روداد پر اخباروں میں بہت اچھا تبصرہ لکھا ہے اور حقیقت بات وہی ہے جو پروفیسر مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) نے خط بنام گاندھی جی میں لکھی ہے کہ ہندوستان کی عام بننے والی زبان کا معیار رواج ہو نہ کہ ہندی لغت، یہی بات ہم نے ناگری پر چارنی سبھا بنارس کے ایک یادگاری مجموعۂ مضامین میں لکھی تھی۔

ہندی کے حامی اس بات کے درپے ہیں کہ چند سو سال پہلے ہندی کے چند شاعروں نے جس زبان میں شاعری کی اسی کو ملک کی علمی، ادبی اور عام زبان قرار دیں۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ آج پشاور سے کلکتہ تک جو زبان عام طور سے بولی چالی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہی ملک کی عام زبان قرار دی جائے مگر ہندی کے حامی ایک بات طے کر چکے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ ہندوستانی (اردو) کے حامی کیا طے کرتے ہیں۔

ایک نکتہ ہندوستان کے مسلمانوں کے غور کے قابل ہے۔ اس ملک کے ہندوؤں نے خواہ وہ اپنے سیاسی مسلکوں میں کسی قدر مختلف ہوں۔ ایک بات قطعی طور سے طے کر لی ہے اور وہ یہ کہ ان کا

قومی نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو تہذیب وتمدن، کلچر اور ادب بلکہ حکومت تک کو دوبارہ قائم کیا جائے اور ''ہندوستان'' کو بجا طور پر ''ہندو استھان'' بنایا جائے۔ اس مقصد پر آریہ سماجی اور سناتن دھرمی مہا سبھائی اور کانگریسی جی حضوری اور آزاد، ملازم سرکار اور غیر ملازم سبھی متفق ہیں اور قوم کا ہر فرقہ اور ہر کارکن اپنے اپنے راستہ سے اسی منزل مقصود کی طرف برابر بڑھتا چلا جارہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا قومی نصب العین کیا ہے؟ اور وہ اس کے لیے کیا کررہے ہیں؟

(معارف، جولائی ۱۹۳۶ء)

علی گڑھ میں اردو اجلاس

ہندوستانی زبان کی ترقی وتحفظ کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ۲۴-۲۵/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں اردو کانفرنس کے دو عام اجلاس اور ایک خاص مشاورتی جلسہ منعقد ہوا۔ بنگال، بہار، مدراس اور پنجاب کے متعدد اور صوبہ ہائے متحدہ کے اکثر اہل قلم و اہل ادب و اہل الرائے موجود تھے۔ پہلے عام اجلاس میں صدر استقبالی ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی طرف سے کہ وہ بیمار تھے، نواب صدر یار جنگ بہادر نے خطبۂ استقبال پڑھا۔ پھر صدر منتخب جناب راجہ صاحب محمود آباد نے جن کو شاید پہلی دفعہ اس قسم کے مجمعوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہوگا۔ اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ ان خطبوں میں کوئی بات نہ تھی لیکن بہرحال ان سے اجلاس کا رسمی افتتاح ہوگیا اور کل کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنادی گئی۔

اس سب کمیٹی نے ۲۵ کی صبح سے لے کر دوپہر تک اپنا کام کیا اور ہندوستانی زبان کو پورے ملک میں پھیلانے، بڑھانے اور ترقی دینے کی تجویزوں پر غور کیا اور ایک ایسا خاکہ تیار کیا کہ جس پر چند سال بھی اگر مستعدی وگرم جوشی کے ساتھ کام کیا گیا تو یقین ہے کہ ہماری زبان کی جغرافی اور معنوی وسعت اب سے دو چند ہوجائے گی، یہ بھی طے پایا کہ انجمن ترقی اردو کا مرکز دلی قرار دیا جائے اور سارے صوبوں اور دیسی ریاستوں میں اس کی شاخیں قائم ہوں اور ان کے ماتحت ذیلی انجمیں قائم کی جائیں اور کوشش کی جائے کہ ہر صوبہ کے سرکاری دفتروں اور درس گاہوں میں ہندوستانی کو وہ حیثیت دی جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ یہ بھی طے پایا کہ دہلی میں ہندوستانی کا ایک مکمل اشاعت خانہ اور ایک کتب خانہ قائم کیا جائے۔ انجمن کے لیے تین کمیٹیاں بنائی گئیں، جن میں

سے ایک اصلاح زبان وخط ورسم الخط کے مسئلوں پر غور کرے گی۔ دوسری ادبی مجلس ہوگی، جس کے ارکان انجمن کے سلسلہ تصنیف وتالیف وترجمہ کے متعلق رائیں دیں گے اور تیسری کمیٹی انجمن کے مطبع اور اشاعت خانہ کے متعلق تجاویز پیش کرے گی۔

دوسرے عام اجلاس میں سب کمیٹی کے مجوزہ لائحہ عمل کو پڑھ کر سنایا گیا اور حاضرین نے بالاتفاق اس کو منظور کیا۔ اس اجلاس کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے فرمائی۔ موصوف نے ہندوستانی زبان اور اس زبان میں تعلیم کے مسئلہ پر ایک مختصر لیکن پرمغز تقریر فرمائی جس کو حاضرین نے توجہ کے ساتھ سنا۔ آخر میں نواب صدر یار جنگ بہادر نے صدر کے اور مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری نے حاضرین اور منتظمین کے شکریہ کا فرض ادا کیا اور جلسہ ختم ہوگیا۔

یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی گویا پہلی کانفرنس تھی۔ نہ اس میں پرجوش تقریریں ہوئیں، نہ ہنگامہ آرا تجویزیں پیش ہوئیں، نہ مجوزین اور مویدین کے ناموں کی نمائش ہوئی، نہ تجویزوں کی مخالفت اور ترمیم کا شور بلند ہوا۔ سکون اور اطمینان خاطر کے ساتھ چند کام کرنے والے جمع ہوئے اور اتفاق واتحاد کے ساتھ سب نے مل کر کچھ تجویزیں پیش کیں اور منظور کیں اور آیندہ مستعدی کے ساتھ کام کرنے کا تہیہ کیا۔

اس کانفرنس کی دوسری خصوصیت اس کی نمایندہ حیثیت تھی۔ شاید یہ پہلا موقع ہو جب سیاسیات کے پرشور تماشوں کے بغیر کچھ سوچنے والے اور کام کرنے والے لوگ ملک کے مختلف حصوں سے اکٹھے ہوئے اور ان کی ایک ایسی اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی جس کو دیکھ کر یہ ماننا پڑا کہ اہل ملک میں اپنی زبان کی ترقی وتحفظ کا خیال پہلے سے بہت زیادہ ہے۔ ہمارے لیے یہ بھی تسکین کا باعث تھا کہ جلسہ میں ہندوستانی زبان کے ہندو اہل قلم واہل ادب بھی شریک تھے۔ (معارف، نومبر ۱۹۳۶ء)

ہندوستانی

’’ہندوستانی‘‘ کا لفظ دھیرے دھیرے ہندوستان کی ادبی فضا کو جیتتا چلا جاتا ہے۔ ۱۹/ جون کو بیزواڑہ (مدراس) میں مسلم یوتھ کانفرنس کی صدارتی تقریر میں مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا ’’اردو یعنی ہندوستانی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا عظیم الشان نتیجہ ہے‘‘ کانفرنس نے تجویز

منظور کی کہ ''ایسے استادوں کی ایک جماعت تیار کی جائے جو جنوبی ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی تعلیم دے سکیں''۔

ہمایوں لاہور کے شریک مدیر اگست کے پرچہ میں لکھتے ہیں:

''اردو کے بجائے ہندوستانی کا نام استعمال کرنے کے حامیوں کی یہ دلیل قابل توجہ ہے کہ جب ہم خود ہندوستانی کہلاتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اپنی زبان کے لیے اس لفظ کے استعمال کو عار سمجھیں۔ مسلمانوں کو حق نہیں ہے کہ وہ اسے ایک ایسے نام (یعنی ہندوستانی) سے محروم کرنے پر اصرار کریں جن سے اس کے ہندوستانیوں کا سرمایہ مشترک ہونے کا پتہ چلتا ہو''۔

ہمارے نزدیک ہمایوں کا اس راہ میں یہ پہلا قدم ہندوستانی کے طرف داروں کے لیے ''فال ہمایوں'' ہے۔ کیونکہ ''ہر چہ از پنجاب می خیزد بر دل می ریزد''

گاندھی جی نے اپنے ایک بیان میں اعلان کیا ہے کہ ''اردو، ہندی اور ہندوستانی تینوں سے ایک ہی زبان مراد ہے اور وہ یہ ہے جو شمالی ہند میں ہندو مسلمان عام طور سے بولتے ہیں''۔ ان کا یہ اعلان جو یقیناً سچائی پر مبنی ہے ان ہندوؤں کی آنکھوں کو کھول دے گا، جو ہندی کے معنی کالی داس کی زبان سمجھتے ہیں، جو کبھی ہندوستان میں بولی نہیں گئی اور نہ کبھی وہ ملک کی زبان تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔

(معارف، اگست ۱۹۳۷ء)

ابتدائی تعلیم کا خاکہ

آج کل کی نئی وزارتیں اپنے اپنے صوبہ میں ابتدائی تعلیم کے خاکے بنا رہی ہیں۔ جو خاکہ بنے گا وہ عمل میں بھی آئے گا اور اس وقت مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی۔ وردھا اسکیم اور سی پی کے وڈیا مندر کی تجویز سب کے سامنے آچکی ہے۔ حکومتوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مجوزہ اسکیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھیں۔ یہ بات تو اب بھی ہے یعنی سرکاری ادارے مذہبی تعلیم سے خالی ہیں۔ مگر چونکہ پہلے تعلیم جبری نہ تھی اور نہ ساتویں برس سے سرکاری تعلیم میں جت جانا سب پر قانون کے رو سے واجب تھا۔ اس لیے گھروں پر ابتدائی مذہبی تعلیم پا کر مسلمان بچے سرکاری مدرسوں میں جا سکتے تھے اور جاتے تھے، مگر اب اس جبری تعلیم اور مقررہ عمر میں ایسا ہونا بہت مشکل ہے۔ اس لیے یہ

معاملہ ہمارے لیے بے حد قابل غور ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ ملک کی دوسری قومیں جو ناخواندگی کے عیب کو سو فیصدی مٹا ڈالنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ آپ کا انتظار کیے بغیر چل کھڑی ہوں گی اور کچھ دنوں کے بعد ہمارے ان کے درمیان فیصدی خواندگی کا جو فرق پیدا ہو جائے گا وہ پھر مٹائے نہ مٹے گا۔ اس لیے اس وقت مسلمان مذہبی تعلیم کا بہانہ جبری تعلیم سے رہائی پانے کے لیے کام میں نہ لائیں۔ بلکہ ایک عزم والی قوم کی طرح اٹھیں اور مذہبی اور ملکی دونوں فرضوں کو ایک ساتھ ادا کریں۔ ان میں سو فیصدی آدمی مذہبی تعلیم اور خواندگی دونوں حاصل کر کے دکھا دیں۔ یہ عزم کے سامنے مشکل نہیں۔

لیکن اگر حکومتیں مذہبی تعلیم کے بار سے سبکدوشی چاہیں تو کیا مسلمانوں سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا؟ اس وقت ضرورت اس کی ہوگی کہ مسلمان کسی ادارہ کے ماتحت ابتدائی مذہبی تعلیم کا جال پورے ملک میں پھیلا دیں۔ اس کے لیے سرمایہ ہو، کتابیں بنائی جائیں، چھاپی جائیں۔ اردو خط اور قرآن پاک کی تعلیم کی مشکلوں کو عملاً حل کیا جائے۔ اس کے لیے ابتدائی اور مذہبی تعلیم کے ماہر مل کر بیٹھیں اور کوئی نظام بنائیں اور اس پر عمل کی راہیں نکالیں۔

ایک بات اس موقع پر صاف کہہ دینی ہے ہندو بننے کے لیے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں لیکن مسلمان بننے کے لیے کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔ ہندویت ایک سلبی حقیقت ہے اور اسلام ایجابی۔ اگر ہندو اپنی نسبت کچھ نہ جانے گا تب بھی ہندو ہی رہے گا لیکن اگر مسلمان اپنی نسبت کچھ نہیں جانے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ اس لیے مذہبی تعلیم کا فقدان ہندو کی ہندوئیت میں خلل انداز نہیں، لیکن مسلمان کے مسلمان ہونے میں خلل انداز ہوگا۔ حتیٰ کہ چند نسلوں کے بعد (خاکم بدہن) مسلمان نام کا مسلمان بھی باقی نہیں رہے گا اس لیے

گر کردن است چارۂ مجنوں کنوں کنید

(معارف، اپریل ۱۹۳۸ء)

ہندوستانی

ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی ملی جلی زبان کا نام ہندوستانی رکھا گیا اور جس کو کانگریس

نے بار بار دیس کی عام زبان کے نام سے پکارا اور جس کی تعریف یہ کی گئی کہ جو شمالی ہندوستان میں عام طور سے بولی جاتی ہے اور جو عربی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے پاک ہے۔ راجندر عبدالحق معاہدہ میں یہی لفظ ہیں۔ گاندھی جی نے یہی کہا، جواہر لال جی نے یہی بتایا، مولانا ابوالکلام نے یہی فرمایا اور ہم کو اطمینان ہوگیا کہ کانگریس کے ''ہائی کمانڈ'' کے حکم کے آگے اب کسی کانگریسی گورنمنٹ کے ممبر کو سرتابی کی جرأت نہ ہوگی۔ ڈاکٹر کھرے کی نظیر بھی سامنے تھی۔

مگر معلوم ہوا کہ وردھا کے پایہ تخت سے ناگپور جتنا قریب ہے۔ لکھنؤ اس سے بہت دور ہے۔ اس لیے ''ہائی کمانڈ'' کی سرتابی کی جو سزا ناگپور میں مل سکتی ہے، وہ لکھنؤ میں نہیں مل سکتی۔ یوپی گورنمنٹ کے عہدہ دار اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے افسر ہندوستانی کے بجائے علانیہ ہندی کے رواج پر تلے ہوئے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ آنریبل سمپورنا نند جی وزیر تعلیم کے رویہ کی سخت شکایت ہے کہ وہ صاف صاف کانگریس کے حکم کو توڑ رہے ہیں اور اپنی پبلک تقریروں میں وہ کچھ کہہ رہے ہیں جو ان جیسے وفادار کانگریسیوں کو نہیں کہنا چاہیے۔

اس وقت ہمارے سامنے ہمارے وزیر تعلیم کی وہ تقریر ہے جو بنارس میں انہوں نے ۱۹/اگست ۱۹۳۸ء کی شام کو ناگری پرچارنی سبھا کے ایڈریس کے جواب میں فرمائی اور جس میں یہ ارشاد ہوا:

> ''ہندی نہ صرف شمالی ہند کی مادری زبان ہے، بلکہ وہ ہندوستان کی ''لنگو افرینکا'' ہے۔ یہ ایسی ہونی چاہیے جس کو آسانی سے نہ صرف بنگال اور گجرات کے لوگ بول اور سمجھ سکیں، بلکہ وہ بھی جو دکنی ہند میں رہتے ہیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ ہندی جس کو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے (!) ہمارے دکھنی بھائی بھی آسانی سے سیکھ لیں تو یہ ضروری ہے کہ ہم بہت کافی بڑی تعداد میں سنسکرت لفظ استعمال کریں''۔
> (اسٹیٹسمین ۲۱/اگست ۱۹۳۸ء)

اب یوپی کانگریس کی زبان حال ہفتہ وار ہندوستان کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

> ''مدراس کی کانگریسی وزارت نے طے کرلیا ہے کہ مدراس میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان کی ابتدائی تعلیم لازمی کردی جائے گی۔

کیونکہ اس وقت یہی ایک زبان ہے جو ہندوستان کی مشترکہ زبان کہی جاسکتی ہے۔
ہندوستانی زبان سے وہ زبان مراد ہے جو سنسکرت اور عربی فارسی کے بھاری لفظوں
سے خالی ہے۔ تمام شمالی ہند اور دکن میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اردو ہندی دونوں
رسم الخط میں لکھی جاتی ہے''۔ (۲۸ راگست ۱۹۳۸ء)

کیا یہ دونوں ٹکڑے کسی ایک سبھا کے ذمہ داروں کے بیان ہیں؟

کہئے یہ حکم رہے، کہئے وہ ارشاد رہے

اگر یہ دلیل صحیح ہے کہ دکھن کے ہندوؤں کے سمجھنے کے لیے سنسکرت لفظوں کو کافی بڑی تعداد میں اس زبان میں ملانا چاہیے، تو یہ دلیل کیوں غلط ہوگی کہ آٹھ کرور مسلمانوں کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کافی بڑی تعداد میں عربی اور فارسی کے لفظ بولے جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کو جس قدر اس کے نادان دوستوں نے نقصان پہنچایا ہے، اتنا اس کے دشمنوں نے نہیں۔
(معارف، ستمبر ۱۹۳۸ء)

قومی ترقی

قوموں کی ترقی کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے۔ چند سچی حقیقتوں پر مستحکم یقین اور اس یقین کے مطابق عمل اور کامیابی کے لیے مسلسل جدوجہد، سعی و محنت اور اس راہ میں جو تکلیف و مصیبت پیش آئے اس کو ہنسی خوشی جھیل لینا، زمانہ کی، اصطلاحیں بدلتی رہیں گی لیکن اصطلاحوں کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلتی۔ اسلام کی اصطلاح میں اس مستحکم یقین کا نام ایمان۔ اس کے مطابق عمل کا نام عمل صالح اور مسلسل جدوجہد اور سعی و محنت کا نام جہاد اور اس کے لیے پامردی کا نام صبر و ثبات ہے۔ دنیا میں جب کسی قوم کو کامیابی ہوئی ہے تو اسی اصول کے مطابق ہوئی ہے اور جب ہوگی تو اسی اصول کے مطابق ہوگی۔

جانی اور مالی ایثار اس جدوجہد کی لازمی حقیقتیں ہیں، جن کو قرآن پاک کی اصطلاح میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی تحریک اس مالی اور جانی جہاد کے بغیر نہ کامیاب ہوئی ہے، نہ ہوگی۔ مذہبی تحریکوں کو جانے دیجیے۔ آج سیاسی اور اقتصادی تحریکوں کا دور ہے۔ ان میں سے کون سی تحریک کی گاڑی ان دو پہیوں کے بغیر چل رہی ہے۔ روس کا انقلاب، جرمنی اور اٹلی کا

فسزم، اسپین میں جمہوریت اور آمریت کا تصادم، فلسطین کی شہادت گاہ، ان میں سے کہاں ان دو کے بغیر کامیابی نصیب ہوئی ہے یا ہوگی۔ پھر ہندوستان کے مسلمان اس عرصۂ حیات میں کچھ انوکھی مخلوق نہیں کہ ان کے لیے دنیا کا اصول بدل جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنے قانون قدرت کو توڑ ڈالے گا۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اپنے قومی وسیاسی ایمان کے لیے کون سی چند حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے؟ اور اس کے حصول کے لیے وہ کون سی سرفروشی اور قربانی کر رہے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلبی اور ہنگامی حقیقتیں کبھی دائمی سربلندی کا جوش وخروش نہیں بخش سکتیں، سکھوں اور مرہٹوں کی قوتوں کی جواں مرگی کے اسباب بتانے والے بہت کچھ بتا سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک تو اس کا جواب یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت سے کینہ اور دشمنی یا مسلمانوں سے عداوت ہی فرض کر لیجیے۔ ان دونوں قوموں کا ایسا ہنگامی جذبہ تھا، جو پورا ہو جانے کے بعد خود بخود ختم ہو گیا اور بقا اور استحکام حاصل نہ کر سکا۔ آریہ سماج تحریک کا حشر بھی اس سے زیادہ نہیں۔

اب مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی قوم سے مخالفت اور آزردگی ہی ان کی قومی وسیاسی کوششوں کا محور قرار پائے تو ان کا یہ جذبہ کہاں تک ان کو اونچا لے جا سکتا ہے اور ان کی سعی ومحنت، جدو جہاد اور جوش وخروش کو کب تک قائم رکھ سکتا ہے؟ جو طوفان اور سیلاب دم کے دم میں آتا ہے وہ اسی طرح دم کے دم میں چلا بھی جاتا ہے۔

ہمارے سامنے اسلام خود ایک بہت بڑی حقیقت اور صداقت ہے۔ وہ مذہب بھی ہے، سیاست بھی ہے، اقتصاد بھی ہے، معاشرت بھی ہے۔ اس کے مذہبی وسیاسی واقتصادی واجتماعی پیغاموں کو پھیلانا، مساوات اور عدل قائم کرنا، اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا، دنیا سے سود، بدکاری، شراب خواری، قمار بازی اور ظلم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنا اور ملک میں ایک نیا سیاسی واقتصادی نظام قائم کرنا، اس کے وہ فرائض ہیں، جن سے مسلمان غافل ہیں اور غیر مسلمان اس کے لیے آج دنیا میں کٹ مر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ جس کے لیے وہ آج کٹ مر رہے ہیں، وہ عین اسلام ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے اس میں اسلامی نظام کی جھلک ہے۔ اب یہ خود ہمارا کام ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور اپنا مکمل سیاسی و

اقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کریں اور اس کے لیے کم از کم وہ جذبہ دکھائیں جو اسپین میں جمہوریت اور فسزم کے حامی دکھا رہے ہیں۔ وہاں قومیں نہیں لڑ رہی ہیں بلکہ ایک ہی قوم کے دو حصے دو مختلف نظریوں کے خاطر جان و مال کی بازی لگا رہے ہیں۔

مسلمانوں نے اسلام کے آغاز میں جو لڑائیاں لڑیں ان کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایک مذہب کو زبردستی پھیلانے کے لیے تلواریں نیام سے نکالی گئی تھیں لیکن آج سوشلزم اور فسزم کے باہمی مقابلہ میں جو تلواریں نیام سے باہر ہیں، کیا وہ بھی کسی خاص مذہب کو زبردستی پھیلانے کی خاطر نہیں ہیں۔ سوشلزم کے حامی کہیں گے کہ قوم میں طبقوں کی جنگ عوام کی بھلائی کے لیے چھیڑتے ہیں تو یہی تو اسلام کے حامی بھی کہتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کی بھلائی کی خاطر تلواریں اٹھائیں اور شہنشاہیوں کو مٹایا۔ سود خواروں کا قلع قمع کیا، سونے چاندی کے ٹھیکہ داروں کو نیست و نابود کیا، دنیا میں عدل و مساوات کی حکومت قائم کی اور انسانوں کو انسانوں کا معبود بننے سے روکا۔

آج زمانہ بدل گیا ہے تو اصطلاحیں بدل گئی ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے۔ آج پھر اسلام کو اسی فرض کو ادا کرنا ہے۔ اگر آج کے کلمہ گو مسلمانوں میں اس کے اس ادائے فرض کے سپاہی بننے کا ولولہ نہیں تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو زندگی کے میدان میں لائے اور اس سے اسلام کا یہ فرض ادا کرائے۔

دنیا آج اپنی نجات کی راہ فسزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم، بالشوازم میں ڈھونڈ رہی ہے۔ حالانکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے "اسلامزم" لیکن وہ اسلام وہ نہیں جو آج عملاً مسلمانوں میں ہے، بلکہ وہ جو قرآن و سنت میں ہے۔ آج کی وہ کون سی مشکلیں ہیں، جن کا حل ان میں نہیں، ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے۔ (معارف، جنوری ۱۹۳۹ء)

ہندوستانی زبان

ہندوستانی کی تجویز کانگریس نے پیش کی تھی اور زبان کے جھگڑے میں اس کا یہ فیصلہ متفقہ ہے۔ مگر کیا عجیب بات ہے کہ جب صوبہ بہار کی تعلیمی وزارت نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش شروع کی تو اس کی مخالفت پنڈت مدن موہن مالوی سے لے کر جنتا سبھا پٹنہ کے ممبروں تک نے شروع کر دی۔ ہندوستانی کا بت بنا کر اس کی ہولی جلائی گئی، اس زبان میں چھپے ہوئے رسالوں

اور کتابوں کا بائیکاٹ اور اس کی وجہ سے دھرم ناس ہونے کا ڈر بتایا جانے لگا اور بات اتنی سی ہے کہ کسی نومشق نے راجہ دسرت کو بادشاہ اور اجودھیا کی پرجا کو رعیت لکھ دیا۔ یہ ہے ہمارے دیس کے بھگتوں کی دیس پوجا اور اس کے ذریعہ سے ملک کی آزادی کا خیال۔

مسلمانوں کو تنگ خیال سمجھنے والے ہندو دوست ذرا اپنے گریبان میں منھ ڈالیں اور صرف ایک زبان ہی کے معاملہ میں اپنی دورنگی چال ملاحظہ فرمائیں کہ جب کانگریس کے چوپال میں بیٹھیں تو ہندوستانی کا گیت گائیں اور جب کونسل کی اسپیکری اور تعلیمی وزارت کی کرسیوں پر بیٹھیں تو اردو اور ہندی کہہ کر فی صدی آبادی کے حساب سے کتابوں کے دام بانٹیں اور دیہاتی لائبریریاں بنائیں اور گھر جا کر نج کے طور پر سنسکرتی ہندی کے بڑھانے اور اس کو ملک کی بولی ٹھہرانے کی تجویزیں سوچیں اور پرزور تقریریں کریں۔

کہئے یہ حکم رہے، کہئے وہ ارشاد رہے

(معارف، دسمبر ۱۹۳۹ء)

دیسنہ اور اس کے اطراف
میں ہندوؤں کے مسلمانوں پر مظالم

سالانہ دستور کے مطابق ان دنوں وطن (بہار) میں قیام ہے۔ شہر بہار اور اس کے اطراف کے دیہاتوں میں مسلمانوں پر ہندوؤں کے ظالمانہ حملوں کی اطلاعیں اخباروں کے ذریعہ سے عام ہو چکی ہیں۔ ان میں ۲۷ مسلمان جن میں بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی داخل ہیں، شہید اور سو سے زیادہ زخمی کیے گئے۔ سات آٹھ مسجدوں کو نقصان پہنچایا گیا، چند قبریں توڑی گئیں اور بہت سے مکانوں کو آگ لگائی گئی۔ اس وقت بہار کی عدالت میں مقدمے پیش ہیں۔ یورپین اور عیسائی مجسٹریٹ عدالت کی کرسیوں پر ہیں۔ ملزم حاضر کیے جارہے ہیں اور گواہوں سے ان کی شناخت کرائی جارہی ہے، مگر ایک بلوائے عام کے ملزموں اور مجرموں کی شناخت جس قدر مشکل ہے وہ ظاہر ہے اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوسکتا ہے وہ بھی چھپا نہیں۔

اس واقعہ نے متعدد نتیجے نگاہوں کے سامنے کردیے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ان سارے ہنگاموں میں مسلمانوں نے کسی ہندو پر ازخود حملہ نہیں کیا بلکہ ان کی حیثیت ہر جگہ اور ہر حالت میں

مدافعانہ رہی۔ دوسری بات یہ کہ جہاں چند مسلمانوں نے بھی جرأت اور ہمت سے کام لیا اور حملہ آوروں کا شجاعانہ مقابلہ کیا، خدا کی موعودہ نصرت ان کے پاس پہنچی اور دشمنوں کے منھ پھیر دیے۔ لیکن جہاں کہیں انہوں نے بھاگ کر چھپنے کی کوشش کی وہیں مارے گئے اور اپنی سزا کو پہنچے۔

اس واقعہ نے ان دیہاتوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کم ہے سراسیمگی پھیلا دی ہے۔ اور وہ اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگنے اور ہٹنے کی کوشش میں ہیں اور مسلمانوں کی بعض انجمنیں بھی چاہتی ہیں کہ ایسے دیہاتوں سے مسلمانوں کو نکال کر محفوظ مقامات میں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں ہیں آباد کر دیں۔ یہ صورت اچھی ہے اور آیندہ کے لیے حفاظت کی تدبیروں میں سے ایک یہ تدبیر بھی ہے مگر میری نظر ایک اور واقعہ پر ہے۔ مسلمانوں کا اس ملک میں قیام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد صرف ان کی ذاتی قوت بازو پر موقوف ہے۔ مسلمانوں کی ہر آبادی اسلام کا ایک مورچہ ہے، کسی مورچہ کو بے لڑے بھڑے دشمن کے حوالہ کر دینا آئین جنگ نہیں، جس طرح مسلمانوں نے اس ملک کے ایک ایک چپہ کو اپنے خون سے حاصل کیا ہے۔ ویسے ہی اس کے ایک ایک چپہ کو اپنے خون ہی سے بچانا ہے، دیکھیے کہ انگریزوں کو اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے کتنی جانی اور مالی قربانیاں پیش کرنی پڑ رہی ہیں، مگر قدم پیچھے نہیں ہٹاتے۔ مسلمان بھی کبھی اپنی سلطنت کا یہی حق ادا کرتے تھے لیکن جس دن سے ان پر بزدلی چھائی اور شخصی زندگی کی اہمیت ان کی اجتماعی زندگی کی اہمیت پر غالب آ گئی۔ ہندوستان کے ہر معرکہ میں وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اب پھر ان کو اپنی اجتماعی زندگی کا ثبوت دینا ہے اور ہر حال میں اسلام کے ہر مورچہ کو بچانا ہے اور دنیا پر ثابت کرنا ہے کہ ان کو اس ملک میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور سمجھوتے پر میرے قلم نے بارہا مضامین لکھے ہیں اور اب بھی اس کی ضرورت کا قائل ہوں، مگر گڑگڑا کر دشمنوں سے اپنے زندہ رہنے کی التجا کرنے سے مردانہ وار مر جانا بہتر جانتا ہوں۔ کیونکہ مردانہ وار مظلومانہ موت بھی زندگی سے کم نہیں۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے، ہر کربلا کے بعد

بہر حال ایسے صوبوں میں جہاں مسلمان بڑی اقلیت میں ہیں مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کی تدبیروں سے غفلت برتنا نہیں چاہیے، مگر اس بات کو پوری طرح باور کرنا ہے کہ ان کی زندگی نامردی

اورمرعوبیت میں نہیں، بلکہ شجاعانہ مدافعت اور اسلام کی برتر قوت پر یقین میں ہے۔کوئی قوم دشمنوں کے مارنے سے نہیں مرتی، بلکہ اپنی اخلاقی اور ایمانی موت سے مرتی ہے۔ہم کو اسی کی کوشش کرنا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اخلاقی اور ایمانی موت سے بچائیں۔

جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سلطنت وقت ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔اور اسی ذمہ داری کے زیر سایہ وہ اپنی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں۔وہ سخت غلطی پر ہیں۔کوئی سلطنت نہیں، بلکہ خود قوم اپنی زندگی کی ذمہ دار ہے اور قوم کے نوجوانوں پر جوملت کے سپاہی ہیں،قوم کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہے،مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری قوت کا سرچشمہ ہماری ایمانی طاقت کا خزانہ ہے۔اس خزانہ کی حفاظت آہنی تیغ وخنجر کے بجائے اسلام کی حقانیت کی تلوار اور ایمان باللہ کے خنجر سے ہوسکتی ہے۔

(معارف،جولائی ۱۹۴۱ء)

مولوی عبدالحق اور اردو کی خدمت

جناب مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کا کام جس تندہی،محنت اور جاں فشانی سے کررہے ہیں۔ اس کے لیے ہر اردو بولنے والا ان کا ممنون ہے۔اس عمر میں پورے ہندوستان میں جس طرح وہ دورے کرتے ہیں،لوگوں سے ملتے ہیں، تجویزیں سوچتے ہیں، ان کو عمل میں لاتے ہیں، وہ سب پر ظاہر ہے۔انہوں نے ادھر چند برسوں میں اس کی کوشش کی ہے کہ انجمن کی بنیاد کو اس طرح پائدار بنادیں کہ آیندہ بھی وہ مضبوطی کے ساتھ کام کرتی رہے۔اسی غرض سے وہ انجمن کے لیے دلی میں ایک مستقل عمارت بنوانا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنے دوستوں سے قریباً بیس ہزارروپے جمع کیے ہیں۔

لیکن لوگوں کو یہ سن کر اور بھی خوشی ہوگی کہ موصوف اردو کی خدمت صرف قدمے اور قلمے نہیں کررہے ہیں، بلکہ درمے بھی انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ موصوف نے انجمن کو ابھی پچاس ہزار روپے کی کثیر رقم اپنی ذاتی ملک سے ہبہ کی ہے۔مسلمانوں میں غالباً اپنی نوعیت کی یہ پہلی مثال ہے کہ کسی قومی خادم یا علمی خدمت گذار نے اپنی جسمانی و مادی خدمتوں کے ساتھ اتنی بڑی مالی اعانت کی توفیق پائی ہے۔شاید یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ موصوف نے جوزن وفرزند کا جھگڑا نہیں پالتے،عمر بھر کی اپنی ساری کمائی اپنی متبنی اولاد انجمن ترقی اردو کے حوالہ کردی ہے۔ہم موصوف کو ان کی اس جواں مردانہ سخاوت پر مبارک باد دیتے ہیں۔(معارف،مارچ ۱۹۴۲ء)

اردو اور ہندی

اگر یہ بات جو ہمارے بہت سے ہم وطنوں پر گراں گذرے گی، صفائی اور ایمانداری کے ساتھ کہہ دی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ہمارے بہت سے ہم وطن جو ہندی کو صوبہ کی زبان بنانے کے لیے سالہا سال سے بے قرار ہیں۔ ہر اس کوشش کو جس سے اردو کی بقا اور قیام کو کوئی مدد ملے، حد درجہ ناپسند کرتے ہیں اور اس لیے ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد ہمیشہ ان کی نظروں میں اس لیے کھٹکتی رہی کہ یہ ہندی کے ساتھ ہندی کے برابر ہی برابر اردو کو کیوں جگہ دیتی اور اس کی بقا و قیام میں کیوں کوشش کرتی ہے۔

کانگریس گورنمنٹ کے عہد میں وزیر تعلیم اور اسپیکر جس طرح کھلم کھلا اور بالاعلان ہندی کی اشاعت اور امداد کا کام انجام دیتے رہے۔ وہ کچھ چھپی بات نہیں، ان ہی کے اشارہ سے ہندوستانی ایکاڈیمی پر اس نام سے تحقیقات کا پہرہ بٹھایا گیا کہ اس کے ذریعہ سے اردو اور ہندی دو زبانوں کے بجائے ایک ہندوستانی زبان کا کام کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اس کے بنانے کی غرض یہ کبھی نہ تھی، بلکہ فریقانہ جھگڑوں سے الگ رہ کر دونوں زبانوں کی برابر کی خدمت تھی۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ خاکسار نے مخالفتوں کے باوجود ہندوستانی نام اور ہندوستانی زبان کی پرزور حمایت کی تھی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ دونوں قوموں کے درمیان بول چال کی زبان ایک رہے اور جس کی صورت یہ تھی کہ ہمارے اردو اور ہندی کے اہل قلم چند اصول پر مل کر ایک ہوتے۔ اور دونوں کوشش کرتے کہ اپنی زبان کو آسان سے آسان کریں۔ اور لفظوں کے پرتال کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لفظ قبول کیے جاتے جو چلن میں ہیں۔ اس کے لیے نہ قاموس کے ورق کھولے جاتے اور نہ شبد ساگر سے دیکھ دیکھ کر بولے اور لکھے جاتے، مگر افسوس کہ یہ میری تحریک عام طور سے کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ہمارے سیاسی ہندی کے حامی یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ وہ ہندی کو یعنی سنسکرتی ہندی کو اس صوبہ کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنا کر چھوڑیں گے۔ اس خیال کے حامی اگر صوبہ کی تعلیمی وزارت، مجلس قانون ساز کی صدارت اور ہماری سب سے پرانی تعلیم گاہ (یونیورسٹی) کی وائس چانسلری کی کرسیوں پر ہوں تو نتیجہ کے متعلق فیصلہ مشکل نہیں۔

ہندی کے بعض حامیوں کی طرف سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اردو مسلمان بادشاہوں کے

دربار میں پیدا ہوئی اور صرف ان لوگوں کی زبان رہی جو درباروں سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی سارے ملک کی زبان ہمیشہ ہندی ہی رہی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ نظریہ ایک بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے پیش کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ علمی اور تاریخی مسئلوں میں بھی ذہنی تنگ نظری حقیقت کو کس طرح بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔ اردو کی ہزار سال کی تاریخ اب بالکل سامنے آگئی ہے۔ اس کو دیکھ کر ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ زبان عوام کے جھونپڑوں، بیوپاریوں کی دوکانوں، لشکریوں کے خیموں اور فقیروں کی خانقاہوں سے نکل کر بادشاہوں کے درباروں تک پہنچی ہے۔ یہ دربار سے بازار، بازار سے دربار تک نہیں پہنچی ہے اور یہی واقعہ اردو کی ملکی ضرورت کے راز کو فاش کرتا ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۴۲ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ بحیثیت اردو یونیورسٹی

ناظم انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک اردو یونیورسٹی کی تجویز تمام اخباروں میں شائع ہوئی ہے، تجویز کی اہمیت اور معقولیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کے امکانات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ میرے خیال میں تو اگر اس کام کے لیے جامعہ ملیہ دہلی کو مرکز بنایا جائے۔ تو اس خواب کی تعبیر بڑی آسانی سے نکل سکتی ہے۔ جامعہ نے اپنے مخلص کارکنوں کی بدولت ایک کامیاب حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اس کے پاس سرمایہ بھی ہے، اہل علم بھی ہیں، کالج بھی ہے، اسکول بھی ہیں، ٹریننگ کالج بھی ہے، عمارتیں بھی ہیں، کتب خانہ بھی ہے اور اس کے ہاں تمام علوم کی تعلیم اردو میں ہوتی بھی ہے اور اس کی سند کو یورپ اور ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں نے مان بھی لیا ہے اور اب خود گورنمنٹ نے بھی اس کو تسلیم کرلیا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو اردو یونیورسٹی کی صورت میں ترقی دینا کیا مشکل ہے۔ دونوں اداروں کا مرکز بھی دلی ہی ہے اس لیے دونوں ایک دوسرے کی معاونت سے اس تجویز کی جزئیات پر غور کرسکتے ہیں۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۴۴ء)

وردھا میں ہندوستان کے متعلق مجلس مشاورت میں شرکت

وردھا کا سفر ہندوستانی زبان کے مشورہ کی غرض سے ہوا۔ میں نے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیا اور یہ عرض کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا

چاہیے، جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں فرق ہے۔اس لیے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی مذہبی وتمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی وفارسی وترکی ہونے سے کوئی چارہ نہیں ہے اور ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لیے ہونی چاہیے، اس کے بعد یہ عرض کیا گیا کہ زبان کے لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہیے۔اب اس وقت ہماری زبان میں عربی وفارسی، ہندی، سنسکرت اور انگلش کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے وہی ہماری زبان کا صحیح لفظ ہے، افسوس ہے کہ رپورٹروں نے لوگوں کی صحیح تقریریں چھاپنے کا بندوبست نہیں کیا۔(معارف، اپریل ۱۹۴۵ء)

اردو اور ہندی کے قضیہ میں ٹنڈن جی کا کردار

اردو اور ہندی کے قصہ کو کانگریس کے پلیٹ فارم پر لانے والے ٹنڈن جی ہیں۔ان ہی نے پہلے یوپی کانگریس کمیٹی میں اس کو پھیلایا اور بڑھایا۔اور اب اس کو وہ سارے ہندوستان کا مسئلہ بنا رہے ہیں۔پچھلی کانگریس منسٹری میں یہی خیال تھا جس نے پیارے لال شرما جیسے شریف اور ملنسار آدمی کی جگہ سمپورنانند کو اسکول کی ماسٹری سے وزارت کی کرسی پر لا بٹھایا اور سنسکرتی ہندی کے رواج کو اس تھوڑے اختیار کے برتے پر تعلیمات میں بزور پھیلانے کی اسکیم پر علانیہ عمل شروع کرایا گیا۔فیض آباد کی تقریروں میں دونوں نے مل کر اس کا اعلان کیا اور یہ کہنا حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ کانگریس منسٹری سے مسلمانوں کو نفرت دلانے میں ان سورماؤں کا بڑا حصہ ہے۔ٹنڈن جی کی ابھی حال کی پونہ کی تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی رائے پر مضبوطی سے اڑے ہیں۔(معارف، مئی ۱۹۴۵ء)

ہندوستان کا مستقبل اور مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ

ہندوستان کے مستقبل کا افق امیدوں سے جھلک رہا ہے، پہلو کوئی ہو مگر انقلاب کا منظر سامنے ہے۔سیاسی انتظامات کے تغیر کے ساتھ تعلیمی نظام کا تغیر بھی ضروری ہے بلکہ سیاسی انتظامات کا خاکہ تو سیاسی رہنماؤں اور انگریز حاکموں کے درمیان ابھی تک مزید گفتگوؤں کا محتاج ہے لیکن تعلیمی خاکہ تو گورنمنٹ کے مشیر تعلیم کے بغل میں ابھی سے دبا ہے۔

اس خاکہ کی جو اوپری جھلک دیکھی گئی ہے، اس سے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ جس طرح حکومت کا پرانا نظام ایسے ہندوستانیوں کی پیداوار اور پرورش میں مصروف تھا جو گونسل اور رنگ وروغن

کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور ذہنیت کے لحاظ سے انگریز ہوں اور جو حکومت کے سرکاری دفتروں کے چلانے کے کام میں آئیں، اسی طرح آیندہ تعلیم کا نظام کانگریسی وزارت کے زمانہ کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ایسا ہوگا جو دل و دماغ اور ذہنیت کے لحاظ سے سراسر ہندی اور خالص قومی ہو اور آیندہ ہندوستان کے متوقع صنعتی انتظامات کے مطابق ہو۔

ہم نے پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ مسلمان وقت سے پہلے طوفان کا اندازہ کرلیں اور یہ سمجھ لیں کہ ان کو ایسی تعلیم درکار ہے جس سے مسلمان مسلمان بھی باقی رہیں۔ اور اس راہ میں جو غفلت سرکاری مدارس کے پہلے دور میں ان سے ہو چکی ہے، وہ اس آنے والے دور میں نہ ہو اور اس کے لیے وقت سے پہلے مسلمانوں کو اپنی تعلیم کا مقصد اور ملکی تعلیم کے ساتھ ساتھ جو ناگزیر ہے، اپنی مذہبی تعلیم کے شمول کا بندوبست کرنا ہے۔

تعلیم کی اہمیت بہت بڑی ہے یہی وہ سانچہ ہے جس میں ملت کے نوجوان افراد ڈھل کر نکلتے ہیں، ان کی ذہنی تربیت، اخلاقی نشوونما، دماغی استعداد اور قلبی قوت یقین یعنی ساری ذہنیت اسی کے ذریعہ بنائی اور بگاڑی جاسکتی ہے۔ امت کو جیسے افراد کی ضرورت ہے وہ اسی کے ذریعہ تیار ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

خوب سمجھیے کہ ہندویت کی طرح اسلامیت کوئی قومیت یا وطنیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذہنی یقین اور اعمال و اخلاق کے خاص ایک طریق کا نام ہے، جس کی بقا تعلیم و تربیت کے سوا اور کسی ذریعہ سے ممکن ہی نہیں۔ اس لیے اس کی بقا کے لیے تعلیم و تربیت کے ایک ایسے خاص نظام کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو مسلمان رہنے اور بننے میں مدد دے۔

ہم کو خوشی ہے کہ اس وقت متعدد اصحاب فکر ایسے ہیں جو اس ضرورت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس کے لیے اپنی جدوجہد سے تیاری کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر افضال قادری صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلم لیگ کے شعبہ تعلیم کے ماتحت ایسے اصحاب کے مشوروں کو یکجا کر رہے ہیں اور وہ اپنی کمیٹی کے ارکان کے مشوروں سے ایک اسلامی تعلیمی نظام کا ایسا خاکہ تیار کر رہے ہیں جو موجودہ جدید علوم و فنون کے ساتھ ساتھ اسلامی ذہنیت کی پرورش کا بھی کفیل ہو۔

موجودہ علماء میں ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی اس لحاظ سے

خاص مدح کے قابل ہیں کہ وہ اس کام کی مشکل کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ اوراس کا حل نکالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ابھی انہوں نے ہندوستان کے اسلامی نظام تعلیم وتربیت پر ایک ضخیم تالیف شائع کی ہے اور دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں گذشتہ زمانہ میں اس مشکل کو جس طرح حل کیا تھا، وہی اب بھی اس کے حل کا راستہ ہے۔

آیندہ صفحوں میں موصوف کا ایک مقالہ اسی موضوع پر آپ کے سامنے گذرے گا جو خاکسار کی اس فرمائش پر لکھا گیا ہے کہ کم سے کم لفظوں میں وہ اپنے خیالات کو اس طرح یکجا کریں کہ عام مسلمان بھی ان کو سمجھ سکیں اور اس کے امکان پر غور کرسکیں اور ہوسکے تو آیندہ اسلامی نظام تعلیم کی ترتیب میں اس کو پیش نظر رکھا جائے۔

مولانا موصوف کا کہنا یہ ہے کہ سرکاری دفتری زبان ہونے کی جو حیثیت آج انگریزی کو حاصل ہے کل وہی ملک میں فارسی کو حاصل تھی۔ اور عربی میں یونانی عقلی علوم کو جو درجہ پہلے حاصل تھا، آج جدید انگریزی عقلی علوم اور سائنس کو حاصل ہے، اس لیے جس طرح مسلمانوں نے پہلے اپنے خالص مذہبی علوم فقہ وتفسیر وحدیث کی ایک ایک دو دو کتابوں کے ساتھ فارسی ادبیات اور یونانی عقلی علوم کو پیوند دے کر تمام اہل ملت کے لیے ایک نصاب تعلیم تیار کرلیا تھا۔ اسی طرح آج بھی ان خالص عربی علوم کی ایک ایک دو دو کتابوں کو ملا کر انگریزی درسیات اور جدید عقلی علوم کا ایک ہی نصاب ایسا بنایا جاسکتا ہے، جو سارے مدارس اور اسکولوں اور کالجوں میں یکساں پڑھایا جائے۔

اس نصاب کے ختم کرنے کے بعد جو لوگ مزید مذہبی علوم میں تحقیقی شان پیدا کرنا چاہیں ان کے لیے تکمیل کا الگ زائد نصاب بنالیا جائے اور جو جدید عقلیات اور انگریزی درسیات میں ترقی کرنا چاہیں، ان کے لیے بھی راستہ تیار رکھا جائے۔ اس سے ایک طرف قوم میں علماء اور تعلیم یافتوں کی دورنگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ دوسری طرف مسلمان نوجوانوں سے مذہبی بیگانگی کا عیب دور ہوجائے گا اور تیسری طرف علماء کی بے کاری کا خیال باطل ہوجائے گا اور وہ بھی دوسروں کی طرح اگر چاہیں گے تو دنیا کے کام میں بھی لگ سکیں گے۔

ضرورت ہے کہ اہل نظر حضرات اس تجویز پر غور کریں۔ اس وقت جمعیۃ العلمائے ہند بھی عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کی فکر میں ہے اور اس کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا ہے اور

بعض تجویزیں زیر غور ہیں۔اس لیے یہ وقت اس تجویز پر غور کرنے کے لیے بہت مناسب ہے۔
(معارف، جولائی ۱۹۴۵ء)

مسلمان جماعتیں

جماعت کی تعمیر صرف جذبات، جوش وخروش اور ہنگاموں سے نہیں ہوتی بلکہ کسی مقصد کے ساتھ عشق کی سی وابستگی اوراس کے حصول کی راہ میں جان و مال وعزت، ہر چیز کی قربانی کا حوصلہ ہونا چاہیے۔اوراس راہ میں موانع کی جو مشکلیں پیش آئیں۔ان کے ازالہ اور برداشت میں صبر وضبط اور عزیمت واستقلال اور حصول مقصد کے بعد اس حاصل شدہ مقصد کی بقا کے لیے اخلاق کی بلندی، عیش وآرام کی زندگی سے پرہیز، مال ودولت کی اور جاہ وعزت کی حرص ومحبت سے آزادی، مختلف عناصر کے مختلف افراد کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ اور مقصد کی بقا کو ہر ذاتی منفعت اور ہر شخصی فائدہ مندی سے برتر جاننا اور رکھنا اور اسی کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا، جب تک کسی جماعت کے افراد میں اکثریت اور اغلبیت کے ساتھ یہ اوصاف پیدا نہ ہوں گے اول تو کوئی جماعتی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور ہو بھی جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔

اب ہم کو دیکھنا ہے کہ آیا ہماری اس وقت کی جماعتوں میں یہ اوصاف پیدا ہیں یا نہیں، اگر نہیں ہیں تو پیدا کرنا چاہیے اور اگر ہیں تو ان میں مزید ترقی اور پختگی کی فکر کرنی چاہیے اور ہمارے رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنی مختلف تحریکوں اور تعلیموں میں ان اصولوں کی تعلیم کے سبق دیا کریں، جماعتیں بھی بچوں ہی کی خاصیتیں رکھتی ہیں اوران کی تعلیم وتربیت کے اصول بھی انہی کے جیسے ہیں۔

اسلام میں بدر کا معرکہ جو ۳۱۳ مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ ہر وقت پیدا کیا جا سکتا تھا، مگر بدر کے وقوع کے لیے تیرہ برس کے انتظار کی ضرورت پیش آئی اور جب تک ٹھوک بجا کر اور آزمائشوں کی آگ میں تپا کر ان کو دیکھ نہیں لیا گیا، ان کو معرکوں میں نہیں لایا گیا۔اس سے اندازہ ہوگا کہ جماعتوں کی تعمیر صرف ضد اور ہٹ اور سب وشتم اور طعن وطنز اور شوروغل اور مختلف نعروں کے شعر پڑھنے اور چیخنے سے نہیں ہوتی، بلکہ مقصد کی بلندی مقصد سے عشق نما وابستگی، اس کے حصول اور بقا کے لیے اعلیٰ اخلاق پختہ سیرت اور مضبوط کیرکٹر پیدا کرنا ضروری ہے۔

تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں ہیں کہ جماعت نے اپنے وحشیانہ جوش اور شجاعت سے

کسی مقصد کو حاصل کرلیا لیکن چونکہ اس کی بقا کے لیے جو اخلاق اور کیرکٹر چاہیے، ان کے نہ ہونے سے وہ مقصد ان کے ہاتھوں سے بہت جلد کھو گیا۔ اسی ہندوستان کی تاریخ میں اودھ کی سلطنت، روہیلوں کی ریاست، سکھوں کی شاہی اور مرہٹوں کی پیش وائی میں عبرت کی داستانیں چھپی ہیں۔

اس وقت بھی ہندوستان میں گو بہت سی ایسی ریاستیں آپ کو کھڑی نظر آتی ہیں مگر غور سے دیکھیے کہ ان قدیم یادگاروں کو صرف انگریزوں کی امداد کی آہنی سلاخوں نے تھام رکھا ہے ورنہ ان میں سے کے ہیں جن میں اپنی ریاست کے آپ سنبھالنے کی عزیمت استقامت اور ہمت باقی ہے۔ کیا عیش و آرام، حرص و ہوس اور ناز و نعمت کی فراوانی نے ان کو اندر سے بالکل کھوکھلا نہیں بنا رکھا ہے۔

اب جو ہندوستان میں وزارتوں کی حکومتیں قائم ہو رہی ہیں ان کو بھی دیکھیے کہ اگر ان کے چلانے والوں میں یہ اخلاق کی بلندی اور وسعت اور سیرت کی یہ پختگی اور کیرکٹر کی مضبوطی نہیں تو یہ انگریزوں کے سہارے چلنے کو چل جائیں مگر ان میں وجود کی ذاتی صلاحیت اور بقا کی اصلی استعداد کبھی پیدا نہ ہوگی۔

کانگریس کی پچھلی منسٹری کے چلانے والوں میں جو کمزوریاں تھیں۔ ان کے رہتے ہوئے اگر وہ جنگ کے بوجھ سے ٹوٹ نہ جاتیں، تو بھی از خود ان کو ٹوٹ جانا چاہیے تھا۔ واقعات کو شہادت اور گواہی کے ساتھ ثابت کرنا تو بہت مشکل ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب یہ شہادت کسی حکومتی نظام کے زیر ہدایت فراہم کی جائے تو اور بھی مشکل ہے۔ اس لیے ہم حریف اور مقابل بن کر نہیں بلکہ دوست بن کر کہتے ہیں کہ افراد کا انتخاب، اعلیٰ کیرکٹر، شریفانہ سیرت اور بلند اخلاق کی بنا پر کرنا چاہیے جن کی نظر میں وسعت سینہ میں گنجائش اور ہاتھ میں مضبوطی ہو، جن میں دوستوں کو بھی ان کی غلطی پر پکڑنے میں جھجھک اور دشمنوں کے ساتھ بھی ان کے بجا مطالبہ کے وقت ضد اور ہٹ نہ پیدا ہو، جو صرف اپنی اور اپنے خاندان اور اپنے دوستوں کی شکم سیری کے سامان نہ ہوں بلکہ ان کی نیکی اور مہربانی عام خلق کے ساتھ ہو، ان کو صرف اپنے ہی معبد اور مدرسے اور مکتب اور دھرم شالے عزیز نہ ہوں بلکہ ہر جماعت کے مذہبی جماعتی، تعلیمی اور مجلسی اداروں کے ساتھ یکساں تعلق ہو، ان کی نظر میں انسانوں کی جانوں کو بچانا جانوروں کی جانوں کے بچانے سے زیادہ اہم ہو، جن میں کسی سیاسی مسلک کے لیے صرف قربانی ہی کا جذبہ نہ ہو، بلکہ دیانت اور قوت نظم بھی ہو جن میں قوم ہی نہیں بلکہ

خلق کی خدمت کے لیے بھی لگن ہو۔ (معارف، مارچ ۱۹۴۶ء)

گاندھی جی کے خواب کی تعبیر

گاندھی جی نے ۱۹۲۰ء میں جو خواب دیکھا تھا، ۱۹۴۶ء میں اس خواب کی تعبیر ان کو مل گئی، وہی قیدی وزندانی مجرم جو کبھی تختۂ دار کے مستحق تھے، آج تخت حکومت پر متمکن ہیں۔ اور جو کبھی باغی قرار دیے جاتے تھے، آج انھی کو حکومت کی عنان سپرد کی جارہی ہے لیکن یہ تاریخ کا نیا واقعہ نہیں، دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا ہے اور ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا۔

اس کے ساتھ اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ اس سے ہندوستان کی سطح میں سیاسی سکون پیدا ہو جائے گا تو وہ سخت غلطی کا ارتکاب کرے گا۔ دنیا میں نہ کبھی کسی انقلاب سے سب نے موافقت کی ہے اور نہ اس پر قناعت کی ہے۔ کانگریس کے پیچھے پیچھے سوشیالزم کا انقلاب اور اس کے پیچھے کمیونزم کا سیلاب آنے والا ہے۔ جس طرح کانگریس نے سابق حکام سے آزادی چاہی، اور گویا پائی، اسی طرح آیندہ کانگریسی حکام کے مظالم کے نام سے سوشیالسٹ اٹھیں گے اور سوشیالسٹوں کے مظالم کے خاتمہ کے لیے کمیونسٹوں کا گروہ آگے بڑھے گا۔

مجھے اس موقع پر محمد علی مرحوم کا ایک فقرہ یاد آیا، ۱۹۲۰ء کے دسمبر میں گاندھی جی جب سوراج دلا رہے تھے۔ میں نے مرحوم سے کہا کہ مبارک! آپ کی قید و بند کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔ اب آپ ہی حکمراں ہوں گے۔ فرمایا مجھے اطمینان کہاں نصیب! اب جو فریق برسر حکومت آئے گا اس سے لڑنا پڑے گا اور اب وہ ہم کو قید خانوں میں بھیجا کرے گا، موجودہ ''سوراج'' کے عہد میں دوسری سیاسی پارٹیوں سے جو سلوک ہوگا یا ہونا شروع ہوا ہے۔ وہ اس پیشین گوئی کی صداقت کی دلیل ہے اور یہ طبعی ہے۔

اس نقطہ پر سب سے اہم مسئلہ ہندو مسلمانوں کی مصالحت اور مفاہمت کا ہے۔ اس مصالحت اور مفاہمت کے بغیر ہندوستان میں سکون پیدا نہیں ہوسکتا اور نہ ہندوستان یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ کل ہندوستانیوں کی حکومت ہے بلکہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہلے انگریزوں کی حکومت تھی۔ اب کانگریسیوں کی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ ملک میں نئے نئے فتنوں اور فسادوں کا پیدا ہونا ہے۔

چنانچہ اس کا بدترین مظاہرہ، کلکتہ، ڈھاکہ، بمبئی، احمد آباد، الہ آباد اور آگرہ میں ہوا اور ہو رہا

ہے۔ ہندو ہوں یا مسلمان، اس خونی سیلاب کی رو سے نہ وہ ملک میں کوئی انقلاب کر سکتے ہیں، اور نہ کسی اکثریت و اقلیت سے بدل سکتے ہیں، نہ اس سے مصالحت کی شرطوں میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ بنگال کی لیگی وزارت اور بمبئی کی کانگریسی وزارت کے احاطوں میں یکساں بلووں کا ہونا دونوں ہی کے لیے مشکلات کا باعث ہوا ہے۔

ریڈیو کی زبان کے متعلق نئی حکومت کے عہد میں جو فیصلہ ہوا ہے اس سے ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے دعوے دار خوش ہیں یعنی یہ کہ خبروں کے علاوہ باقی تقریریں یا خالص معیاری ہندی میں ہوں گی یا خالص معیاری اردو میں۔ معلوم نہیں ریڈیو کے بعد عدالتوں اور کونسلوں اور اسمبلیوں اور یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں کی زبانوں کے متعلق بھی یہی فیصلہ ہوگا یا اس سے مختلف ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس فریق کی جیت ہے کہ جو ملک میں دو زبانوں کا مطالبہ کرتا ہے لیکن اس کے اثرات بہت دور تک پہنچتے ہیں اور ابھی اس پر پوری طرح غور نہیں کیا گیا ہے۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۴۶ء)

ٹنڈن جی اور پنت جی

ٹنڈن جی کی قومیت واحدہ کے فلسفہ سے تو مدتوں سے آگاہی ہے مگر نیک صفات پنت جی کی زبان سے وہ تقریر سن کر جو فیض آباد کے الیکشن میں فرمائی، بڑی حیرت ہوئی اور پرانی عقیدت کے شیشہ کو بڑی ٹھیس لگی، جب دولت و اقبال کی بدمستی کا یہ عالم ہو کہ بڑوں بڑوں کو اپنی زبان پر قابو نہ رہے تو چھوٹوں کا کیا ذکر ہے۔ پنت جی سے ذاتی واقفیت کی بنا پر اب بھی وہی حسن عقیدت قائم ہے اور خیال کرتا ہوں کہ سوشیالسٹوں کے مقابلہ میں کامیابی کے سہل نسخہ کا یہ بھی اسی طرح بہ ضرورت استعمال ہے جس طرح مسلم لیگی اور مہا سبھائی، مذہبی و قومی تباہی کو کانگریس کی طرز سیاست کا نتیجہ بتا کر کل کانگریس کی مخالفت کرتے تھے۔ اور آج اسی کو سوشیالسٹوں کے مقابلہ میں کانگریسی رہنما استعمال کر رہے ہیں اور فریق مخالف کا یہ طنز سن رہے ہیں۔

ع ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

پنت جی تو صرف ہندی زبان ہی کے قبول کو قومیت متحدہ کی شرط قرار دے کر رہ جاتے ہیں لیکن ٹنڈن جی اس کے لیے ہندو کلچر کے قبول کو بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر اس حکم سے پہلے ان کو یہ بھی

بتانا چاہیے کہ کس عہد کے اور کس صوبہ کے ہندو کلچر کے اختیار کرنے پر وہ مسلمانوں کو مجبور کرنا چاہتے ہیں اور کیا مدراس و بنگال سے لے کر پنجاب تک کے ہندوؤں میں کوئی متحدہ ہندو کلچر کا نقشہ ان کے سامنے ہے؟ کیا پگڑی باندھی جائے یا ننگے سر رہا جائے، پھر پگڑی بھی کیسی پنجابی یا راجپوتی یا گجراتی یا مرہٹی یا مارواڑی یا میواڑی یا بنگالی سر برہنگی اختیار کی جائے۔ کس دیس کا کھانا کھایا جائے اور کس دیس کی ہندی بولی جائے۔

میرے خیال میں ٹنڈن جی جلدی کر رہے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ پہلے اپنے ہم خیالوں کو تہذیب و شایستگی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے دیں اور ہندی کو علوم وفنون سے معمور زبان بنالیں، پھر تو ہندوستان کا ہر باشندہ غالب قوم کی ہم نوائی اور ہم شکلی اور ہم لباسی کو بہ ضرورت زمانہ اور بغرض حصول اعزاز از خود قبول کرے گا اور اس وقت نہ دعوتوں کی ضرورت ہوگی اور نہ دعووں کی اور نہ وعیدوں کی، جس کو اشتہار کے بغیر عشق کا پیام عبودیت پہنچتا رہتا ہے، انگریزوں نے اپنی تہذیب وتمدن اور زبان اور کلچر کو جن اصولوں سے پھیلایا وہی اصول ادب دوسرے بھی اختیار کر سکتے ہیں، جن میں نہ زور ہے، نہ ظلم ہے اور مقصد بہمہ وجوہ حاصل ہے۔

لیکن ٹنڈن جی کو مسلمانوں سے پہلے خود اپنی حکومت کو مشورہ دینا چاہیے کہ وہ نئی دلی کی یورپین کلچر کی عمارتوں، کوٹھیوں، فرنیچروں، دفتروں، قاعدوں، قانونوں، طریقوں، سکریٹریوں، کلرکوں، چپراسیوں، سڑکوں اور سواریوں کو چھوڑ کر بنارس کی گلیوں میں چلی آئے موٹروں کے بجائے ہمارے منتری رتھوں پر نکلیں اور ہمارے سینا بانوں سے لڑیں۔

ٹنڈن جی کو جاننا چاہیے کہ کسی قوم کا کلچر نہ اس آسانی سے بنتا اور نہ اس آسانی سے بگڑتا ہے، پھر وہ کانگریس جس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہندو مسلمان یہودی عیسائی پارسی سب کی نمایندہ ہے۔ اس کے کسی لیڈر کا یہ کہنا کہ مسلمان، یہودی پارسی سب مل کر ہندو کلچر اختیار کرلیں اپنے دعویٰ کی آپ تردید ہے، کلچر ایک ترقی پذیر تحریک ہے، وہ کوئی جامد اور ساکن چیز نہیں، ٹنڈن جی کی اس دعوت کے یہ معنی ہیں کہ آج بیسویں صدی عیسوی سے ہٹ کر بکرمی سمّت کی ابتدائی صدیوں میں ہم پہنچ جائیں اور زمانہ کی ہر ترقی کا ساتھ چھوڑ کر ہم عہد تاریخ کی خاموش تصویریں بن جائیں اس دعوت کو نہ مسلمان ہی قبول کر سکتے ہیں نہ سمجھ دار ہندو۔

ہندو کلچر کی بنیاد تو ہندو دھرم شاستر پر ہے جس کی بنا پر ذاتوں کی تقسیم، چھوت اچھوت کی تمیز، راج اور ہنر اور پیشہ ورمزدوری کی طبقاتی تقسیم ہے، مجھے ڈر ہے کہ اس شاستر کے زور اور ٹنڈن جی کی تجویز پر راجپوت دلی اور صوبوں کے دارالحکومتوں کا قبضہ چاہیں گے اور پنڈتوں کو سیاست سے نکال کر پوجا پاٹ اور سکھشا کے پرانے دھندوں میں اور کایستھوں کو ان کے اپنے کاموں پر لگا دیں گے اور اپنے تمام سفیروں کو سمندر پار سے بلوالیں گے اور اچھوت ادھار اور گاؤں سدھار اور ہریجن کی تعلیم وترقی کی ہر تجویز کو مٹا دیں گے، کیا اس سے بھی زیادہ کوئی احمقانہ بات ہوسکتی ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۴۸ء)

ہندی اور ہندوستانی

اردو ہندی کا قصہ تو ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو چکا۔ اب ہندی اور ہندوستانی کا قصہ چل رہا ہے معارف کے پرانے پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ میں نے سمجھوتے کے طور پر ہمیشہ ہی ہندوستانی کی تائید کی ہے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستانی کی تحریک چلانے والا اگر میں اکیلا نہیں تو اس کے چلانے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ آخر ۱۹۴۵ء میں وہ دن بھی آیا جب گاندھی جی نے بھی اس کو مان لیا اور انہوں نے واردھا میں اس کے لیے ایک جلسہ بلایا، جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے اور اس میں ہندوستانی کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کی تجویز سوچی اور مانی گئی۔

اس جلسہ میں بہت سے ہندو اور مسلمانوں نے اپنی اپنی تقریریں کیں جو ہندوستانی پرچار سبھا کی رپورٹ میں چھپ بھی چکی ہیں۔ اس میں جتنی تقریریں ہوئیں وہ اس انداز پر ہوئیں کہ جو کوئی جو کچھ کہے اس کو سب ہی سمجھیں، بڑے اچنبھے کی بات یہ ہے کہ یوپی غالباً پرتاپ گڑھ کے ایک نوجوان نے جن کولباس سے میں پہلے مسلمان سمجھا بعد کو وہ ہندو نکلے۔ اپنی تقریر میں یہاں تک کہا کہ اس وقت یہاں جتنی تقریریں ہوئیں، ان میں پوری پوری ہندوستانی سید سلیمان کی تقریر تھی، حالانکہ میں ہندی نہیں جانتا مگر بات یہ ہے کہ اردو میں سیدھے اور صاف اور آسان لفظ اتنے ہیں کہ ان کے سہارے سے اچھی خاصی تقریر کی جاسکتی ہے۔

اس جلسہ میں گاندھی جی نے ٹنڈن جی کو بھی بلایا تھا مگر وہ حیلہ بہانہ کرتے رہے اور اخیر تک

نہیں آئے اور پھر بعد کو اخباروں میں ہندوستانی سے اپنا اختلاف صاف صاف ظاہر کر دیا اور اب بھی وہ اسی پر اڑے ہیں۔ ان کے جی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے، اس کی بولی بھی وہی ہونی چاہیے جو ہندوؤں کی ہے، مگر ہم ان کی اس رائے کو اگر مان بھی لیں تو بھی یہ بات نہیں مانی جاسکتی کہ وہ ہندی یعنی سنسکرتی ہندی جس کو وہ ہندوؤں کی بولی بتاتے ہیں، حقیقت میں آج بھی جب ہندی کا اتنا پرچار ہو چکا ہے کسی صوبہ کے بھی ہندوؤں کی مادری بولی ہے، جب چاہیے نج کے کسی جلسہ اور ملاقات میں اس کا تجربہ کر لیجیے۔ باقی ہندی کے اخباروں اور کتابوں میں جو بولی لکھی جارہی ہے وہ بناوٹ سے چند سال سے لکھی ضرور جارہی ہے مگر بولی کہیں نہیں جاتی۔

معلوم نہیں یہ سنسکرتی ہندی والے ہندوستانی کو کیا سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ اس بولی کا نام ہے جس کو ہم آسان اردو اور آسان ہندی دونوں کہہ سکتے ہیں اور جس کو ہندو اور مسلمان بول رہے ہیں، ہم نے کبھی کبھی ریڈیو پر گاندھی جی، راجندر پرشاد، جواہر لال، پنڈت پنت، بلکہ پٹیل صاحب کی تقریریں سنی ہیں، ابھی کچھ دنوں پہلے ۲/اگست کی رات کو پنت جی کی تقریر غلّوں اور کپڑوں کے کنٹرل پر سنی، یہ پوری ہندوستانی تھی جس کو اردو اور ہندی دونوں کے جاننے والے اور دیہات اور شہر دونوں کے رہنے والے برابر سمجھ سکتے تھے، کہیں کہیں ان میں زبردستی سنسکرتی ٹائپ کا کوئی لفظ آجایا کرتا تھا، مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ آورد ہے آمد نہیں یعنی اس کو لایا گیا ہے، یہ خود آیا نہیں ہے۔

کانگریس کی پہلی وزارت کے زمانہ میں صوبہ بہار کی وزارت تعلیم نے ملک کے اردو اور ہندی ادیبوں کی ایک کمیٹی بنائی تھی، جو ہندوستانی زبان کی صرف ونحو کے قاعدے لکھے، ڈکشنری تیار کرے اور علمی اصطلاحوں کو بنائے یہ کام پٹنہ میں کئی سال تک ہوتا رہا اور سب کچھ جب بن کر تیار ہو چکا تو حکومت بدل گئی، خیال تھا کہ اب جب کانگریس کی آزاد حکومت قائم ہوگئی تو پھر اسی بنیاد پر زبان کا سوال طے ہو جائے گا، معلوم ہوا کہ ملک کی آزادی پا کر بعض ناسمجھ اس بنے ہوئے کام کو بھی بگاڑنے میں لگے ہیں۔ ۹/جولائی کو بہار کے موجودہ وزیر تعلیم سے ملنا ہوا جو خود بھی ہمارے ساتھ اس ہندوستانی کمیٹی کے ممبر اور اس کام میں شریک تھے، تو معلوم ہوا کہ سارا معاملہ ابھی تک جیوں کا تیوں ہے اور ابھی تک فیصلہ نہیں ہوسکا ہے، کیا عجب ہے کہ وہ بہار ہی اس اردو ہندی کے سوال کو حل کرے جہاں پہلی دفعہ یہ جھگڑا انگریزوں نے کھڑا کیا تھا۔ (معارف، ستمبر ۱۹۴۸ء)

ایک غلط راہ

ہندوستان میں ۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد اور خصوصاً مشرقی پنجاب اور دہلی کے غیر متوقع واقعات سے مسلمانوں پر ایک حیرت سی چھا گئی ہے۔ ان کو اپنے لیے ہندوستان کی اس نئی دنیا میں عزت کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ بہتیرے دماغ تو سوچنے اور سمجھنے سے معذور ہو گئے ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ نئے ماحول سے وہ اپنے کو کیسے مطابق کریں۔ بعضوں نے اب سوچنا شروع کیا، تو ان کو یہ راستہ نظر آتا ہے کہ وہ محکوم ہیں، اور ہندو ان کے حاکم ہو گئے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے عزت کی زندگی کا راستہ یہ ہے کہ محکوم قوم حاکم قوم کے ساتھ محکومانہ وفاداری کا تعلق پیدا کرے اور اس کے علوم وفنون اور زبان کو اپنائے اور اس کے طور طریق اور تمدن وتہذیب کو اختیار کرے۔ چنانچہ اس وقت جو نئے اخبارات نئے پیغاموں کے ساتھ نکلنے لگے ہیں، وہ کبھی صراحتاً اور کبھی اشارتاً اس قسم کے خیالات پھیلا رہے ہیں۔ افسوس کہ یہ مقصد سرتاسر غلط ہے اور یہ غلط رہنما مسلمانوں کی خودکشی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔

صحیح صورت یہ ہے کہ کانگریس کا اعلان اور حکومت وقت کا منظور کردہ دستور اساسی ظاہر کرتا ہے کہ ملک ہندوستان اس ملک کے سارے باشندوں کی متحدہ جمہوری حکومت ہے، جس میں اس ملک کی ہر قوم برابر کی شریک وسہیم ہے۔ البتہ نمایندگی اور تقسیم ملازمت میں قوموں اور فرقوں کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ہوگی اور لازماً اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس قوم کی تعداد بڑی ہوگی، اس کو اکثریت کی قوت حاصل ہوگی، مگر اس کا نتیجہ اقلیت والے گروہ کی محکومی نہیں، بلکہ ہندوستان کے ہر فرقہ اور گروہ اور اہل مذہب کو اپنے دین، زبان، تمدن، تہذیب اور طریق معاشرت کی پوری آزادی کا مساویانہ حق حاصل ہے اور اس وقت تک کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، جب تک وہ اپنی قومیت کے عناصر کی پوری طرح حفاظت نہ کرے اور اس کے لیے پوری جدوجہد نہ کرے اور اس راہ میں جانی و مالی خدمت وایثار کے جذبات سے اپنی خودمختاری کا ثبوت نہ دے۔

جب سے جناح وگاندھی کی بمبئی والی گفتگو میں یک قومی اور دوقومی نظریہ پیدا ہوا ہے، بار بار یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں یا دو قوم، دونوں طرف دو گروہ ہیں اور ہر قسم کی مصیبت کا سبب ان نظریوں کو بتایا جارہا ہے مگر غلطیاں دونوں طرف ہیں۔

ایک یا دو قوم کے نظریہ کو زبان پر لانے سے پہلے اس کا فیصلہ کیجیے کہ قوم سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ اگر یہ ہے کہ ایک ملک کے سارے رہنے والے ایک قوم ہیں تو بلا شبہہ اس ملک کے رہنے والے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور اگر اس سے مقصود ان عناصر کی وحدت ہے جن پر ان دونوں قوموں کے مذہبی اور روحی خیالات وجذبات ورجحانات کی بنیاد ہے تو ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو ہی قومیں نہیں، بلکہ بیسیوں قومیں ہیں۔ جس طرح ہندو مذہب ایک مذہب نہیں بلکہ بیسیوں مذہبی تصورات اور رسوم کا مجموعہ ہے اور ہر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ پھر بھی وہ ایک مذہب ہے اور ان کو ایک قوم سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندو اور مسلمان اپنے مذہبی عقائد وعبادات اور تمدنی و تہذیبی عناصر میں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں، پھر بھی وطنی حیثیت سے ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں۔

ہندو مہا سبھائی اور بعض کانگریس کے بھیس میں ہندو مہا سبھائی جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ تمام ہندوستانی قوموں کے امتیازی عناصر واوصاف کو مٹا کر ایک واحد ہندوستانی قوم بنائیں، وہ بڑی بھول میں ہیں۔ ہندوستان کی پچھلی تاریخ گواہ ہے کہ جب جب ہندو قوم کی اس تنگ خیالی نے ظہور کیا ہے، ملک غلامی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ میں نے بمبئی کی تقریر میں پی ان اے کے جشن جوبلی میں یہ کہا تھا کہ ہندوستان سینکڑوں قوموں کے رنگ برنگ کے موتیوں کی مالا ہے، جو لوگ ان کو زبردستی ایک بنانا چاہتے ہیں، وہ ان رنگ برنگ کے بیش قیمت موتیوں کو کوٹ کر ایک سفوف بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سفوف تو تیار ہو سکتا ہے مگر پھر ان میں سے کسی بڑے یا چھوٹے موتی کی اتنی اعلیٰ قدر و قیمت باقی نہیں رہ سکتی۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے یا بیگانے جو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی ممتاز ہستی کو خیر باد کہہ کر اکثریت میں مدغم ہو جائیں۔ وہ مسلمانوں کو خودکشی کی دعوت دے رہے ہیں۔ میرے نزدیک ملک کے ساتھ پوری وفاداری اور اکثریت کے ساتھ مصالحانہ حسن تعلق رکھنے کے باوجود مسلمان مسلمان رہ سکتے ہیں اور مسلمانوں کو مسلمان رہنے کی دعوت دی جا سکتی ہے اور ان کی امتیازی حیثیت کو باقی رکھا جا سکتا ہے۔ اور ان کے دین، تہذیب، زبان اور علوم کو جو ان کی اپنی قومیت کے عناصر ہیں، نہ صرف باقی رکھا جا سکتا ہے، بلکہ ان کے باقی رکھنے کی پوری کوشش کرنی

چاہیے اور مسلمان قوم ہندوؤں کے ساتھ وطنی وحدت قائم رکھنے کے باوجود اپنی مذہبی و تہذیبی ہستی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ ان کو اس ملک میں زندہ رہنے کے لیے یہ تعلیم کیوں دی جائے۔ کہ اب ہندوستان کی وحدت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام امتیازی اوصاف و خصائص کو خود چھوڑ دیں یا ان سے زبردستی چھڑا دیا جائے، جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں، وہ مسلمانوں کو غلط راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اور پوری قوم کی قوم کو ہلاک و برباد کرنا چاہتے ہیں۔

بیشک ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو صداقت کے نہیں، بلکہ قوت کے پرستار ہیں، جو کل انگریزوں کی طاقت کے عہد میں انگریز کی نقالی کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ آج ہندو اکثریت کی طاقت کے عہد میں ہندو کی نقالی کو اپنا فخر سمجھیں گے مگر ایسے بہروپیے کبھی بھی اعتبار کے قابل نہیں۔

مسلمانو! اٹھو اور تم اپنے کو ہندوستان کی سلطنت کا حصہ دار سمجھو اور ملک کی وفاداری اور اہل ملک سے دوستی کے ساتھ اپنے مذہبی و تہذیبی امتیازات کے قیام و تحفظ و بقا کے لیے مردانہ وار جدوجہد کرو اور اسی کو اپنی زندگی کا راز سمجھو۔

ع　در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

(معارف، نومبر ۱۹۴۸ء)

نہرو لیاقت معاہدہ

ساڑھے تین برس کے بعد میں بھوپال سے رخصت ہو کر واپس آیا۔ ابھی تو تین ماہ کی رخصت میں نے لی ہے۔ مگر امید یہی ہے کہ اب پھر واپسی نہ ہوگی لیکن ابھی یہ طے نہیں کیا ہے کہ زندگی کے باقی دن کہاں اور کس طرح گذارے جائیں۔ احباب اب مجھے بھوپال کے پتہ سے خط نہ لکھیں۔

ان ساڑھے تین برسوں میں دنیا بدل گئی، بیسیوں خیالات بدل گئے۔ بہت سے نظریوں میں انقلاب ہو گیا، بعض ممکن اب ناممکن اور ناممکن اب ممکن ہو گئے۔ ایک ملک دو ملک ہو گئے، ایک ملک کے رہنے والے خود اپنے ملک میں بیگانہ ہو گئے۔ غالباً تاریخ میں اس واقعہ کی مثال نہ ملے گی۔

ان دونوں ملکوں کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کا طوفان امنڈا آرہا تھا اور ڈر تھا کہ اس سیلاب کی زد میں خدا جانے کیا کیا آئے کہ خلیج بنگال کے دہانہ پر آکر وہ تھم گیا، یعنی بنگال کے پچھلے واقعات نے دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کو پچھلے دور زندگی پر غور کرنے اور ایک مصالحتی معاہدہ پر

متفق کر دیا، بنگال ہی سے کلکتہ اور نواکھالی، یہ سیلاب اٹھا تھا اور شاید بنگال (مشرقی و مغربی بنگال) پر آ کر وہ ختم ہو گیا، خدا کرے کہ انسان کے حیوان بننے کا سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

ہندوستان اور پاکستان کا یہ معاہدہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کے لیے پناہ کا سایہ ہے اور جیسا کہ لیاقت علی خان نے اپنے امریکہ کے ایک بیان میں کہا ہے کہ یہ قدم تقسیم کے بعد سب سے پہلے اٹھنا چاہیے تھا مگر سوئے اتفاق نے ایسا نہ ہونے دیا، بہر حال جو قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ چکا ہے اب اس سے ہٹنا نہ چاہیے کہ اس ہٹنے میں دونوں کی تباہی ہے۔

اس معاہدہ نے دونوں ملکوں کی قدر دنیا کی نظروں میں بڑھا دی اور دونوں ملکوں کے وزیر اعظموں کے اخلاص، تدبر اور دانش مندی کی تحسین دنیا بھر کے اخباروں نے کی، خصوصیت کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کے ایڈیٹروں کی باہمی ملاقات اور مبادلۂ خیال اور میل جول کے تعلقات نے ملک میں جو خوش گوار فضا پیدا کی ہے اس سے امید ہوتی ہے کہ شاید ہماری مصیبتوں کے بادل ان دونوں ملکوں کے افق سے ہمیشہ کے لیے چھٹ گئے۔

ہندوستان کے باشندوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ساری دنیا سمٹ کر ایک گھر میں جمع ہو گئی ہے اور ساری قومیں مل جل کر آیندہ دنیا کا نقشہ بنا رہی ہیں۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ وہ اپنی دنیا الگ بنائیں اور ہزار ہا سال پیچھے ہٹ کر پھر ملک کو ویسا ہی بنا دیں جیسا پہلے تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ریل اور ہوائی جہاز کے اس دور میں پھر سے بہلی اور رتھ پر سوار ہو کر اپنا سفر شروع کر دیں اور آپ دیکھیں گے کہ یہ تخیل ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہیں بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں میں تفرقہ پیدا کر دے گا اور اس باقی ملک کو بھی بیسیوں ملکوں میں تقسیم کر دے گا۔

اپنے صوبہ کے ٹنڈن جی کی آواز تھم تھم کر پھر سنائی دیتی ہے، اخباروں میں آیا ہے کہ راج رشی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ ہندو کلچر کو اختیار کریں ورنہ پاکستان کی راہ لیں، اگر یہ بیان صحیح ہے تو ٹنڈن جی سے اول تو میرا یہ کہنا ہے کہ کیا وہ ملک کے ڈکٹیٹر ہیں یا بادشاہ، جو پوری قوم کی طرف سے اپنے خیال کا اظہار حکم کے لہجہ میں کر رہے ہیں۔ وہ اس صوبہ کی اسمبلی کے ایک اسپیکر اور اس صوبہ کی کانگریس کے صدر ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں اور اس لیے وہ اس تحکمانہ لہجہ میں باتیں کر کے اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

وہ ہندو کلچر جس کے وہ منادی ہیں۔کہاں پایا جاتا ہے، کیا ان کی داڑھی ہندو کلچر ہے، کیا ان کا ننگا سر ہندو کلچر ہے، کیا بھارت کی یونیورسٹیوں میں ہندو کلچر ہے، کیا ہمارے بڑے بڑے عہدہ داروں، نئے تعلیم یافتوں اور طالب علموں کے طور وطریق اور لباس وصورت اور زبان وبیان اور طریق زندگی میں ہندو کلچر ہے۔آج ہر جگہ یورپ کا تمدن پھیل رہا ہے۔اسی کی پیروی ترقی کا نام پا رہی ہے۔ہمارے نوجوان برملا کہتے ہیں کہ یورپ کے اس غلبہ اور استیلا کو جو ہر میدان میں نظر آرہا ہے۔آج ہندو کلچر سے نہیں بلکہ اسی کے طور وطریق سے روک سکتے ہیں۔اور اب یہ پرانی باتیں کسی پرانے ڈھنگ کے ملک میں بھی نہیں چل سکتی ہیں۔اس لیے اگر کوئی نئے زمانہ کا دل جلا نوجوان کسی دن خود راج رشی سے یہ کہہ دے کہ رشی جی آپ یوروپین کلچر اختیار کیجیے، ورنہ ہندوستان چھوڑ کر نیپال کی ترائی میں چلے جایئے اور وہیں تپشیا کیجیے، تو کیا ہوگا۔

ہندوستان کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ملک آنکھیں بند کر کے جواہر لال کے پیچھے چلے، ان کے خیالات کو دل میں جگہ دے اور ان کے احکام کی تعمیل اور ان کی نصیحتوں پر عمل کرے، ورنہ تنگ خیال تحریکیں ملک کو ویران کردیں گی۔صوبوں کی زبان وار تقسیم، ہزار سال کی مردہ ریاستوں کو دوبارہ جنم دینے کا خیال، سنسکرت کو ملک کی زبان بنانے کی تحریک، یہ سب اسی تنگ خیالی کی پیداوار ہیں۔

بھارت نے جو اپنا آئین تیار کیا ہے۔اس میں اقلیتوں کے جان و مال، عزت وآبرو اور مذہب وتمدن وزبان کی حفاظت اور حقوق کی مساوات کی جو دفعہ رکھی ہے۔اس کا بار بار ذکر آتا ہے اور اس کو اقلیتوں کی حفاظت کا سنگی قلعہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے، مگر یہ نکتہ ذہن سے نکل جاتا ہے کہ کاغذ پر لکھا ہوا آئین کسی اقلیت کی حفاظت کا سامان نہیں، بلکہ اس پر عمل حفاظت کا سامان ہے، اگر اکثریت کا طرز عمل اس آئین کے مطابق نہ ہو تو آئین بھی ردی کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں۔ضرورت ہے کہ بھارت کے باشندے اس آئین کی قدر کرنا سیکھیں اور اپنی غلط کاری سے انصاف اور برابری کی ان سطروں کو نہ کاٹ دیں، جو ان کے نمایندوں نے ان کی رہنمائی کے لیے اس آئین نامہ میں لکھی ہیں۔

(معارف، مئی ۱۹۵۰ء)

ٹنڈن جی کا مسلمانوں کے ہندو کلچر اختیار کرنے پر اصرار

مئی کے شذرات میں ٹنڈن جی کے اس مطالبہ پر کہ مسلمان ہندو کلچر اختیار کرلیں، میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لہجہ میں گو سختی ہے، جس کا مجھے افسوس ہے، تاہم جو بات لکھی گئی ہے، اس کی سچائی میں کوئی شبہہ نہیں، ٹنڈن جی اس صوبہ کی کانگریس کے اس وقت سب سے بڑے آدمی ہیں۔ کانگریس کے اصولوں میں ہندو مسلمانوں کا امتیاز نہیں، ایسی حالت میں ٹنڈن جی کا بار بار یہ مطالبہ کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ہندو کلچر اختیار کرلیں، کانگریس کی بولی نہیں، ہندو مہا سبھا کی بولی ہے۔

کانگریس کے بڑے لوگوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ہندوستان کے کل باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی سب ایک قوم ہیں اور اسی لیے انھوں نے ہندو کلچر اور مسلمان کلچر کی تفریق ماننے سے انکار اور صرف ایک ہندوستانی کلچر کا اقرار کیا ہے۔ ایسی صورت میں صوبہ کانگریس کے موجودہ صدر کی یہ بار بار رجز خوانی کہ مسلمان ہندو کلچر اختیار کرلیں۔ مسلم لیگ کے اس دعویٰ کی تصدیق ہے کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں اور دونوں کے دو کلچر ہیں لیکن اب ان میں سے ایک کو مٹ جانا اور صرف دوسرے کو زندہ رہنا چاہیے۔

پھر ٹنڈن جی کو چاہیے کہ آئین ہند کی اس دفعہ کو مٹوا دیں، جس میں اقلیتوں کے مذہب، زبان اور کلچر کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آئین بنانے والوں اور آئین کے ماننے والوں کے ذہنوں میں یہ چیز تھی کہ ہندوستان میں مختلف مذہب، مختلف زبانیں، مختلف تمدن اور مختلف کلچر ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو زندہ رہنا چاہیے۔

ملک کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نے آج سے بہت پہلے اپنی آپ بیتی میں بڑے شدومد سے یہ ثابت کیا تھا کہ ہندوستان میں کوئی ہندو کلچر اور مسلمان کلچر نہیں اور ان میں لوٹا اور لٹیا کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ان کا یہ بیان سچ ہے تو پھر صدر صوبہ راج رشی ٹنڈن ہی کے اس مطالبہ کے کہ ''مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندو کلچر اختیار کرلیں'' کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

اتفاق دیکھیے کہ عین ان سطروں کے لکھتے وقت پانیر مورخہ ۲۱/مئی ۱۹۵۰ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تقریر چھپی ہے جو انھوں نے دہلی کی یونائیٹڈ نیشنس اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن دہلی

میں ۲۰؍مئی کو کی ہے۔اس میں کہتے ہیں کہ:

"ملک کے نوجوانوں میں ہندوکلچر کے نعروں کی رہبری کی جارہی ہے، جونہایت گھٹیا، عامیانہ، تنگ دلانہ اور مغرورانہ ہے۔ ہمارے خیال میں کلچر طریق کردار اور طریق عمل کا نام ہے۔اس کے معنی جوتم ہوتے ہونہ کہ جوتم پکار کر کہتے اور بکتے ہو، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ترقی یافتہ قوم بنیں تو ہم کو چاہیے کہ ہم اپنی ذہنیت کو بھی ترقی دیں۔ ملک کی تقسیم سے پہلے جب اسلامی کلچر کی بات کہی جارہی تھی، تو آج سے سترہ برس پہلے میں نے اپنی کتاب آپ بیتی میں ہندوکلچر اور اسلامی کلچر پر بحث کی تھی کہ ہندو اور مسلم کلچر سے کیا مراد ہے؟ میں اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں، البتہ........ہندوستانی کلچر، عرب کلچر اور ایرانی کلچر تک تو سمجھ میں آسکتا ہے"۔

پنڈت جی نے جو بات کہی ہے وہ کانگریس کا نقطۂ خیال ہے اور اسی پر اس کی ساری سیاست کی بنیاد ہے۔ ایسی صورت میں ٹنڈن جی کا مطالبہ ایک ایسی بات ہے جو سراسر کانگریس کے اصولوں کے خلاف ہے اور بجائے اس کے کہ مسلمان اس کی مخالفت میں آواز اٹھائیں خود کانگریسیوں کو اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں پنڈت جی نے وہ بات کہی ہے، جو معارف میں بار بار کہی گئی ہے کہ ہندوستان کی ترقی کا زمانہ ہمیشہ وہ رہا ہے، جب اس نے دوسری قوموں اور ملکوں سے تعلقات پیدا کیے اور بیرونی اثرات کو قبول کیا ہے اور اس کے زوال کا زمانہ وہ ہے، جب وہ دنیا سے اپنے کو الگ تھلگ کر کے اپنے اندر محدود ہو گیا ہے۔

۲۳؍مئی ۱۹۵۰ء کے پانیر میں وحید احمد صاحب پارلی منٹری سکریٹری یوپی کی ایک تحریر نظر سے گذری، جس سے معلوم ہوا کہ ٹنڈن جی نے ملک کی معاشرتی اصلاح کی طرف بھی قدم اٹھایا ہے اور اپنی ایک تقریر میں انٹر میرتج یعنی ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کی تجویز پیش کی ہے۔ میں نے یہ تقریر نہیں پڑھی۔ اگر اس سے ٹنڈن جی کا مقصد ہندو جاتیوں کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کی تجویز ہے، تو مجھے اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے، لیکن اگر اس سے مقصود ہندو مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ کی تجویز ہے جیسا کہ مضمون نگار کے بیان سے ظاہر ہوتا

ہے، تو میں ٹنڈن جی کی اس تحریک کو مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو فنا کردینے کے لیے دوسرا قدم سمجھتا ہوں۔ منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان کے جداگانہ وجود باقی نہ رہے۔

لیکن مجھے اس تحریر کو پڑھ کر ٹنڈن جی سے زیادہ خود مضمون نگار کے جواب سے جو اسلام کی طرف سے انہوں نے دیا ہے سخت تکلیف ہوئی ہے۔ مضمون نگار نے راج رشی کو ان کو اس تجویز کی بنا پر مغل اعظم کا خطاب دیا ہے کہ اکبر نے راجپوت شہزادیوں سے بیاہ کر کے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا، راج رشی اسی کا رواج اب اس عہد کے مغل اعظم بن کر دینا چاہتے ہیں اور اس کے بعد مضمون نگار نے ہندوؤں کی مذہبی کتاب وید کو الہامی کتاب مان کر اور ہندوؤں کو اہل کتاب میں داخل کر کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں نکاح کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

مضمون نگار میرے پرانے دوست ہیں، اس لیے اول تو ان سے مخلصانہ عرض ہے

بہ چیزے کہ نخواندۂ تو تفسیر مکن صیادنۂ اگر تو نخچیر مکن

''کتاب'' قرآن پاک میں ہر اس کتاب کا نام نہیں جس کو کوئی قوم اپنی الہامی کتاب مانے، بلکہ اس کتاب کا نام ہے جس کے الہامی کتاب ہونے کی قرآن پاک نے خبر دی ہے اور وہ صرف توراۃ، زبور اور انجیل ہیں اور ان کتاب ..... والوں کی بھی عورتوں کا نکاح مسلمان مردوں سے جائز ہے۔ مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے درست نہیں اور ایسی قوموں کو جو اسلام سے پہلے کسی ایسی کتاب کی مدعی ہوں جس کی تصدیق قرآن پاک نے نہیں کی ہے۔ فقہاء نے شبہہ اہل کتاب کا خطاب دیا ہے۔ ان سے نکاح کسی طرح کا قطعاً ناجائز ہے۔ افسوس ہے کہ کمزور عقیدہ کا مسلمان آج اپنے کو اکثریت سے مغلوب پاکر اپنے بچاؤ کے لیے اپنے قتل نامہ پر اپنے ہاتھ سے دستخط کرنے کو تیار ہے۔

ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں انگریزوں کی پھیلائی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں اور اب بھی ہیں۔ (معارف، جون ۱۹۵۰ء)

ٹنڈن جی اور کانگریس کی صدارت

کانگریس کی صدارت میں ٹنڈن جی کی کامیابی کو فرقہ پرستوں نے اپنی فتح سمجھا اور بڑی

خوشیاں منائیں کہ اب کانگریس پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔قوم پرستوں کو تشویش پیدا ہوئی کہ دیکھیں فرقہ وارانہ مسائل میں کانگریس کی پالیسی پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے لیکن ہندوستان کی فلاح کا صرف ایک راستہ ہے، سیکلر حکومت، تمام فرقوں کے حقوق میں قانونی اور عملی یکسانیت، قومی اتحاد و یکجہتی اور پاکستان و ہندوستان کے تعلقات میں خوش گواری، اس کے علاوہ جو راستہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ ملک کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لے جائے۔اس لیے اگر ٹنڈن جی ملک کے سچے بہی خواہ ہیں تو ان کو بھی اپنا نقطہ نظر بدلنا پڑے گا۔

کانگریس کی صدارت کے بعد اگرچہ ان کا لب و لہجہ بدل چلا ہے اور ادھر انہوں نے جو تقریریں کی ہیں، ان میں وہ محض فرقہ پرست، مسلم آزار اور پراچین بھارت کے نمایندے نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان کی زبان سے غیر مذہبی حکومت مختلف فرقوں کے حقوق میں مساوات، مسلمانوں کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد کے الفاظ بھی نکلنے لگے ہیں، بلکہ بعض تقریروں میں تو اپنے محبوب مشن کلچر کے متعلق یہاں تک کہا ہے کہ "ہندوستانی کلچر ہندو مسلمانوں نے مل کر بنایا ہے اور ان کا اور ان کے وطن الٰہ آباد کے مسلمانوں کا کلچر ایک ہے"، اگر وہ بھی اس کو مانتے ہیں تو پھر ان کے اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں کوئی اختلاف نہیں رہ جاتا، مسلمان بھی یہی کہتے ہیں کہ ہندوستانی کلچر وہی ہے جو ہندو مسلمانوں کے میل جول سے بنا ہے اور جس میں دونوں کے اثرات ہیں اور اسی کو ہندوستان کا مشترک کلچر ہونا چاہیے، لیکن ٹنڈن جی کی زبان سے ہندو کلچر کا نعرہ بھی نکل جاتا ہے اس نعرہ کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی اپیل بے معنی ہے، اگر وہ حقیقتاً اتحاد چاہتے ہیں تو یہ نعرہ چھوڑ دینا چاہیے۔اتحاد کے معنی ہندوؤں میں ضم ہو جانے کے نہیں ہیں۔اس کے بغیر بھی اتحاد ہو سکتا ہے، اور ہو کر رہے گا۔ٹنڈن جی کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ مسلمان ہندوستان ہی میں رہیں گے اور پورے اتحاد قومی کے ساتھ اپنا مستقل وجود بھی قائم رکھیں گے۔

ٹنڈن جی کو ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت کی قیادت سپرد کی گئی ہے۔انہیں اپنے کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہیے اور اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔کانگریس تمام فرقوں کی نمایندہ جماعت کہی جاتی ہے اور مسلمان اب بھی ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔اس کے علاوہ صدارت کی کامیابی میں ٹنڈن جی کو مسلمانوں کے ووٹوں سے بھی مدد ملی ہے۔اس لیے ان کی نمایندگی بھی کرنا ان کا قانونی اور اخلاقی فرض ہے۔غلط نقطہ نظر ہمیشہ نہیں چل سکتا یا اس کو صحیح کرنا ہو گا یا

ملک کوتباہی کے حوالہ کرنا ہوگا۔ٹنڈن جی کے محب وطن ہونے میں شبہہ نہیں،اس لیے کیا عجب ہے کہ صدارت کی ذمہ داری ان کے خیالات کی تصحیح کردے۔حق وصداقت میں بڑی طاقت ہے،اگر ہمت و جرأت سے مقابلہ کیا جائے تو باطل اس کو مغلوب نہیں کرسکتا اور بالآخر فتح حق ہی کی ہوگی۔ ناسک کانگریس کے فیصلے اس کے شاہد ہیں۔ٹنڈن جی کو بھی ان فیصلوں کی پابندی کا عملی ثبوت دینا چاہیے۔

گائے اور زبان کے بارہ میں بھی ان کے خیالات میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہندی کے حکومت کی زبان ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اردو کومٹا دیا جائے۔اس کے بعد بھی ملکی زبان کی حیثیت سے اس کو زندہ رہنے کا حق ہے۔اس لیے اگر ٹنڈن جی اردو دشمنی چھوڑ دیں تو ان کا کیا حرج ہے۔گائے کی اقتصادی اہمیت سے انکار نہیں، ہندوستان ایک زرعی ملک ہے، یہاں گائے کی نسل کو ترقی دینے کی ضرورت ہے،اسی بنا پر اس کو قدیم ہندوستان میں مذہبی تقدس کا درجہ دیا گیا تھا لیکن اس اہمیت کو اس کی حد کے اندر رکھنا چاہیے۔اس کو ملکی مفاد پر ترجیح نہ دینا چاہیے۔ایک طرف ٹنڈن جی کی عقل پرستی کا یہ حال ہے کہ وہ اس ترقی کے دور میں الہامی اور مذہبی کتابوں کی ہدایات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، دوسری طرف ان کی قدامت پرستی یہ ہے کہ گائے کے تقدس کو ٹھیس لگانا گوارا نہیں اور اس کے لیے وہ ربڑ اور کرمچ کے جوتے اور نواڑ کے بستر بند استعمال کرنے اور کروروں روپے کا اقتصادی نقصان برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔اپنی ذات کے لیے وہ اس سے بھی زیادہ سادگی اختیار کرسکتے ہیں۔ربڑ کے جوتے کے بجائے لکڑی کی کھڑاویں، رسی کے بستر بند اور کھاردے کے تھیلے استعمال کریں،لیکن ملکی بلکہ فوجی ضروریات کو تو وہ گائے کے لیے قربان نہیں کرسکتے،کیا فوجی سپاہیوں کو بھی وہ ربڑ اور کینوس کے جوتے پہنا کر،ان کی کمر میں نواڑ کی پٹیاں باندھ کر میدان جنگ میں بھیجیں گے۔ان کے اسلحہ سوت کی ڈوری سے کسے اور کینوس کے تھیلوں میں رکھے جائیں گے۔ان کے گھوڑوں کی لگامیں،رسی کی چارجامے نمدے کے اور ساز نواڑ کا ہوگا۔یہ فوج کیا ہوگی عجوبہ روزگار ہوگی۔اس کے علاوہ چمڑا تو ضروریات زندگی میں ہے اور اس زمانہ میں تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے، ہزاروں لاکھوں بوڑھے بیل اور ناکارہ گائیں کہاں جائیں گی۔ان کے چارہ کا کیا انتظام ہوگا۔رہے مسلمان تو وہ خود ہی گاؤکشی چھوڑ چکے ہیں،اس لیے اب ٹنڈن جی کو ان کے بجائے ہندوؤں کو روکنا چاہیے جو بوڑھی گائیں قصابوں کے ہاتھ خفیہ بیچ دیتے ہیں۔ (معارف،اکتوبر ۱۹۵۰ء)

مولانا عبدالماجد دریابدیؒ

علوم وفنون کی ترقی کا بڑا ذریعہ اہل علم وادب کی قدردانی

علوم وفنون کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ یہ بھی ہے کہ حکومت کی طرف سے مصنّفین واہل قلم کی قدردانی کی جائے۔ ان کی تصنیفات کی سرپرستی ہو اور انہیں گراں قدر وظائف دے کر معاش کی جانب سے مطمئن کر دیا جائے، مشرق میں ہمیشہ اس طریقہ پر عمل رہا ہے اور جمہوریت پسند وحریت دوست مغرب بھی اس دائرہ سے اب تک قدم باہر نہیں رکھ سکا ہے۔ انگلستان، فرانس، جرمنی ہر ملک میں کم وبیش یہ طریقہ اب تک جاری ہے، خود ہندوستان میں گورنمنٹ آج سے چالیس پچاس سال پیشتر اس اصول پر عامل تھی، مولانا نذیر احمد کی اکثر تصانیف اسی دور کی یادگار ہیں۔ آزاد وحالی کی بھی بعض تحریریں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن ایک عرصہ سے یہ مد غالباً سرکاری بجٹ (تقدمہ) سے نکال دی گئی۔ کیا اب گورنمنٹ کے نزدیک اردو کو اس کی ضرورت باقی نہیں، یا گورنمنٹ کے اہل حل وعقد اب اتنے جوہر شناس وعلم دوست نہیں رہے جتنے پیشتر تھے؟ اس قدر تو یقینی ہے کہ مولانا نذیر احمد کی مبادی الحکمہ پر جو تقریظات اس وقت کے ڈائریکٹر تعلیمات اور لفٹنٹ گورنر نے تحریر کی تھیں، ان کی توقع موجودہ اعلیٰ عہدے داروں سے ہرگز نہیں ہوسکتی۔

اسی زمانہ کے ایک خوش قسمت مصنف مولوی مظہر الحق مظہر ہیں، دلی کے باشندہ، پہلے شاید کسی اسکول میں ماسٹر تھے۔ پھر ایک رئیس کے اتالیق ہو گئے، ۱۸۷۰ء میں انہوں نے ایک کتاب مظہر المضامین کے نام سے ترجمہ وتالیف کی، جس میں یورپ کے علوم وفنون و دیگر حالات کے متعلق تیس متفرق مضامین ہیں۔ کتاب کی ضخامت چھوٹی تقطیع پر ڈیڑھ سو صفحہ کی ہے۔ نوعیت مضامین کا اندازہ عنوانات ذیل سے ہوسکتا ہے۔

(۱) غبارہ یا بیلون　　　(۲) خاصہ کہربائی یا الکٹرسٹی

(۳) آلات برقی (۴) مرکز العلوم کیمبرج یونیورسٹی

(۵) کتب خانہ ہائے یورپ (۶) مقیاس الرتح یا آلہ بیرومیٹر

(۷) قوس قزح (۸) بجلی اور رعد وغیرہ

کتاب معمولی درجہ کی تھی، لیکن حکومت کی سرپرستی اسے بھی حاصل ہوگئی۔ مصنف کو معقول صلہ ملا اور کتاب طبع ہوئی، اس کے دیباچہ میں مصنف صاحب اپنے ایک تذکرہ شعراء فارسی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''دو ہزار شاعروں کی پانچ برس میں تاریخ لکھی، جان کھپائی تلاش کی، منصف جانتے ہیں کہ فارسی شاعروں کی ایسی تاریخ کسی نے نہ لکھی تھی، مگر قسمت کی بات ہے اس کا کوئی خریدار نہ ہوا، ایک صندوق میں پڑی ہے، سچ تو یوں ہے کہ ردّی ہے۔ اگر خدا نے چاہا اور کچھ سرمایا بہم پہنچا تو خود ہی لکھوں گا، گورنمنٹ کو بھیجوں گا، اس کے سوا کون قدردان ہے''۔

کیا اس وقت بھی سی اہل قلم کو گورنمنٹ سے وہ حسن ظن ہے جس کا نمونہ فقرۂ زیر خط میں نظر آتا ہے۔

ضمناً اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت گورنمنٹ کا ارادہ یونیورسٹی کے قیام کا تھا۔ چنانچہ خود یہ کتاب بھی اسی سلسلہ میں لکھی گئی تھی۔ مصنف لکھتے ہیں کہ ہم لوگ،

''اپنی محسن سرکار کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ عنقریب، انہیں علوم کی یونیورسٹی بزبان اردو بھی مقرر ہونے والی ہے لیکن یہ کام کچھ آسان نہیں، بڑا بھاری ہے، مدت چاہیے جب ان علوم کی کتابوں کا ترجمہ ہو، اس خیال سے اپنے ہم وطنوں کی بہبود کے لیے اور اس نظر سے کہ یونیورسٹی مذکور کی اعانت ہو، احقر الخلائق.....الخ''۔

یہ عجیب لطیفہ ہے کہ جو خواب شمالی ہند میں ۱۸۷۰ء میں دیکھا گیا تھا اس کی تعبیر پچاس سال کے بعد دکن میں پوری ہوتی نظر آرہی ہے۔ (معارف، اپریل ۱۹۱۹ء)

تحفظ اردو

انجمن ترقی اردو سے یہ دوستانہ گلہ ہمیں ہمیشہ رہا اور اب بھی ہے کہ وہ ''تحفظ'' اردو کے متعلق

کوشش نہیں کرتی، اردو میں اعلیٰ مطبوعات کی تالیف وترجمہ کی اہمیت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے لیکن اس کے بقا وقیام کی تدابیر اس کی ترقی کی تدابیر پر مقدم ہیں، اگر اردو کا وجود ہی نہ باقی رہا تو یہ کتابیں کس کے کام آئیں گی، یہ کام اگر اس کے فرائض میں داخل نہیں تو اس کے لیے ایک جداگانہ جماعت کو تیار ہونا چاہیے۔

کئی برس ہوئے کہ الہ آباد میں ایک انجمن ورنا کیولر سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کے مقاصد یہ بیان کیے گئے تھے کہ سائنس کے مختلف مسائل پر ہندی اور اردو میں سلیس وعام فہم رسالے شائع ہوا کریں گے اور اسی نوعیت کے عنوانات پر دونوں زبانوں میں لکچروں کا سلسلہ بھی قائم رہے گا، سوسائٹی مذکور کا صیغہ ہندی زندہ اور تندرست ہے، اس کے اعمال حیات کا تذکرہ اکثر اخبارات میں آتا رہتا ہے لیکن صیغہ اردو چند روزہ زندگی کے بعد صرف ایک رسالہ مفتاح الفنون شائع کرکے مردہ ہوگیا اور شاید یہی نتیجہ ہونا بھی چاہیے تھا۔ (معارف، جون ۱۹۱۹ء)

ملک کی مشترکہ زبان ہندی یا اردو

اپریل کے تیسرے ہفتہ میں ہندی کانفرنس کے دو بڑے جلسے منعقد ہوئے، ایک ممالک متوسط کی صوبہ دار ہندی کانفرنس کا جلسہ کھنڈوا میں اور دوسرا آل انڈیا ہندی کانفرنس کا بمبئی میں، پنڈت مالوی جی کی زیر صدارت، اخبارات کی روایت ہے کہ دونوں جلسوں میں مسلمانوں نے بھی شرکت کرکے اس تجویز کی تائید کی کہ ملک کی عام ومشترک زبان ہندی ہونی چاہیے، بعض اخبارات کو اس خبر پر یقین نہیں آتا لیکن اگر جامع مسجد دہلی کے منبر پر پنڈت...... وعظ فرما سکتے ہیں تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ مولوی...... ''ہندی پرچار'' پر ''اپدیش'' دیں، بچے جب جھنجھلاتے ہیں تو اپنے کھلونے توڑ ڈالتے ہیں یا اپنے کپڑے پھاڑنے لگتے ہیں، مسلمان بھی اس وقت اگر گورنمنٹ سے جھنجھلا کر اپنی قومی ہستی کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں تو انہیں دنیا کی کوئی قوت نہیں روک سکتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کے مقابلہ میں ہندی کی ترویج وتعلیم ملکی ولسانی حیثیت سے بھی سخت مضر وقابل اعتراض ہے، ہندی اس عہد کی پیداوار ہے جو ہندوؤں کے تمدن سے بھی قبل تھا اور جس کی ترکیب وسرشت میں صرف ہندو تمدن کا اثر پڑا ہے، وہ بھی ایک معمولی حد تک، بخلاف اس کے اردو عرب وعجم، ہند ویونان، ایران و ترکستان کے تمدنوں کا عطر ہے اور اس لیے قدرتی طور پر بمقابلہ ہندی کے بدرجہا بہتر آلۂ تعلیم ہوسکتی

ہے۔(معارف، جون ۱۹۱۹ء)

دارالمصنّفین اور معارف کا انگریز اخبارات میں تذکرہ

دارالمصنّفین و معارف سے اپنی بساط کے مطابق بری یا بھلی جو کچھ خدمت بھی علم و زبان کی بن پڑتی ہے، اس کا ذکر انگریزی صحائف میں ایک سے زائد بار آچکا ہے۔ ۱۶/جون کے لیڈر (الٰہ آباد) کے علاوہ کرانیکل (بمبئی)، نیو انڈیا (مدراس) وغیرہ میں بھی حوصلہ افزا نوٹ نکل چکے ہیں۔ ان معاصرین کے حسن ظن کا شکریہ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو معیار پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے بھی کچھ نہ ہوسکا۔(معارف، جولائی ۱۹۱۹ء)

اردو کی ترقی واحیاء

اردو کی ترقی واحیاء کے سلسلہ میں سب سے پہلے عملی دست گیری سرکار دکن نے کی کہ اس کی ایک مخصوص یونیورسٹی قائم کردی، غنیمت ہے کہ حکومت ہند کی یونیورسٹیاں بھی اب اردو کا درجہ کسی قدر پہچاننے لگی ہیں، کلکتہ یونیورسٹی کا قدم ترقی و روشن خیالی کے میدان میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں سے آگے ہے، اس نے حال میں اپنے نصاب تعلیم میں ورنا کیولرز (ملکی زبانوں) کو بھی داخل کیا ہے اور ان میں ایک ملکی زبان اردو کو بھی قرار دیا ہے، دیکھنا ہے کہ الٰہ آباد یونیورسٹی جو اردو کے مرکز میں قائم ہے، اس اصلاح سے کب اور کس حد تک متاثر ہوتی ہے۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کے ماتحت ابتدائی مدارس میں اردو کا جو نصاب داخل ہے، ان میں بعض کتابوں کی زبان اس درجہ ناقص ہے کہ مشکل سے کوئی صفحہ فاحش اغلاط سے خالی ملے گا اور بدقسمتی سے جو بچے اردو زبان لیتے ہیں، وہ ان ہی کتابوں کے پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں، انگریز افسران سررشتۂ تعلیم سے اس کی چنداں شکایت نہیں، اصلی شکوہ مسلمان اراکین سینٹ سے ہے، جو اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ یقیناً اس صریح ظلم کے روکنے میں معین ہوسکتے تھے، ان کی خدمت میں بہ ادب واجب عرض ہے کہ یونیورسٹی کی فیلوشپ محض رسوخ وحکام رسی کا ذریعہ نہیں، بلکہ اپنے ساتھ کچھ فرائض بھی رکھتی ہے، اگر انہیں اپنے فرائض کا احساس نہیں تو بہتر ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنی جگہوں سے ہٹ جائیں کہ میدان اغیار کے لیے بالکل خالی ہوجائے اور جو حشر اردو کا کل ہونا ہے، وہ آج ہی ہوجائے:

کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کرلوں

(شبلیؒ)

تاریخ میں کم از کم یہ تو نہ لکھا جائے گا کہ اردو کو جس وقت جام زہر پلایا جارہا تھا، اس وقت ساقی گری کی خدمت بعض وہ اصحاب بھی انجام دے رہے تھے، جو اپنے تئیں اس کا پرستار کہتے تھے۔

(معارف، جولائی ۱۹۱۹ء)

اختلاف آرا

اختلاف آراء ہر تعلیمی مجلس وانجمن میں ہوتا رہتا ہے، ہندو یونیورسٹی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، اس کے ارکان میں باہم اختلاف ہے اور نہایت شدید اختلاف ہے، ماڈرن ریویو، لیڈر، نیوانڈیا وغیرہ کے صفحات ان کی باہمی زور آزمائیوں کے مدت سے تماشا گاہ بنے ہوئے ہیں لیکن بااین ہمہ اختلاف وتخالف ان کی نظر اصل کار سے نہیں ہٹتی، ریل میں اکثر مسافر جگہ کے لیے ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں لیکن اپنی منزل مقصود کو کوئی نہیں بھول جاتا، یہ شرف صرف موجودہ مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے کہ وہ جس کشتی پر سوار ہوتے ہیں، آپس میں لڑ جھگڑ کر خود اسی کے غرق کرنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں۔ (معارف، اگست ۱۹۱۹ء)

لالہ لاجپت رائے کی مسلمانوں سے اپیل

لالہ لاجپت رائے اس فرقہ (آریہ سماج) کے ایک ممتاز رکن ہیں جو مسلمانوں سے عداوت رکھنے میں ضرب المثل ہے اور خود لالہ صاحب کی زندگی میں بھی آج سے پیشتر مسلمانوں کے ساتھ دوستی و ہمدردی کی شاید کوئی نظیر نہ مل سکے لیکن مغرب کا جو طرز عمل مسلمانوں کے ساتھ ہے، اس سے لالہ صاحب تک متاثر ہوئے اور وہ بہ کمال منت والحاح مسلمانان ہند سے اپیل کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں اپنا وجود قائم رکھنا ہے تو امریکہ میں فوراً اپنے کچھ نمایندے بھیجنا چاہیے، لالہ صاحب کی اس عنایت وہمدردی کا خلوص قلب سے شکریہ لیکن کیا خود مسلمان اس کے مستحق ہیں کہ کوئی ان کے ساتھ ہمدردی کرے؟ جو قوم خود اپنی مدد نہیں کرتی اس کی مدد دوسرے انسان تو کیا خدا بھی نہیں کرتا، جو قوم خود مدتوں حکومت کے آغوش شفقت میں حرکت کرتی رہی اور اب ہمسایہ اقوام کے لیے باردوش ہورہی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس تمام فعل وحرکت کو ''اپنی'' حرکت سمجھتی ہے، وہ کبھی بھی اپنے پیروں

پر کھڑی ہوسکتی ہے؟ کشمکش حیات میں اسے اپنی ہستی قائم رکھنے کا کچھ بھی حق ہے؟ بیچارگی و بے کسی کی انتہائی صورت یہ ہوتی ہے کہ دشمن کو بھی رحم آجائے، یہ مرتبہ ''قوم'' کو اب حاصل ہو گیا ہے۔
(معارف اکتوبر ۱۹۱۹ء)

ندوۃ العلماء کا جلسہ

امسال ایسٹر کی تعطیل میں ندوۃ العلماء کا جلسہ صوبہ بہار کے مشہور شہر گیا میں ہوگا۔ اس جلسہ کے ساتھ طلبائے قدیم ندوہ کا جلسہ بھی اسی شہر میں منعقد ہوگا۔ طلبائے ندوہ کی ایک کثیر تعداد خود اس صوبہ میں موجود ہے، اس لیے توقع ہے کہ یہ جلسہ غیر معمولی طور پر کامیاب ہوگا اور طلبہ و ندوہ دونوں کے متعلق اس جلسہ میں مفید تجاویز پیش ہوں گی، یقین ہے کہ ندوہ کے جو قدیم طلبہ اس صوبہ سے باہر مقیم ہیں وہ بھی شریک ہو کر جلسہ کی عظمت و شان میں اضافہ کریں گے۔ (معارف، فروری ۱۹۲۰ء)

کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کا صیغہ

کلکتہ یونیورسٹی تمام مسلمانوں کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے اپنے ہاں نہ صرف ''علوم اسلامیہ'' کا ایک مستقل مضمون رکھا ہے بلکہ ''انڈین ورنا کیولرز'' (ہندوستان کی موجودہ زبانوں) کے تحت میں بنگالی، مرہٹی، آڑیہ، ہندی، گجراتی، ٹامل، ٹیلیگو، آسامی، کناڈی، سنگھالی وغیرہ کے پہلو میں ملک کی عام و مشترک ''زبان'' اردو کو بھی جگہ دے دی ہے، اردو کا صیغہ ڈاکٹر عبداللہ مامون سہروردی کے تحت میں ہے، مگر دیکھنا ہے کہ اس میں کتنے طلبہ شریک ہوتے ہیں، ہمارے ذہن سے یہ اندیشہ دور نہیں کہ ممکن ہے یونیورسٹی مذکور کی کسی آئندہ رپورٹ میں یہ اطلاع درج ہو کہ یہ صیغہ بوجہ کافی تعداد میں طلبہ نہ ملنے کے بند کر دیا گیا ہے، اصلاً اردو پر جتنا حق مسلمانوں کا ہے، شاید اس سے کسی قدر زائد ہی ہندوؤں کا ہو لیکن پچیس تیس سال سے جو صورت حال پیدا ہے، اس نے اگر اردو کے تحفظ و بقا کو مسلمانوں کی زندگی کے ساتھ وابستہ کر دیا ہو تو اس سے کسی فرقہ کو رنجش کی کوئی وجہ نہیں۔

کلکتہ یونیورسٹی کی اس نظیر سے فائدہ اٹھا کر کیا یہ دریافت کرنا بے موقع ہوگا کہ جو یونیورسٹی اردو کے اصل وطن (صوبۂ متحدہ) میں قائم ہے، کیا اس پر اردو کا اتنا بھی حق نہیں، الہ آباد یونیورسٹی کی از سر نو ترتیب و تنظیم ہو رہی ہے، لکھنؤ یونیورسٹی عدم سے وجود میں آرہی ہے لیکن صوبہ کی زبانوں پر توجہ کرنا شاید سرکاری و غیر سرکاری ''ماہرین تعلیم'' کے رتبہ سے فروتر ہے۔ (معارف، اپریل ۱۹۲۰ء)

وفد خلافت

مولانا سید سلیمان ندوی ایڈیٹر رسالہ ہٰذا جس وقت سے یورپ روانہ ہوئے ہیں، ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ خدمت قوم وملت میں گزر رہا ہے اور مقاصد وفد کی تبلیغ واشاعت سے وہ جس قدر بھی وقت نکال سکتے ہیں، وہ کتب خانوں کی سیر، مستشرقین سے ملاقات ومراسلت ودیگر علمی مشاغل میں صرف ہوتا ہے، انڈیا آفس کا کتب خانہ انھوں نے پہنچتے ہی دیکھا اور امید ہے کہ اس وقت تک لندن میوزیم اور آکسفورڈ وکیمبرج کے تمام مشہور کتب خانوں کی زیارت کر چکے ہوں، ۳۰/ مارچ کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی جدید عمارت کے افتتاح کا جلسہ تھا، اس میں وہ شریک ہوئے اور پروفیسر اسٹوری وڈاکٹر آرنلڈ وغیرہ سے ملاقاتیں کر چکے ہیں، مسئلہ خلافت کا حشر جو کچھ بھی ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علمی حیثیت سے مولانا کا یہ سفر بہرصورت نہایت مفید ونتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

موصوف کے دلچسپ و پر معلومات مکاتیب جو ہر ہفتہ وصول ہوتے رہتے ہیں، لکھنؤ کے مشہور روزنامہ ہمدم کو اشاعت کے لیے دے دیے جاتے ہیں اور یکم اپریل سے برابر ان کی اشاعت کا سلسلہ اس میں جاری ہے، اس سلسلہ میں ان کے وہ خطوط (مع ان کے جوابات کے) قابل دید ہیں، انھوں نے پروفیسر براؤن (کیمبرج) پروفیسر مارگولس (آکسفورڈ) کے نام عربی زبان میں تحریر فرمائے تھے، ان کا ترجمہ ہمدم میں نکل چکا ہے، اگر ناظرین معارف کی خواہش ہو تو ان کی اصل آئندہ نمبر میں پیش کی جاسکتی ہے۔

وفد خلافت کو جب وزیر ہند کے ہاں باریابی ہوئی تو کچھ دیر انڈیا کونسل ہال میں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑا، یہ وہی کمرہ ہے جہاں وزارت ہند نشست کرتی ہے اور جہاں سے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ صادر ہوتا رہتا ہے، اس ایوان عالی کے میز پر کاغذ دبانے کے لیے پیتل کے چند موٹے پتر (پیپرویٹ) مع ایک چھوٹے دستہ کے رکھے ہوئے تھے، مولانا سید سلیمان کی نکتہ رس نگاہ نے دیکھا کہ ان پر فارسی اور اردو کے اشعار کندہ ہیں، جو ان کی عنایت سے ادبیات کے زیر عنوان ناظرین معارف کے پیش کش ہیں، فارسی اشعار زیادہ تر سعدی کے ہیں اور ہر شعر میں بادشاہ کو عدل ورعایا پروری کی تعلیم دی گئی ہے، پرنس غلام حسین آف میسور غدر سے تیس سال سے پیش تر ۱۸۵۴ء میں انھیں تحفۃً پیش کیا تھا، کیا عجب کہ یہ دربار میسور کی آخری یادگاریں ہوں۔

اس میں تو شبہ نہیں کہ پیتل کی یہ بے زبان مورتیں ہر نئے فیصلہ کے وقت اپنا خاموش فرض موعظت ادا کرتی ہوں گی، البتہ اگر وزرائے ہند ان مواعظ پر کان رکھنے کے خوگر ہوتے تو ہندوستان کی تاریخ کس قدر مختلف ہوتی۔ (معارف، مئی ۱۹۲۰ء)

دارالمصنّفین ندوۃ العلماء سے الگ مستقل وجود

صوبجات متحدہ کی پچھلی تعلیمی سالانہ رپورٹ (بابت ۱۸ء و۱۹ء) میں دارالمصنّفین کی خدمات کا بھی تذکرہ ہے اور انہیں کافی سراہا گیا ہے، سیرۃ نبویؐ، ارض القرآن، سیر الصحابہ، مبادی و مکالمات برکلے، ان میں سے ہر شے سے متعلق حوصلہ افزائی کی گئی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ سارا تذکرہ ندوۃ العلماء کے کارناموں کے ذیل میں کیا گیا ہے اور سیاق عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا یہ سب کام ندوہ کی ماتحتی میں انجام پارہے ہیں، اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، یہ سچ ہے کہ دارالمصنّفین کے اکثر کارکن ندوہ ہی کے تربیت یافتہ ہیں، ندوہ کے فضائل و مناقب بھی بجائے خود مسلم ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دارالمصنّفین ندوہ کی شاخ یا کسی حیثیت سے بھی دست نگر ہے، درحقیقت دارالمصنّفین اپنا مستقل وجود، اپنا مستقل نظام، اپنا مستقل نصب العین ندوہ سے بالکل الگ رکھتا ہے اور برا یا بھلا جو کچھ بھی کام اب تک اس سے بن پڑا ہے، اس کا تنہا وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔ (معارف، مئی ۱۹۲۰ء)

اردو کا رسم الخط اور انجمن ترقی اردو کی خدمات

کسی زبان یا رسم الخط کی ترقی ہرگز دوسروں کے لیے موجب رشک وحسد نہیں ہوسکتی لیکن اسی ملک میں ایک زبان اردو بھی ہے جس کے بعض خصوصیات لسانی ہندی سے مختلف ہیں اور جس کا رسم الخط تو اس سے بالکل ہی علاحدہ ہے اور جس کے متعلق اس کے ہمدردوں کا یہ دعویٰ یہ تھا کہ وہ ملک کی عام ومشترک زبان ہے، سنتے ہیں کہ اس زبان کی حمایت، تحفظ وترقی کے لیے ملک میں متعدد انجمنیں قائم ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مشہور نام انجمن ترقی اردو کا ہے، جس کی سالانہ رپورٹ بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا اس انجمن نے اردو کی توسیع وترویج کا کچھ بھی فرض ادا کیا، اردو کی تعلیم کے لیے اس نے کوئی ایک درس گاہ بھی کھولی؟ کسی ایک غیر اردو داں نے بھی اس کی کوششوں سے متاثر ہوکر اردو سیکھی؟ اردو کی ترویج واشاعت کے لیے اس نے ایک بھی

مشنری تیار کیا؟ انجمن کے موجودہ سکریٹری اپنی ذات سے اردو کے لیے بے شبہ ایک حقیقی خدمت گزار ہیں لیکن یہ سوالات ان کی شخصیت سے متعلق نہیں انجمن سے ہیں۔ (معارف، مئی ۱۹۲۰ء)

مسلم یونیورسٹی کی تجویز

ہندو یونیورسٹی کی تحریک ۱۹۱۱ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۱۵ء میں یونیورسٹی قائم ہوگئی، میسور یونیورسٹی کا تخیل ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۱۶ء سے باضابطہ تعلیم شروع ہوگئی، پٹنہ یونیورسٹی کی تجویز کل ہوئی اور آج عمل ہونے لگا، ڈھاکہ یونیورسٹی کا نقشہ چند سال ادھر تیار ہوا اور اس وقت تک مسودہ قانون منظور ہو چکا، لکھنؤ یونیورسٹی کا خواب شب کو دیکھا تھا اور صبح ہوتے ہیں اس کی تعبیر پوری ہونے لگی ہے، غرض اس دس برس کے عرصہ میں متعدد سرکاری وغیر سرکاری یونیورسٹیاں عدم محض سے وجود میں آچکی ہیں لیکن اس شرف مخصوص میں مسلم یونیورسٹی کا کوئی شریک نہیں کہ گو اس کی تجویز سب سے قدیم تر ہے گو اس کا وجود سب سے زیادہ ضروری ہے اور گو اس خیر مقدم انتہائی جوش وخروش کے ساتھ ہوا تھا، تاہم عملی حیثیت سے آج بھی یہ تحریک ٹھیک اسی جگہ پر ہے، جہاں ہمیشہ تھی، دوسروں کو اگر اپنی حرکت ورفتار عمل پر ناز ہے تو ہوا کرے، ہمیں اس فخر سے کون محروم کرسکتا ہے کہ جمود وسکون میں ہمارا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

حاشا اس سے یہ مقصود نہیں کہ حکومت جن شرائط پر یونیورسٹی دے رہی تھی، ان ہی کو منظور کرلینا چاہیے یا خواہ مخواہ اپنی یونیورسٹی کو سرکاری ہی رکھنا چاہیے لیکن آخر کوئی قدم تو آگے بڑھنا چاہیے، آزادانہ وخوددارانہ شرائط پر خواہش حصول یونیورسٹی کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ اسے آڑ بنا کر دست وپا شکستہ اشخاص کی طرح اپنے تئیں بالکل معطل بنالیا جائے، دوسرے قافلے جو ہم سے کہیں بعد کو روانہ ہوئے تھے، وہ ہماری آنکھوں کے سامنے پوری تیز روی کے ساتھ گزرتے ہوئے چلے گئے لیکن آج تک:

ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے

بغداد ودمشق، قرطبہ وغرناطہ کو علمی مراکز بنانے والے اسلاف نے کیا ساری دماغ سوزی وجگر کاوی اس لیے کی تھی کہ اپنے اخلاف کو ہمیشہ کے لیے علمی وتعلیمی جدوجہد کے فرض سے سبک دوش کرجائیں؟ (معارف، جولائی ۱۹۲۰ء)

اردو کے ساتھ الہ آباد یونیورسٹی کا برتاؤ

کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے ہاں (پوسٹ گریجویٹ کلاسیز) بی، اے، پاس طلبہ کے لیے السنہ حالیہ کا جو نصاب درس رکھا ہے، اس میں اردو کئی سال سے داخل ہے، حال میں بمبئی یونیورسٹی نے بھی اپنے ہاں بی، اے اور ایم، اے، کی جماعتوں میں اپنے مضمون اردو زبان کا رکھا طے کیا ہے اور منتہی طلبہ کے ایک اردو لکچرار کا تقرر منظور کیا ہے، پنجاب یونیورسٹی سالہا سال سے جو خدمت اردو زبان وادب سے متعلق انجام دے رہی ہے، اس کا اعتراف بھی سب پر واجب ہے اور تو اور مدراس یونیورسٹی تک اردو کی جانب سے بے التفات نہیں، البتہ سرکاری یونیورسٹیوں میں اگر کسی کا طرز عمل اردو سے متعلق سرد مہری وبے اعتنائی کا مجسمہ ہے تو وہ الہ آباد یونیورسٹی ہے، جو اردو کے اصل مرکز میں واقع ہے، اس کا کتب خانہ اردو کتابوں سے یکسر خالی ہے، اس کے اعلیٰ نصاب درس میں اردو کی کوئی گنجائش نہیں، اس کی فہرست اساتذہ میں اردو کی تعلیم کے لیے کسی ہستی کا وجود نہیں، اس کے خزانہ عامرہ میں اردو ارباب قلم کی اعانت کی کوئی مد نہیں، اس کا نظام امتحانات اردو کے عنوان سے ناآشنا ہے، اس کی تاریخ اردو کی قدردانی کے ذکر سے خاموش ہے اور اس کا نظام کار اردو کے واجبی حقوق کے اعتراف سے نامانوس ہے، جو خطہ اردو زبان کا سب سے بڑا مرکز ہے، جہاں کے بچہ بچہ کی مادری زبان اردو ہے، جس کے حلقہ میں لکھنؤ، آگرہ، فیض آباد شامل ہیں، کیا اس خطہ کے خدایان تعلیم کا اپنے صوبہ کی زبان کے ساتھ یہی برتاؤ ہونا چاہیے تھا؟ دنیا کی تعلیمی تاریخ میں یہ واقعہ آپ اپنی نظیر رہے گا۔ (معارف، جولائی ۱۹۲۰ء)

لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز

خیر الہ آباد یونیورسٹی نے تو اس معاملہ میں اپنے فرائض کو جس قدر یاد رکھا اور جیسی کچھ داد دیانت دی ہے، اس کا فیصلہ تاریخ پر چھوڑا جاسکتا ہے لیکن کیا لکھنؤ یونیورسٹی میں یہ ظلم روا رکھا جائے گا؟ اردو زبان کا حق تو یہ ہے کہ اب اسے لکھنؤ یونیورسٹی میں بطور آلۂ تعلیم کے رکھا جائے اور جملہ علوم وفنون کی تعلیم بجائے انگریزی کے اردو ہی کے ذریعہ سے ہو لیکن اس تجویز پر عمل درآمد اگر سردست محال ہے تو کم ازکم اتنا تو بہرحال ہونا چاہیے کہ اردو کو عربی، سنسکرت وفارسی کی طرح یونیورسٹی کے نصاب السنہ میں جگہ دی جائے، اردو زبان اپنے موجودہ سرمایۂ ادب کے لحاظ سے ہرگز اس سے زیادہ مفلس

نہیں جتنی انگریزی زبان آکسفورڈ، کیمبرج یونیورسٹیوں کے قیام کے وقت تھی، جس زبان میں میر و درد، غالب و مومن، انیس و دبیر، اکبر و اقبال، سرسید و چراغ علی، آزاد و نذیر احمد، حالی و شبلی کے پایہ کے شعراء و مصنّفین پیدا ہو چکے ہوں اور جس کے خزانۂ ادب میں عربی و فارسی، سنسکرت و انگریزی کے بہترین جواہر ریزے منتقل ہو چکے ہوں، اسے لٹریچر کے اعلیٰ اصناف سے محروم سمجھنا خود اپنی ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۲۰ء)

اردو کو ناگری رسم الخط میں
تبدیل کرنے کی گاندھی جی کی تجویز

گاندھی صاحب کے حسب ہدایت اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے ہندی سمّیلن کے زیر نگرانی مدراس میں جو کوششیں ہندی زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے دو برس سے جاری ہیں، وہ ایک بڑی حد تک بارآور ہو چکی ہیں اور اس مشن کو پانچ سال تک اور جاری رکھنے کے لیے حال میں بمبئی کے مارواڑیوں نے پچاس ہزار کا سرمایہ بھی فراہم کر دیا ہے، مسٹر گاندھی ہی فرماتے ہیں کہ زبان تو ہندی و اردو دونوں ایک ہی ہیں، فرق صرف رسم الخط کا ہے اور انہیں توقع ہے کہ مسلمان ایک بڑی آبادی کی سہولت کے خیال سے اپنے اوپر تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے ناگری رسم الخط بہ مسرت تمام سیکھ لیں گے، گاندھی صاحب کا خلوص نیت قطعاً ہر قسم کے شک و شبہ سے ارفع ہے لیکن ان کے اس مشورہ پر مسلمان غالب کی زبان میں صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں:

عشق و مزدوری عشرت گہِ خسرو کیا خرب — ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

(معارف، جولائی ۱۹۲۰ء)

یورپ اور ہندوستان میں
قرآن کے مستند انگریزی ترجموں کی ضرورت

مسلمان اپنے مذہب سے جس شغف کا اظہار کرتے ہیں، اس کا تقاضا یہ تھا کہ یورپ میں تبلیغ اسلام کے لیے یورپین زبانوں میں قرآن مجید کے متعدد تراجم مستند و ذی علم مسلمان ارباب قلم کی طرف سے شائع ہو چکے ہوتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک کسی مغربی زبان میں ایک بھی صحیح ترجمۂ قرآن موجود نہیں، انگریزی میں متعدد تراجم سیل، پامر، رادوَل وغیرہ یورپین اشخاص کے

موجود ہیں لیکن انہیں دیکھ کر یورپ کی عربی دانی سے حیرت کے ساتھ بدگمانی ہوتی ہے، تعصب و عداوت کی رنگ آمیزیوں سے قطع نظر کر کے قرآن کی معمولی عبارتوں کے سمجھنے میں ان حضرات سے جو حیرت انگیز غلطیاں واقع ہوئی ہیں، ان کا اندازہ بغیر اس کے ہونا ناممکن ہے کہ ان ترجموں کو قرآن کے پہلو بہ پہلو رکھ کر پڑھا جائے، آکسفورڈ و کیمبرج کے علمائے شرقیات کی یہ غلطیاں اکثر اس درجہ کی ہیں جو مبتدی عربی خوانوں سے بھی نہیں ہوسکتیں، مولوی محمد علی (احمدی) ایم، اے کا انگریزی ترجمہ بعض حیثیات سے نسبتاً بہت بہتر ہے، پھر بھی سوء تفہم کی بہ کثرت مثالوں سے خالی نہیں لیکن آج کس میں اتنی ہمت ہے جو مسلمانوں کو ''ضروری'' و ''اہم'' مشاغل سے ہٹا کر اس ضرورت کی جانب متوجہ کر سکے؟

مستند انگریزی ترجمۂ قرآن کی جس قدر ضرورت یورپ میں تبلیغ اسلام کے لیے ہے، اسی قدر خود ہندوستان کے ان علاقوں میں ہے جہاں مادری زبان اردو نہیں، ان آبادیوں تک پیام حق پہنچانے کا بہترین ذریعہ یہ تھا کہ بنگالی، مرہٹی، گجراتی، ہندی، تامل، تیلگوئی وغیرہ ہندوستان کی ہر زبان میں اس کا صحیح ترجمہ موجود ہوتا لیکن اگر سر دست یہ ممکن نہیں تو اس مقصد کو ایک حد تک انگریزی ترجمہ کی مدد سے پورا کیا جاسکتا ہے لیکن موجودہ صورت میں غیر عربی داں وغیرہ اردو داں قوموں کو چار و ناچار انگریزی کے غلط و ناقص تراجم ہی پر اعتماد کرنا ہوتا ہے اور رقیب کے ذریعہ سے پیام رسانی کے جو نتائج ہوسکتے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں۔ (معارف، جولائی ۱۹۲۰ء)

مسلم آؤٹ لک کا اجراء

مغرب کو مشرق سے جو بیگانگی و مغایرت قائم ہے، اس میں تنہا ''انہیں'' کا قصور نہیں بلکہ ہماری خطا بھی شامل ہے، حکمراں و فاتح اقوام سے یہ توقع رکھنا کہ وہ محکوم و مغلوب اقوام کی اصلی زندگی سے صحیح واقفیت پیدا کریں گی، سرشت انسانی کے متعلق ایک ناقابل عمل خوش ظنی قائم کرنا ہے، دراصل یہ فرض ہمارا تھا کہ ہم اپنے علوم وفنون، تہذیب و تمدن، افکار و خیالات، جذبات و معتقدات کے ایک ایک جز سے انہیں آگاہ کرتے اور جن آنکھوں پر نخوت و رعونت، امارت و حکومت کے پردے پڑے ہوئے ہیں، ان کے یہ حجابات دور کرنے کی اپنے ہاتھوں سے بار بار کوشش کرتے لیکن افسوس ہے کہ ارشاد و ہدایت، تبلیغ و دعوت کے اس مقدس فرض سے برابر غفلت برتی جارہی ہے

اور یہ اسی کا خمیازہ ہے جو آج مختلف مصائب کی شکل میں تمام عالم اسلامی پر نازل ہو رہا ہے، تاہم غنیمت ہے کہ ہجوم مصائب مسلمانان ہند میں اس ضرورت کا کچھ احساس پیدا کر چلا ہے، چنانچہ کچھ عرصہ سے لندن سے جو ہفتہ وار پرچہ مسلم آؤٹ لک نکلنا شروع ہوا ہے، وہ اسی احساس کا عملی نتیجہ ہے، مسلمانوں کی جو ضروریات ہیں ان کے لحاظ سے اگرچہ یہ پرچہ بالکل ناکافی ہے، پھر بھی کچھ نہ ہونے سے اس کا ہونا بہر حال بہتر ہے، وفد خلافت کی کارگزاریاں، دشمنان خلافت کی سرگرمیاں، ٹرکی کے متعلق عام معلومات کا اندراج اور ان پر تبصرہ اس کا خاص موضوع ہے اور یہ مقصد اس وقت یہ کامیابی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ (معارف، ستمبر ۱۹۲۰ء)

ترک موالات

''ترک موالات'' کی تحریک چند ماہ سے بڑی سرگرمی کے ساتھ ہو رہی ہے اور بعض حلقوں میں اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے، اس کے سیاسی پہلوؤں پر گفتگو کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن اصولی حیثیت سے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اب تک اس کا جو پروگرام (نقشۂ عمل) ملک کے سامنے پیش کیا گیا ہے، وہ بہت ہی سطحی اور سرسری ہے، اصل یہ ہے کہ خالص مادی وسیاسی ذرائع سے ہمارے اصلاح حال کی جتنی کوششیں ہوں گی، بالآخر سب ناکام ثابت ہوں گی، حقیقی ضرورت اس کی ہے کہ نسخۂ اصلاح میں روحانی و اخلاقی اجزاء کی آمیزش کافی تعداد میں رکھی جائے، گاندھی صاحب کی مقدس شخصیت سے توقع تھی کہ وہ اس اہم نکتہ کو ضرور ملحوظ رکھیں گے لیکن حیرت وحسرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس باب میں ان کی ذات بھی مایوس کن ثابت ہوئی، خطابات کی واپسی، اعزازات سے دست برداری، ملازمت سے استعفیٰ وغیرہ مراتب مجوزہ سے سیاسی فوائد جو کچھ بھی حاصل ہوں لیکن ان میں سے کوئی شے ہمارے درد کا درماں نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ اس اندرونی زندگی کی اصلاح نہ ہو، جو اب تک تمام مفاسد کی اصل و بنیاد رہی ہے، زخم کو اوپر سے خشک کرنے کی کوشش قطعاً بے سود رہے گی، جب تک اندر سے اس کا اندمال نہ ہو اور مادۂ فاسد دفع ہو کر مزاج اپنی طبعی حالت پر نہ آجاوے۔

دست بردار ضرور ہونا چاہیے مگر کس شے سے؟ حب جاہ اور خواہش نام و نمود سے، ترک یقیناً کرنا چاہیے؟ مگر کیا چیز؟ کذب وناراستی، مکر وریاکاری، استعفیٰ قطعاً داخل کرنا چاہیے مگر کس چیز

سے؟ زر پرستی وطمع دنیوی سے، تائب ضرور ہونا چاہیے مگر کس شے سے؟ نفس پرستی اور جذبات کی غلامی سے، درحقیقت واپسی کے قابل محض کسی مخصوص قوم کی دی ہوئی مخصوص عزت نہیں بلکہ نفس مغربی تمدن ہے اور اس کے پھیلائے ہوئے امراض اخلاقی وروحانی، مثلاً نخوت ورعونت، حرص وطمع، زرپرستی وزن مریدی، نفاق اور ڈپلومیسی، اسراف ونمائش، شقاوت وبے دردی، آوارگی وعصمت فروشی، مےنوشی وقماربازی اورخودغرضی وخود پرستی، حق پرستوں کی زبان پر یہ شکوہ نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے قبضہ سے فلاں فلاں ملک نکالا جارہا ہے بلکہ ماتم اس کا ہونا چاہیے کہ ہمارے اخلاق وعقائد، ہماری عصمت وشرافت، ہماری خودداری وخداترسی، ہماری قناعت ودیانت، ہمارا صبر واستقلال، ہمارا خلوص وایثار اور ہماری للّٰہیت وروحانیت ہم سے رخصت ہوئی جاری ہے، یہی ہونکتہ ہے جسے لسان العصر حضرت اکبر اپنی زبان میں یوں ادا کرتے ہیں:

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم دلوں کو طاعت حق سے یہ دور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

غلط فہمی نہ ہونا چاہیے، یہ جو کچھ کہا گیا، اس سے ''ترک موالات'' کے مجوزہ نقشۂ عمل کی مخالفت ہرگز مقصود نہیں اور نہ ہمیں اس تجویز سے نفیاً یا اثباتاً کوئی سروکار ہے، البتہ اپنے ضمیر اور اپنی بصیرت کے مطابق جو صورت اصلاح قوم کے لیے بہتر معلوم ہوئی، اس کی جانب متوجہ کردیا گیا، زمانہ خود اس کا فیصلہ کردے گا کہ آخر فوز وفلاح کی بہترین صورت کیا ہے؟ آیا مادیت وظاہر پرستی کی وہ راہ جس پر یورپ وامریکہ اور ان کی تقلید میں ایشیا کے یہی مصلحین ورہبران قوم عموماً چل رہے ہیں یا اصلاح باطن، تزکیۂ نفس وصفائے روح کا وہ مسلک جس کی ہدایت جملہ انبیائے کرام، جملہ بانیان مذاہب، جملہ عارفان حق اور جملہ ائمۂ اخلاق شروع سے آج تک کرتے آئے ہیں۔

(معارف، ستمبر ۱۹۲۰ء)

مسلم یونیورسٹی کی علوم اسلامیہ پر توجہ

مقام مسرت ہے کہ علی گڑھ کی ''مسلم'' یونیورسٹی کو بھی ''علوم اسلامیہ'' پر توجہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، جناب صاحب زادہ صاحب نے اسلامیات سے متعلق ایک خاکہ تجاویز شائع فرمادیا ہے، جس کے ساتھ ڈاکٹر اقبال کا تبصرہ بھی شامل ہے، یہ دونوں اصل تحریریں بجائے اردو کے

انگریزی میں تھیں اور علی گڑھ کی انجمن اردو کے رسالہ سہیل میں ان کا ٹھیٹھ اور لفظی ترجمہ شائع ہوا ہے، اس موقع پر قدرۃً سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ''مسلم'' یونیورسٹی کی سرکاری زبان انگریزی ہے؟ کیا یہ امر اب بھی باعث شرف وافتخار ہے کہ ایک ''مسلم'' یونیورسٹی کے ذمہ دار ارکان اس کے شعبۂ اسلامیات سے متعلق اظہار خیال انگریزی میں کریں؟ کی اردو کی ہمہ گیری کے دعویٰ کی عملی تردید اور حقوق اردو کے ساتھ بے التفاتی کی عملی تعلیم خود وہیں سے ہوتی رہے گی جسے مرکز اردو ہونے کا دعویٰ ہے؟ اس سے زیادہ تاسف انگیز یہ امر ہے کہ وائس چانسلر صاحب کے مراسلہ کی بنیاد جن تجویزوں پر ہے وہ ہندوستان کے کسی عالم کی پیش کی ہوئی نہیں بلکہ یورپ کے دو ''مستشرقین'' کی پیش کی ہوئی ہیں، کیا ہندوستان کے سارے طول وعرض میں جامعہ عثمانیہ، ندوہ، دیوبند اور خود علی گڑھ میں کوئی ایک فرد بھی اس قابل نہ تھا جس کے مشوروں پر خاکہ نصاب اسلامیات کی بنیاد قائم ہوتی، سرٹامس آرنلڈ جس حد تک اسلامیات کے ماہر خصوصی ہیں، اس کے اندازہ کے لیے ان مقالات کا مطالعہ کافی ہے جو خود ان کے قلم سے یا ان کی نگرانی میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں شائع ہوئے ہیں، کیا علمائے ہند کا معیار علم اس سے بھی گیا گزرا ہوا ہے؟ عماد الملک واقبال، شرروشیروانی، کاملین سلف کے مقابلہ میں ہیچ سہی لیکن کیا آرنلڈ کے مقابلہ میں بھی اپنے ہاں کی چیزوں سے بے خبر ہیں؟

لاکھ نادان ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے (معارف، جولائی ۱۹۲۶ء)

جامعہ ملیہ کی اشاعت

رسالہ جامعہ نے حال میں ضمناً یہ اعلان کیا ہے کہ اب جامعہ ملیہ کسی سیاسی انجمن (یعنی خلافت کمیٹی) کے ماتحت وزیر اثر ونظر نہیں بلکہ ایک مستقل وآزاد خالص تعلیمی ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس مستند اعلان کے بعد جامعہ کی اعانت سیاسی وغیر سیاسی، ان تمام اشخاص پر فرض ہو جاتی ہیں جو قومی و آزادانہ تعلیم سے ذوق رکھتے ہیں، کہا گیا ہے کہ اب تک جامعہ کا سارا بار خلافت کمیٹی ہی کے ممبران اور ہمدردوں پر تھا اور ملک میں جس قدر تحریک خلافت سرد ہوتی گئی، اسی نسبت سے جامعہ کی مالی حالت بھی گرتی گئی لیکن اب جب کہ جامعہ نے اپنی ''خود مختاری'' کا اعلان کر دیا ہے ''تماشائے اہل کرم'' کے دیکھنے کا پورا موقع ہے اور سرکاری ملازموں، سرکاری توسل رکھنے والوں، امیروں، زمیں داروں، تعلق داروں اور والیان ملک کی ہمتوں کے امتحان کا وقت ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۲۶ء)

مولانا عبدالسلام ندوی

ندوہ وجامعہ میں طلبہ کی تعداد

ندوہ میں طلبہ کی تعداد ہمیشہ کم رہی لیکن ہم کو کبھی اس کا افسوس نہیں ہوا کیونکہ ہم نے حماسہ کے مشہور فخریہ قصیدے میں پہلے ہی دن اس مصرع کو پڑھ کر ازبر کرلیا تھا ''**فقلت لها ان الکرام قلیل**'' آج جامعہ ملیہ بھی طلبہ سے خالی ہوتی جاتی ہے، لیکن ہم کو اس کا کچھ افسوس نہیں، البتہ ان قلیل طلبہ کے لیے کثیر مصارف کے ساتھ بہترین تعلیم وتربیت کا انتظام ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ (معارف، جنوری ۱۹۲۵ء)

ندوہ کا سالانہ جلسہ

ندوہ کی بنیاد جن اغراض ومقاصد کے لیے پڑی تھی، زمانہ ان کی اہمیت وضرورت کا روز بروز اعتراف کرتا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور عربی وانگریزی دونوں مدارس اس کی تحریک سے متاثر ہوئے اور حدود ہند سے گذر کر اس کا اثر دوسرے ممالک اسلامیہ تک پہنچا۔ نصاب درس میں ترمیم کی ضرورت کو اکثروں نے تسلیم کیا، طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی حاجت بہتوں نے محسوس کی، مسلمانوں کی باہمی فرقہ آرائیوں کے دور کرنے کی اہمیت کا سب کو اعتراف ہے، لیکن افسوس ہے کہ خود ندوہ، جو فضا کی اس تبدیلی واصلاح کا باعث خاص ہوا ہے، اب تک قوم کی طرف سے وہ التفات واعانت نہ حاصل کرسکا، جس کا وہ مستحق تھا، مدرسہ ودارالاقامت کی عمارتیں اب تک نامکمل ہیں، مسجد اس وقت تک تعمیر نہ ہوسکی، کتب خانہ ابھی تک خاطر خواہ وسعت نہ حاصل کرسکا۔ انتہا یہ ہے کہ ندوہ کا جلسہ سالانہ، جو اسلامی ہند کی علمی ومذہبی زندگی کا ایک خاص مظہر ہوتا تھا، وہ بھی کئی سال سے منعقد نہ ہوسکا۔

قوم کے جمود وبے التفاتی کا شکوہ کرنا مقصود نہیں، نہ اس وقت اس کے اسباب وموجبات پر بحث کرنا ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ کئی سال کے وقفہ کے بعد اب کی مرتبہ مارچ کے دوسرے ہفتہ

میں ندوہ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہونا قرار پایا ہے۔نواب صدر یار جنگ بہادر، جن کو نیاز مندان قدیم مولانا محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام سے پہچانتے ہیں اور جو ندوہ کے نہایت قدیم و مشہور کارکن ہیں، اجلاس کی صدارت فرمائیں گے۔ یہ اجتماع کئی سال کے بعد ہو رہا ہے اور اپنی گونا گوں خصوصیات کے لحاظ سے خاص طور پر اہم ہوگا۔امید ہے کہ تمام بہی خواہان علوم مشرقیہ و ہمدردان اسلام اس موقع پر کثیر تعداد میں شرکت فرمائیں گے اور ایک بار سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے کہ اگر دارالعلوم ندوہ کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے تو آیا اس کے اسباب زندگی بھی مہیا کرنے کی حاجت ہے یا نہیں؟
(معارف،فروری ۱۹۲۵ء)

مسلم یونیورسٹی میں وایسرائے بہادر کی آمد

ماہ گذشتہ میں وایسرائے بہادر نے بڑے تزک احتشام اور شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دو گھنٹہ کے لیے قدم رنجہ فرمایا۔ارکان یونیورسٹی کے طرف سے مراسم استقبال میں دل کھول کر سرمایہ صرف کیا گیا اور کورٹ کی جانب سے وائس چانسلر نے جذبات خلوص و نیاز سے لبریز سپاس نامہ (ایڈرس) پیش کیا، اب جبکہ اس ورود مبارک کا واقعہ ختم ہو چکا ہے اور اس کے نتائج کے لیے کوئی انتظار باقی نہیں، کیا ارکان یونیورسٹی کی خدمت میں یہ سوال پیش کیا جاسکتا ہے کہ وائسرائے بہادر کے ورود سے کیا کیا فوائد اخلاقی یا مادی کسی قسم کے ظہور پذیر ہوئے؟ کیا جو عظیم الشان سرمایہ مراسم استقبال پر صرف کیا گیا تھا، اس کا معاوضہ کسی صورت سے بھی حاصل ہوا؟ ہر ہائنس سرکا عالیہ بھوپال ایک لاکھ بیس ہزار کے گراں قدر عطیہ کا تذکرہ اس موقع پر کرنا بامحل نہ ہوگا، بیگم صاحبہ ممدوحہ کی حاتمانہ فیاضی کا یہ پہلا مظہر نہیں اور وہ نہ کسی خارجی تحریک کی محتاج ہے۔سوال صرف وائسرائے بہادر کے نتیجہ ورود سے متعلق ہے، کاش ہمارے برادران علی گڑھ گذشتہ تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور اب بھی سمجھیں کہ جس قربان گاہ پر وہ اپنی خودداری، عزت، غیرت، سب کچھ نثار کر رہے ہیں، اس کا دینی و دنیوی، اخلاقی و مادی، کوئی بھی معاوضہ ادھر سے حاصل ہو رہا ہے! مومن کی شان تو حدیث نبوی میں وارد ہوئی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔(معارف،فروری ۱۹۲۵ء)

ندوۃ العلماء کا جلسہ انبالہ اور لڑکیوں کا حق وراثت

لڑکیوں کو حق وراثت دلانے کی تجویز ندوۃ العلماء کے جلسۂ انبالہ میں منظور ہوئی تھی، اس

کے متعلق فروری کے معارف میں یہ مژدہ سنایا گیا تھا کہ کچھی میمن برادری کے آدھے آدمیوں نے قانون اسلامی کو قبول کرلیا ہے اور باقی آدھے آدمیوں میں بھی کام ہورہا ہے لیکن جن لوگوں نے اس قانون کو قبول کرلیا ہے ان کا طرز عمل کیا ہے؟ اس کے متعلق روزنامہ خلافت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا یہ اقتباس نہایت افسوس کے ساتھ پڑھا جائے گا:

> واحسرتا علی العباد گندم نما جوفروشوں کا کیا علاج ہے جو ایک طرف وصیت نامہ کے فارم پر دستخط کرکے اسلامی قانون وراثت پر چلنے کا عہد کرتے ہیں۔ دنیا کے طعن وتشنیع سے جوش میں آکر دستخط کردیتے ہیں، مگر دوسری طرف اپنے گھر میں اپنی جائداد لڑکوں کے نام منتقل کردیتے ہیں اور مرنے سے پہلے ہی حقیقی ورثاء کی محرومی کا سامان کردیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ صرف طنز وتشنیع یا فوری جوش سے مدتوں کی آبائی رسم ورواج کا قلع وقمع نہیں ہوسکتا، میمن قوم کے متعلق اس سے پہلے بھی اس سے زیادہ سخت طنز آمیز الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ چنانچہ بمبئی ہائی کورٹ کے ایک انگریز جج نے اپنے ایک فیصلہ میں لکھا تھا کہ

کچھی میمن زندہ رہتے ہیں تب تک مسلمان رہتے ہیں مرنے پر ہندو بن جاتے ہیں کیونکہ ان کا ورثہ ہندو دھرم شاستر کے موافق تقسیم ہوتا ہے۔

مروجہ طریقوں پر عام انجمنوں اور مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماعی جلسوں میں اس کے متعلق تجویزیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ بہ کثرت رسالے بھی شائع کیے جاسکتے ہیں لیکن جب تک خود اس قوم کے اندر ایسے متعدد مصلحین نہ پیدا ہوجائیں جو شب وروز اسی کام میں مصروف رہیں اور بکثرت اشخاص کو آمادہ کرکے عملی نمونے قائم نہ کرائیں یہ تمام کوششیں بے سود رہیں گی۔ ایک مدت کا بگڑا ہوا نظام ایک مدت ہی کے بعد پھر از سرنو قائم ہوسکتا ہے۔

اس شرعی حکم کی علانیہ خلاف ورزی کے ساتھ ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کا اثر مسلمانوں کے تحفظ جائداد پر کیا پڑتا ہے؟ یہ مسلم ہے کہ مرد بہت زیادہ آزاد ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی جائدادیں زیادہ تر انہی کے ہاتھوں تلف ہوتی ہیں، کچھی میمن برادری میں اس ہندوانہ رسم کی وجہ سے تمام جائداد صرف لڑکوں کو ملتی ہے اور ان کے متعلق پونہ کے ایک مصلح سیٹھ لکھتے ہیں کہ

''لڑکے وغیرہ وارث بنتے ہیں مگر اکثر عیاشی، قمار بازی، سٹہ، گھوڑ دوڑ میں دولت برباد کرتے ہیں''۔

اگر یہ سچ ہے تو علماء کے ساتھ قوم کے دنیا دار طبقہ کو بھی اس رسم کے مٹانے کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔

آسام میں
مدارس اسلامیہ کی تنظیم و اصلاح کی ضرورت

مدارس اسلامیہ کی تنظیم و اصلاح کی ضرورت اگرچہ تمام ہندوستان میں ہے لیکن بنگال و آسام میں یہ ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ ان صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی اور صوبوں سے بہت زیادہ ہے، مدارس بھی بکثرت موجود ہیں اور طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد اسلامی علوم وفنون کی تحصیل میں مصروف ہے لیکن ان میں موجودہ ضروریات وحالات کے مطابق کوئی ایسا دل و دماغ نہیں پیدا ہوتا، جس پر ان صوبوں کو فخر حاصل ہو۔

خدا کا شکر ہے کہ خود اہل بنگال کو اس تعلیمی ابتری کا احساس ہوگیا ہے اور انہوں نے تنظیم و اصلاح کی ضرورت کو محسوس کرلیا ہے۔ چنانچہ گذشتہ ماہ مارچ کے وسط میں جمعیۃ علمائے ہند کا جو سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوا اس کے سلسلے میں بصدارت مولانا محمد ادریس صاحب علمائے بنگال و آسام کے ڈیلیگیٹیوں کا ایک جلسہ بتاریخ ۱۳/ مارچ ایک جامعہ اسلامیہ کے قائم کرنے کے لیے منعقد ہوا اور ابتدائی کاموں کے انجام دینے کے لیے ایک کمیٹی قائم ہوئی۔ ۱۵/ مارچ کو جمعیۃ علماء کے بنگال کی مجلس منتظمہ کے سامنے جلسہ مذکور کی قرارداد پیش ہوئی، چونکہ جمعیۃ نے خود ۱۵/ اگست ۱۹۲۵ء میں ایک جلسہ میں جامعہ کے قیام اور جملہ مدارس اسلامیہ کی تنظیم کے لیے ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ اس لیے اس نے اس اجتماع کی قرارداد کو پیش نظر رکھ کر ابتدائی انتظامی امور کے انجام دینے کے لیے اس کمیٹی میں مزید ممبروں کو شامل کرلیا۔

حال میں اس کمیٹی کے چند اراکین نے جامعہ کے متعلق چند اساسی اصول وضوابط کا خاکہ تیار کر کے جملہ ممبران کمیٹی و دیگر اہل الرائے کی خدمت میں پیش کیا ہے اور ۵/ مئی ۱۹۲۶ء تک ان سے رائیں طلب کی ہیں اور ان رایوں کے آنے کے بعد ۹/ مئی ۱۹۲۶ء کو کلکتہ میں ایک جلسہ منعقد

ہوگا، جس میں سب کمیٹی کے تمام ارکان سے اس خاکہ کی منظوری حاصل کی جائے گی۔

اس خاکہ میں تعلیم کی مدت سولہ سال رکھی گئی ہے اور چار درجے (دنیا، وسطیٰ، علیا، تکمیل و خطاب) قائم کیے گئے ہیں، جو موجودہ زمانہ میں جن علوم وفنون کی ضرورت ہے سب پر حاوی ہیں۔ درجہ وسطی میں انگریزی، فارسی، سنسکرت اور پالی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کا اختیار کرنا طلبہ کے لیے لازمی ہوگا اور علوم وفنون میں ادب، حساب، تاریخ، جغرافیہ، ابتدائی منطق، حکمت جدیدہ، فقہ، ابتدائی عقائد، ابتدائی حدیث، کلام اللہ با ترجمہ، تحریر، تقریر، ورزش، نقاشی کی تعلیم ہوگی اور بعض پیشے بھی سکھائے جائیں گے۔ مثلاً سینا، بننا، طب، دباغی وغیرہ اور اس طرح ایسے علماء پیدا ہوسکیں گے جو اپنے کسب معاش میں قوم کی اعانت کے محتاج نہ ہوں گے۔

درجہ علیا میں بھی یہ اختیاری زبانیں تدریجی ترقی کے ساتھ جاری رہیں گی اور علوم وفنون میں قرآن باترجمہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، کلام جدید، ادب، تاریخ، منطق وحکمت، جدید علم الاقتصاد کی تعلیم دی جائے گی۔ درجہ تکمیل وخطاب میں حسب ذیل علوم وفنون میں سے صرف ایک فن کی تکمیل کرنی ہوگی

(۱) حدیث وتفسیر (۲) فقہ واصول فقہ وکلام (۳) ادب عربی، فارسی، اردو، بنگلہ، انگریزی، سنسکرت، پالی میں سے کسی ایک زبان کی تکمیل (۵) عیسائی مذہب کی کتابوں کا مطالعہ (۶) ہندو مذہب کی کتابوں کا مطالعہ (۷) بدھ مذہب کی کتابوں کا مطالعہ (۸) تاریخ۔

ہمارے نزدیک اگرچہ مدت تعلیم زیادہ ہے تاہم اگر بنگالی طلبہ نے صبر واستقلال کے ساتھ اس مدت کو پورا کرلیا تو یقین ہے کہ وہ قوم کی تمام مذہبی واصلاحی ضروریات کو پورا کرسکیں گے۔

ہندوستان میں اس وقت جو علمی کام ہورہے ہیں وہ زیادہ تر صرف ترجمہ وتصنیف تک محدود ہیں۔ لیکن یورپ اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں ان دونوں کاموں کے ساتھ ایک اہم علمی خدمت یہ بھی خیال کی جاتی ہے کہ قدیم اور نایاب کتابیں جو اب تک غیر مطبوع ہیں ان کے متعدد نسخے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے جائیں اور ان کی تصحیح ومطابقت کی جائے اس کے بعد ان کو طبع کر کے شائع کیا جائے۔

ہندوستان اب تک اس حیثیت سے اور تمام ممالک سے بہت پیچھے ہے۔ صرف دائرۃ المعارف حیدرآباد ایک ایسا علمی مرکز ہے، جو اس خدمت کو نہایت مستعدی کے ساتھ انجام دے رہا

ہے، اس لیے اس کی حوصلہ افزائی ہر اہل علم کا فرض ہے۔

دائرۃ المعارف کی اس علمی خدمت کا ذکر معارف میں بار بار آتا رہتا ہے۔ حال میں اس نے امام رازی کی مشہور کتاب مباحث مشرقیہ کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے اس کی قیمت..... رہے اور سنن بیہقی کی تصحیح ہورہی ہے اور اس غرض سے اس کے متعدد نسخے تلاش کیے جارہے ہیں، اب تک صرف دو نسخے فراہم ہوسکے ہیں، لیکن مزید نسخوں کی ضرورت ہے، اس لیے اگر کوئی صاحب اس کا قلمی نسخہ عنایت فرمائیں گے تو طباعت کے بعد ان کی خدمت میں سنن بیہقی کا ایک نسخہ ہدیۃً روانہ کیا جائے گا۔ ہم کو امید ہے کہ اہل علم اس طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے۔

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور بات یاد آگئی ہے، کتابوں کی طبع و اشاعت سے الگ، اس وقت اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ہندوستان میں کس قدر علمی ذخیرہ موجود ہے، تو ہمارے پاس اس کا کوئی ذریعہ نہیں، بعض مشہور کتب خانوں کی فہرستیں بے شبہہ شائع ہوچکی ہیں لیکن ان کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی بہ کثرت چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ کتب خانے موجود ہیں جن میں بعض نہایت نادر قلمی کتابیں موجود ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہم ان سے ناواقف ہیں، کیونکہ ان سے واقفیت حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

غالباً محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے اس غرض سے ایک شخص کا تقرر کرنا چاہا تھا جو ملک میں دورہ کر کے اس قسم کے تمام پرائیویٹ کتب خانوں کی فہرست مرتب کرے لیکن اس سے زیادہ اس کی آسان صورت یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس اس قسم کے کتب خانے موجود ہوں وہ خود ان کی فہرست مرتب کر کے شائع کردیں، ممکن ہے کہ بعض لوگ اپنے مختصر کتب خانوں کو اس قابل نہ سمجھتے ہوں، لیکن دنیا کی بہترین کتابیں صرف ایک الماری میں آسکتی ہیں۔ اگر ان لوگوں کے پاس زیادہ کتابیں نہیں ہیں تو اس سے ان کے کتب خانے کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ شاید انہیں کے مختصر کتب خانوں میں اس الماری کی کوئی کتاب موجود ہو، اس لیے ان کو اس کی فہرست کے شائع کرنے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ (معارف، مئی ۱۹۲۶ء)

ندوہ اور مسلم یونیورسٹی

ہندوستان میں علوم قدیمہ و علوم جدیدہ کی جو درسگاہیں قائم ہیں۔ ان میں گونہ اختلاف یا

کم از کم اتحاد نہ تھا، ندوہ درمیانی کڑی بن کر دونوں کو ایک شیرازہ میں منسلک کرنا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کو ایک مدت تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی، بلکہ وہ خود ایک تیسرا فریق بن گیا لیکن اب جب کہ ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے اپنی علمی قابلیت اور قومی خدمت کی بدولت ملک میں اپنا عام اعتماد قائم کرلیا ہے اور موجودہ یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ کی تکمیل کی طرف توجہ مبذول کی جانے لگی ہے، دونوں قسم کی درس گاہوں میں اتحاد کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ چنانچہ صاحب زادہ آفتاب احمد خان نے سہیل میں علوم اسلامیہ کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جس کے اخیر میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

> اس قسم کی استعداد ہماری درس گاہوں میں اس اعلیٰ پیمانے پر حاصل نہیں کی جاتی جو لکھنؤ اور دیوبند کے مدارس میں حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا تجویز یہ ہے کہ کوئی صورت ایسی نکالی جائے جس سے وہ بہترین پیداوار جو لکھنؤ اور دیوبند سے نکلتی ہیں کسی طور پر بروئے کار لائی جاسکیں، مثلاً دیوبند اور ندوہ کے طلبہ جو عربی ادب والسنہ اور علوم مشرقی میں اچھی استعداد رکھتے ہیں، اگر ان میں سے قابل ترین افراد کو موقع دیا جائے کہ وہ ہماری درس گاہوں اور جدید تعلیمات وتحقیقات کے ماحول میں رہ کر تعلیم حاصل کرسکیں اور اس کے لیے ہماری یونیورسٹی سامان وسہولت فراہم کرے تو اس کا نتیجہ نہایت طمانیت بخش ہوگا، جواب تک میسر نہیں آسکا ہے بہرحال دیوبند اور ندوہ اور اس قسم کی تمام دیگر درس گاہیں اس یونیورسٹی کے مانند قوم ہی کی ہیں ان مختلف درس گاہوں کا اتحاد اور اشتراک عمل جہاں تک کہ مختلف حالات اور واقعات کے ماتحت ان کا امکان ہے، ظاہر ہے ہر طور پر پسندیدہ اور قابل آزمائش ہے۔

دیوبند کا حال ہم کو معلوم نہیں لیکن ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ میں ایک بڑی تعداد ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہوکر انگریزی زبان کی تکمیل کرچکی ہے، اور ایک بڑی تعداد انگریزی کی تعلیم میں مصروف ہے، اگر مسلم یونیورسٹی نے ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے اس قسم کی آسانیاں پیدا کیں جس سے وہ آزادی کے ساتھ اپنی تعلیم کی تکمیل کرسکے، تو ہم کو یقین ہے کہ طلبائے ندوہ کی ایک بڑی تعداد اس سہولت سے فائدہ اٹھائے گی اور اس طور پر نہ صرف ہمارے قدیم وجدید درس گاہوں میں اتحاد ہوگا بلکہ مشرقی ومغربی علوم کی سرحدیں بھی باہم مل جائیں گی۔ (معارف، جون ۱۹۲۶ء)

مولانا سید نجیب اشرف ندویؒ

ہندوؤں اور مسلمانوں کے طریقۂ کار میں فرق

ہندوؤں اور مسلمانوں کے طریقۂ کار اور خصوصیات فطرت کا پتہ ان کی تحریکوں کے نتائج سے لگتا ہے، مسلمان اپنے کام کو شروع ہی کرتے وقت اپنی تمام قوت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے سارے وسائل بیک دفعہ صرف کر دیتے ہیں اور پھر چند ہی روز کی دل چسپی میں اپنی محنت کا ثمرہ نہ پا کر بددل ہو جاتے ہیں اور پھر ان کا وہ کام صرف اثری و تاریخی دلچسپی کی ایک چیز ہو کر رہ جاتا ہے لیکن ہندو جو کام شروع کرتے ہیں، اس میں وہ اپنی قوت، اپنے اسباب اور اپنے ذرائع کو مختلف مدارج کے لیے منقسم کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ اس کے نتیجہ کا انتظار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد اس کا نتیجہ ایک مکمل عمارت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کے بعد اس کی تازہ مثال بنارس کی ہندی پر چارنی سبھا کا وہ ضخیم لغت ہے جو تقریباً ۲۱ رسال کی مسلسل کوشش کے بعد مرتب ہوا ہے، اس کا نام شبد ساگر یا بحر الالفاظ ہے، اس میں تقریباً ۹۵ ر ہزار الفاظ ہیں اور اس کی ترتیب پر ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے، اس رقم میں صوبۂ متحدہ، صوبہ بہار اور صوبہ متوسطہ کی حکومتوں کی رقوم کے علاوہ مختلف والیان ریاست کی بڑی بڑی رقمیں شامل ہیں، اس کے علاوہ اسی مجلس نے عدالتی اصطلاحات کا بھی ایک مکمل ہندی لغت مدون کیا ہے، قدیم ہندی تصانیف کی تلاش و جستجو اور ان کی اشاعت کا کام اس کے علاوہ ہے، پھر ہر صوبہ میں اس کی شاخیں ہندی کی ترویج میں جو خاموش کوششیں کر رہی ہیں اور اس کا جو اثر ہوگا وہ اہل بصیرت پر روشن ہے۔

دوسری طرف جامعہ بنارس ہے، جس نے اپنے یہاں فی الحال کم از کم انٹرمیڈیٹ تک

ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش شروع کردی ہے اوراس سلسلہ میں نصاب کی تمام کتابوں کے ترجمے ہوچکے ہیں اور بی،اے،کی کتابوں کے ترجمے کا خیال درپیش ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم دکن کی سرکار جامعہ کو جو یقینا ایک روشن خیال حکمراں کے تدبر کا بہترین مظہر ہے، الگ کریں تو مسلمان قوم نے جواردو کے اپنی مادری زبان ہونے کی دعوے دار ہے، اس سلسلہ میں کیا کیا ہے؟ ہم کو دوسروں پر اعتراض کرنے سے زیادہ خود اپنا راستہ بنانے کی ضرورت ہے، ہم کو دوسروں کی ترقی پر رشک یا ماتم کا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ ہمارا فرض اپنے زبانی دعووں کو عملی لباس پہنانا اوراپنی تحریکوں کو خلعت دوام بخشنا ہے۔

(معارف، مارچ ۱۹۲۹ء)

مولانا سید ریاست علی ندوی

ٹامل ترجمۂ قرآن کی طباعت واشاعت کی تجویز

عیسائی مبلغین کی مساعی سے انجیل کے لاکھوں نسخے ہندوستان کی اکثر زبانوں میں شائع ہوچکے ہیں، اس کے باوجود وہ اپنے تبلیغی مساعی کی طرف سے مطمئن نہیں اور انجیل کی مزید اشاعت پر ان کے مذہبی رسالوں میں زور دیا جارہا ہے، چنانچہ اس ماہ کے معارف میں بھی اس موضوع پر رسالہ مسلم ورلڈ (امریکہ) کے ایک مضمون کی تلخیص شریک اشاعت ہے۔

دوسری طرف اپنے تبلیغی کاموں کا جائزہ لیجیے، ترچنا پلی مدراس میں ۱۹۲۷ء میں قرآن مجید کے ایک ٹامل ترجمہ کا آغاز کیا گیا تھا، چنانچہ چند ابتدائی پاروں کا قابل اطمینان ترجمہ کرلیا گیا اور پہلا پارہ شائع بھی ہوگیا لیکن کس قدر حسرت انگیز واقعہ ہے کہ جب ایک مدراسی نومسلم عبدالرحمن صاحب نے لکھنؤ سے اس کے بعد کے پاروں کے لیے خط لکھا تو اس کے مترجم مولوی عبدالحمید باغوی نے جواب میں لکھا کہ انہیں چند سال کے انتظار کے بعد اس مبارک کام سے دست کش ہوجانا پڑا کہ پہلے پارہ کے ترجمہ کے مطبوعہ حصوں کا بڑا حصہ رکھا رہ گیا، نہ ایسے مسلمان ملے جو انہیں خریدتے اور نہ مدراس جیسے مسلمانوں کے متمول صوبہ میں کوئی ایسا صاحب ثروت کھڑا ہوا جو صرف اللہ کے لیے اس کے کلام کو چھپوا کر شائع کرسکے، مدراس کے مسلمان تجار توفیق الٰہی سے اپنی دولت کار خیر میں صرف کرتے رہے ہیں، کیا کوئی ایسا صاحب عزم ہوگا جو اپنے صوبہ کی زبان میں خدا کے کلام کو پہنچانے کا بیڑا اٹھالے کہ دیسی عیسائیوں کی بڑی تعداد وہاں آباد ہے، ان کی انجیل ہمارے گھروں میں موجود ہے، اگر ہم بھی اپنا قرآن ان تک پہنچائیں تو اپنے فرض سے سبک دوش ہوں گے۔ (معارف، جنوری ۱۹۳۶ء)

چوتھی ادبی کانفرنس کا اجلاس

اس سال ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ کی چوتھی ادبی کانفرنس کا اجلاس وسط ماہ جنوری میں الہ آباد میں منعقد ہوا، کانفرنس کا افتتاح ہندوستانی زبان کے محسن رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے کیا، اس کے بعد صوبہ بہار کے سابق ہوم ممبر مسٹر سچد انند سنہا نے کانفرنس کا صدارتی خطبہ اجنبی زبان انگریزی میں پڑھا اور اس کی توجیہ میں جو کچھ انہوں نے کہا اس میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ موصوف نے جنھوں نے کبھی بہار کونسل میں ہندی زبان کے پہلو بہ پہلو اردو زبان کو عدالتوں میں آزمائشی طور پر بھی رواج دینے کی سخت مخالفت کی تھی، اب اردو کو ہندی زبان کے ہم رتبہ تسلیم کرلیا ہے۔

اجلاس کے شعبۂ اردو کی صدارت مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے کی، موصوف نے اپنے خطبہ میں پچھلی صدی میں اردو کی ترقی کے چار اہم مرکز فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اور اورینٹل کالج لاہور کی خدمات کو سراہا، پھر خطبہ میں سرسید، مولانا حالی، نذیر احمد، آزاد اور شرر کا ذکر آیا ہے، اس کے بعد موصوف نے ملک کے موجودہ علمی اداروں کے ''اٹکل پچو'' کام کرنے پر افسوس کرکے اپنے عہد نظامت کی ترقی یافتہ انجمن ترقی اردو کے طریق کار کو پیش کرکے اصول کے ماتحت کام کرنے کا سلیقہ سکھایا ہے، اگر اردو کی پچھلی اور موجودہ ترقیوں کے ضمن میں ذکر نہیں آیا تو اس شخصیت کا جس نے اس قابل مثال انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی اور جسے اس کا ناظم اول مقرر کیا گیا اور اس کی وفات کے بعد بھی اس کی یادگار میں ایک مجلس اپنی بساط کے مطابق مصروف عمل ہے، شاید مولوی صاحب کی نظر میں یہ بھی وہی ادارہ ہو جس نے اب تک ''اٹکل پچو'' کام انجام دیے ہیں، شعبۂ اردو میں تقریباً ۱۵-۲۰ ممتاز اہل علم نے مختلف موضوعوں پر اپنے مضامین پڑھے، ان میں سے ''ہندوستان کی تربیت جدید میں اردو شاعری کا حصہ'' (جناب سیماب اکبرآبادی)، ''شاہ دولہ'' (جناب سید حسن برنی) ''دور سلطانی کے امراء'' (ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ)، اردو شاعری کے جدید انتخابات کی ضرورت'' (مولانا عبدالسلام ندوی)، ''اردو کا واعظ شاعر'' (مولانا عبدالماجد دریابادی)، ''اردو کے اعراب'' (مولوی نعیم الرحمٰن)، ''اردو قواعد'' (ڈاکٹر زبید احمد)، اور ''دکن کی اردو شاعری عہد آصفی میں'' (ڈاکٹر سید محی الدین قادری) وغیرہ مضامین قابل ذکر ہیں۔ (معارف، فروری ۱۹۳۶ء)

اسلامی محکمۂ قضاء کے قیام کا مسئلہ

آج سے اٹھارہ برس پہلے معارف بابتہ ماہ نومبر ۱۹۱۷ء میں مسلمانان ہند کے نظام شرعی کا ایک مفصل خاکہ پہلی مرتبہ پیش کیا گیا تھا، پھر ماحول کے لحاظ سے یہ تحریک اٹھائی گئی کہ اگر اسلامی محکمۂ قضا کا قیام دشوار ہو تو برطانوی ہند کے مسلمان حکام کے ذریعہ یہ خدمت لی جائے اور مسائل نکاح و طلاق کے وہ اسلامی قوانین موجودہ قانون ملکی میں شامل کرلیے جائیں جو بدقسمتی سے موجود نہیں ہیں، اس کا کم سے کم یہ اثر مرتب ہوا کہ یوپی، کونسل کی مقرر کردہ مجلس نکاح وطلاق کی چند مجلسیں ہوئیں لیکن اس کا مرتب کردہ مسودہ قانون آج تک زیرغور ہے، پھر جب ایک غیر مسلم محرک کی تحریک سے نابالغوں کے نکاح کا مسودہ اسمبلی میں آیا تو معارف نے اس کی طرف ملک کو دوبارہ متوجہ کیا، خدا کے فضل سے اس وقت تک علمائے دین کی ایک کارفرما جماعت جمعیۃ العلماء قومی وملی مسائل کی نگہ بانی کے لیے تیار ہوچکی تھی، معارف نے نومبر ۱۹۲۸ء میں اس مقدس جماعت کو اس طرف متوجہ کیا، پھر دسمبر کے پرچہ میں ۱۹۱۷ء کی تحریک نظام شرعی کی تجدید کی اور پانچ چھ نمبروں میں ''مسلمان عورتوں کے حقوق کا مسئلہ'' کے عنوان سے اس کے مختلف پہلو نمایاں کیے، مقام مسرت ہے کہ اسی وقت سے مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار نے اس مسئلہ کو جمعیۃ العلماء کی توجہ کا خاص مرکز قرار دیا اور ان ہی ارباب فکر کی مساعی سے اسمبلی کے مسلمان اراکین نے اس ضرورت کا احساس کیا، چنانچہ جناب غلام بھیک صاحب نیرنگ اور جناب محمد احمد صاحب کاظمی نے کم سے کم مسلمان عورتوں کے حقوق فسخ نکاح کی حفاظت کے لیے ایک مسودۂ قانون اسمبلی میں بھیج کر وائسرائے کی ضابطہ کی منظوری حاصل کرلی۔

لیکن اتفاقاً اس ابتدائی مسودہ میں وہ روح موجود نہ تھی، جو کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کے شرعی نظام کا بدرجۂ اقل قائم مقام بن سکتی، اس لیے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے ایک جداگانہ مسودۂ قانون مرتب کرکے شائع کیا جس میں اس مسودہ کی خامیاں دور کردی گئیں اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جناب محمد احمد صاحب کاظمی نے خوش دلی سے اس نئے مسودہ کو قبول کرکے اسی کی بنیاد پر اسمبلی میں ایک دوسرا مسودہ تیار کرکے بھیج دیا اور اس کے بعد جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ نے بھی ۳؍فروری کو مرادآباد کے اجلاس میں اس مسودہ کی عملاً تصدیق کردی، اگرچہ اس نے غایت احتیاط

میں ایک مستقل مسودہ قانون مرتب کیا ہے، تاہم ہم نے جناب کاظمی کے ترمیم شدہ اور جمعیۃ العلماء کے مرتب کردہ دونوں مسودوں کا بامعان، لفظ بہ لفظ ملا کر دیکھا اور ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہمیں بجز ایک اصولی مسئلہ اور ایک دو جزوی بلکہ لفظی اختلاف کے لفظاً و معناً دونوں میں کوئی فرق نظر نہ آیا، اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ جناب کاظمی کے ترمیم شدہ مسودہ قانون کو جمعیۃ العلماء کی متفقہ حمایت حاصل ہوگئی ہے، **والحمد اللہ علیٰ ذٰلک**۔

مسلمانوں کو اس وقت سب سے بڑی ضرورت سر جوڑ کر کام کرنے ہی کی ہے، علماء و محرکین مسودہ میں صرف نکاح مرتدہ کے فسخ نہ ہونے کے مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن جناب کاظمی صاحب کے ایک تشریحی بیان سے اس اختلاف کا اندیشہ بھی جاتا رہا ہے کہ ان کے بیان کے مطابق ''چوں کہ مسودہ کو پیش ہوکر پاس ہونے میں ابھی عرصہ لگے گا اور اس میں مزید غور کی گنجائش ہے، اگر حضرات علماء نے متفقہ یا بہ کثرت اس کو نامنظور کردیا تو یہ دفعہ خارج ہوجائے گی''۔

چونکہ جمعیۃ العلماء نے اپنے مسودہ میں اپنے دفعہ کو حذف کردیا ہے، اس لیے اب اس دفعہ کے افادہ ونقصان کے پہلوؤں پر غور کرنا بے سود ہے، اسے تائید ایزدی سمجھنا چاہیے کہ ایسے مسائل میں جن میں بہ کثرت فرقہ وارانہ شاخسانے نکل سکتے تھے، رشتۂ اتفاق ہاتھ آگیا ہے، اس لیے ہمیں توقع ہے کہ مسودۂ قانون کے لائق محرک اسمبلی میں اس کے پیش ہونے کے وقت اس دفعہ کو حسب اعلان واپس لے لیں گے، اسمبلی کے موجودہ سشن کے نئے مسلمان اراکین لائق صد ستائش ہیں کہ ان کے مساعی سے قانون فسخ نکاح و قانون شریعت جیسے مفید مسودے اس وقت اسمبلی میں پیش ہیں، خداوند تعالیٰ ان کی مساعی کو بارآور فرمائے۔ (معارف، مارچ ۱۹۳۶ء)

اشاعت اسلام اور دارالمصنّفین

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میسور کی افتتاحی کارروائیوں کا تذکرہ ماہ جنوری کے ان صفحات میں کیا جاچکا ہے، اس سال اس کے شعبہ اسلامیات کی صدارت کی خدمت جناب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے انجام دی، موصوف نے اپنے پرمغز خطبہ میں اسلامی تہذیب وتمدن اور اس کی اشاعت و وسعت پر عالمانہ نظر ڈالی ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان کے ان متعدد علمی اداروں کا جو تحقیق و تدقیق، درس وتدریس اور اشاعت علوم کے فرائض کسی

طریق پر انجام دے رہے ہیں، تذکرہ کیا ہے، اس ذیل میں موصوف نے دارالمصنّفین کو بھی یاد فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

> ''اس کے بعد ہم دارالمصنّفین اعظم گڑھ کا ذکر کریں گے جو مولانا شبلی مرحوم کی یادگار ہے، اس ادارہ نے جس درجہ علوم اسلامی کی تبلیغ اور حمایت میں ہمت صرف کی ہے اور اس کے مفاد کو پیش نظر رکھا ہے، شاید ہی کوئی اورادارہ اس کی ہمسری کر سکے، اس ادارہ نے تالیفات کا ایک گراں قدر سلسلہ جاری کیا ہے جو اردو داں نسلوں کے لیے بے مثال شاہکار کی صورت اختیار کرے گا، سیرت النبیؐ اور مشاہیر اسلامی کی سوانح عمریاں جو عام مسلمانوں کی ہدایت کے لیے لکھی گئیں، وہ اس ادارہ کے لیے سرمایۂ ناز ہیں،......اس ادارہ کی علمی تصنیفات کی تعداد اور اہمیت دوسرے اداروں کے مقابل میں بہت بڑھی ہوئی ہیں، ہم اب اس ادارے کے مخلص شیدایان علم کی ستائش میں رطب اللسان ہیں، معارف اس ادارہ کا ایک ماہانہ اردو رسالہ ہے جو اسلامی دنیا کی مختلف سرگرمیوں کی نمائندگی کرتا ہے، مولوی سید سلیمان ندوی جن کی صحت یابی کے ہم متمنی ہیں، اس ادارے کے روح رواں ہیں، تمام ہندوستان کے مسلمان ان کے اسلامی جوش اور علمی تبحر کے بے حد مرہون منت ہیں''۔(معارف، مارچ ۱۹۳۶ء)

صوبہ بہار میں مسلم اقلیت پر مظالم کی انتہاء

صوبہ بہار میں ۸۷ فی صدی اکثریت والے لوگوں نے ۱۳ فیصدی مسلمانوں پر جس ''بہادری'' اور ''دلیری'' سے ستم ڈھائے ہیں۔ وہ تاریخ کے صفحات بن چکے، اور اب ان کے متعلق زمانہ کا مورخ اپنا فیصلہ لکھے گا۔ اس تباہی و بربادی کے بعد سب سے بڑا سوال اب یہاں کے مسلمانوں کے مستقبل کا ہے، بہار کے مختلف حصوں سے ہمارے یہاں یاس انگیز استفسارات آئے ہوئے ہیں اور ہم نے وہاں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا کہ اچھے اچھے مضبوط لوگوں کے قدم اکھڑ چکے ہیں۔ وہ اپنے پشتہا پشت کے آبائی وطن سے ایسے بیزار ہیں کہ ان میں اس کی طرف کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ وہ اس موطن سے ہمیشہ کے لیے اپنا منہ موڑ لینے پر آمادہ ہیں، جن کی سرزمین پر ایمان کی

شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں، جس کی فضا میں تکبیر کی صدائیں گونجتی ہیں، جہاں جابجا اولیاء وصالحین کے مآثر ومقابر اور بزرگوں کی تعمیر کی ہوئی مسجدوں کے مینار بلند ہیں اور انہی آبادیوں کے قبرستانوں میں ان کے آباء واجداد ودیگر اسلاف محو استراحت ہیں۔

ان اسلاف نے کتنی جاں فشانیوں سے اس علاقہ کو فتح کر کے اپنا گھر بنایا تھا۔کیا وہ اس آسانی سے چھوڑ دیا جائے؟ حق کی راہ میں مرنا اور مارنا تو مسلمانوں کی زندگی کا شیوہ رہا ہے۔مصائب سے خوف وہراس مسلمان کی شان نہیں، اس بدحواسی اور ابتری کے ساتھ ترک وطن کرنا میرے خیال میں مسلمانوں کو برباد کردے گا اور ان کی مزید اقتصادی تباہی کا باعث ہوگا۔اس لیے اس مسئلہ پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا ہے۔

ہجرت کی عمومی تحریک تو اس وقت صحیح کہی جاسکتی ہے، جب دو مساوی درجہ حکومتیں آبادی کے تبادلہ پر تیار ہو جائیں یا اگر تبادلہ منظور نہ ہو تو مسلم حکومت یا حکومتیں یکسر سب مسلمانوں کو اس صوبہ سے اپنے صوبہ یا صوبوں میں جگہ دینے اور دوسری سہولتیں مہیا کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ہندوستان اور اس کے موجودہ صوبوں میں حکومت کا آیندہ نظام کیا ہوتا ہے، یہ ابھی پردہ غیب میں ہے، اس لیے اس منزل میں ہجرت کی حوصلہ افزائی کرنا بڑی ہی ذمہ داری کی بات ہوگی، جو لوگ حالات کا مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے اس صوبہ سے ترک وطن کر کے جاچکے ہیں۔انہوں نے اپنے پیچھے رہنے والوں کو نہیں دیکھا کہ اس صوبہ کے مسلمان پہلے سے زیادہ اقلیت میں ہو گئے یا ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کو جو کچھ کرنا ہے وہ وحدت کلمہ کے ساتھ کرنا ہے۔اگر بہار کو آباد رکھنا ہے تو سب رہیں گے، اگر چھوڑ کر نکلنا ہے تو سب نکلیں گے۔اگر ہجرت اور ترک وطن ہی کی نوبت آئی اور آیندہ اس صوبہ میں مسلم کی جان کی حفاظت کا اعتماد کے لائق کوئی نظام نہ بن سکا، تو پھر وہاں کے معابد ومآثر راہ میں حائل نہیں سکتے۔مسلم کی جان اور اس کا ایمان سب سے زیادہ بیش قیمت ہے۔سوال صرف مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کا ہے، اس کی عدم موجودگی میں جب اللہ تعالیٰ کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پاک گھر خانۂ کعبہ کو بت پرستوں کے قبضہ میں چھوڑ کر تشریف لے جاسکتے ہیں تو صوبہ بہار کے مسلمان وہاں کی مسجدوں اور بزرگوں کے مزاروں کی حفاظت پر مجبور نہیں ہیں۔

لیکن بحمد للہ اس صوبہ میں اتنے مسلمانوں کی آبادی موجود ہے کہ اگر وہ اپنے انتشار کو دور

کرلیں اور پاس پاس کی آبادیوں کو ایک مرکزی ادارہ سے مربوط کرلیں تو وہ بفضلہٖ حملہ آوروں کا مقابلہ اپنی قوت اور بل بوتے پر کر سکتے ہیں۔ انہیں صرف فرمان الٰہی وَ اَعِدُّوْ الَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّ كُمْ (انفال ع ۸) پر نظر رکھنی اور اس کی روشنی میں اپنی اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کر لینی ہے تا کہ وہ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ کے مصداق بنیں۔

صوبہ بہار کے مسلمان ان دنوں جس منزل میں ہیں، ان کے مستقبل کی راہ عمل کے لیے سورۂ انفال کی مذکورہ بالا آیات کریمہ سے انہیں بہترین رہنمائی مل سکتی ہے۔ ہندوستان میں اکثریت و اقلیت کا مسئلہ برطانوی حکومت کے آغاز سے عالم وجود میں آیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان جہاں رہے موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں وہ اقلیت میں رہے مگر ان کا قیام اللہ تعالیٰ کے فضل، اپنی خود اعتمادی اور قوت بازو پر تھا۔ وہ غیر کے سہارے جیتے نہ تھے، ان کی زندگی کسی دوسرے کی اطمینان دہی پر موقوف نہ تھی۔ انہوں نے اپنے اقلیت میں ہونے کے باوجود حکمرانی کی اور جہاں رہے وہاں انہوں نے اپنے عقیدہ کی پختگی، اپنی سیرت و کردار کی مضبوطی، اپنے اخلاق کی بلندی اور خصوصاً اپنی قوت ایمانی اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ حسن عمل سے ان کو اپنا گرویدہ بنایا اور اکثریت کے افراد کو اپنے میں ایسا جذب کیا کہ ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں اور کروروں کی تعداد میں ہو گئے۔

یہی روش آج بھی ان کے لیے محمود کہی جا سکتی ہے لیکن مسلم اقامت گاہوں میں مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنی قوت و طاقت کے بھروسہ پر اطمینان کی زندگی بسر کرنا اس کی اولین شرط ہے۔ ضرورت ہے کہ بہار میں اندرونی دیہی آبادیوں کے مسلمان زمیندار اپنی زمینداریاں ختم کریں۔ بڑے قصبوں، آبادیوں اور ان کے آس پاس میں رہنے والے مسلمان زمیندار اپنی ''خود کاشتہ اراضی'' میں دیہی حلقوں کے مسلمانوں کو بہ معاوضہ زمینیں دے کر بسائیں اور اپنے سرمایہ سے ان علاقوں میں صنعتی کارخانے کھولیں اور اپنے اور نو آباد مسلمانوں کے لیے معیشت کا سامان کریں۔ یہ اور اس قسم کی مختلف تجویزیں صوبہ کے مسلمان مفکرین سوچ سکتے ہیں اور بہار کے مسلمانوں میں اس وقت جو عام انتشار اور خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ اس کو دور کر سکتے ہیں۔

بہر حال یہ ساری تجویزیں صوبہ بہار کے مسلمانوں کی آیندہ زندگی سے وابستہ ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے بروئے کار آنے میں کچھ دیر لگے گی۔ پھر مستقبل میں سیاسیات کے مسائل کس نہج پر

طے ہوتے ہیں۔اس پر بھی نگاہ رکھنی ہے کہ اسی کی روشنی میں اس صوبہ کے مسلمانوں کی قسمتوں کا آخری فیصلہ ہونا ہے۔سردست ضرورت ہے کہ وہ بڑے قصبوں اور آبادیوں میں مضبوطی سے اپنے قدم جمائے رہیں۔ہجرت کی فوری تحریک کو اس وقت تک کے لیے روک دیں، جب تک ان کے لیے بہار کی سکونت کی ہر ممکن تدبیر ناکام نہ ہوجائے۔البتہ وہ لوگ جو اپنے لیے سردست بہار کے بڑے قصبوں میں بھی کوئی معاشی سہولت حاصل نہ ہونے یا کسی اور سبب سے قیام نہ رکھ سکیں وہ عارضی طور پر کسی دوسرے محفوظ مقام پر چلے جائیں مگر اس صوبہ سے اپنے وطن کا تمام تر تعلق برقرار رکھیں کہ **لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا**۔

صوبہ بہار کے دیہی حلقوں کے ان ستم زدہ مسلمانوں کی ایک دوسری مظلومیت بھی ذکر کیے جانے کے لائق ہے کہ وہ جس دین پر قائم رہ جانے کے لیے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر پردیس میں نکلے ہیں اور مختلف مامنوں میں پناہ گزیں ہیں۔وہاں ہم نے بڑی حسرت سے دیکھا کہ ان میں کی بڑی تعداد اپنے اس دین کے ابتدائی عقائد و مسائل سے بھی آشنا نہیں ہے۔ملک کے مختلف گوشوں میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی مرحوم کی تحریک سے وابستہ مخلصین کی جماعت اپنے طریق پر دین کی خدمت میں مصروف ہے، کیا اچھا ہو اگر وہ کچھ دنوں کے لیے ملک کے دوسرے گوشوں کو چھوڑ کر ان مظلوموں تک پہنچیں۔اس وقت ان میں کام کرنے کی آسانیاں حاصل ہیں۔وہ بڑی بڑی تعدادوں میں یکجا ہوگئے ہیں۔گاؤں گاؤں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی، پھر مصائب و آلام سے ان کے دل خشیت و انابت سے معمور ہیں، وہ دین کی باتوں کو بڑی شیفتگی اور شگفتگی سے قبول کریں گے۔صالح زمین موجود ہے،صرف چند باہمت و دیندار مخلصین کی ضرورت ہے کہ وہ دین کی خدمت انجام دینے کے لیے اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔انشاءاللہ وہ توفیق الٰہی سے کامران ہوں گے۔(معارف،جنوری ۱۹۴۷ء)

ہندوستان انقلاب کے دروازے پر

ہندوستان اس وقت انقلاب کے دروازے پر کھڑا ہے۔کئی صدیوں سے جو تاریخ جاری تھی، اب اس کے آخری صفحے بھی مرتب ہوجائیں گے۔خوشی کی بات ہے کہ اس سیاسی انقلاب کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نئی روح دوڑانے کی امنگ بھی پیدا ہوچکی ہے۔ابھی جنوری کے پہلے

ہفتہ میں انڈین سائنس کانگریس کا ۳۴واں سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، جس میں سائنس کے مختلف شعبوں کے ہندوستانی ماہرین کے علاوہ مختلف ملکوں، روس، انگلستان، فرانس، امریکہ، آسٹریلیا، کناڈا اور چین کے ماہرین سائنس نے شرکت کی اور اپنی تقریروں میں سائنٹفک ترقیوں کے لیے ہندوستان کے درخشاں مستقبل سے اپنی امیدیں وابستہ دکھائیں۔ اور صدر منتخب نے اپنے خطبہ میں ان عزموں کو بیان کیا جن کے بہ موجب سائنس کی ترقیوں میں مستقبل کا ہندوستان اپنا حصہ ادا کرنے والا ہے اور ملک کے سائنس دانوں سے توقع ظاہر کی کہ وہ اپنے سائنٹفک خدمات کو ہندوستان کی ترقی کا ذریعہ بنائیں گے اور جدید سائنٹفک اداروں سے اس ملک کی ضرورتیں پوری کریں گے۔

اسی طرح ہندوستان کا موجودہ نظام تعلیم بھی ایک انقلابی دور سے گذر رہا ہے۔ سب سے اہم مسئلہ تعلیم کی زبان کا ہے، شکر ہے کہ اب اس مسئلہ پر نظری حیثیت سے گفتگو کرنے کا دور ختم ہو چکا۔ انگریزی زبان کی تعلیم کے لیے سب سے پہلا کالج ۱۸۳۴ء میں بمبئی میں قائم کیا گیا تھا اور ۱۸۳۵ء میں کلکتہ کے میڈیکل کالج کی بنا پڑی اور اس وقت سے آج تک اس ملک میں سرکاری تعلیم کی زبان انگریزی رہی۔ اس یک صد سالہ دور کا جو کچھ تعلیمی تجربہ ہے، ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگریزی کے ذریعہ تعلیم ہونے سے ملک کو نفع اور نقصان دونوں پہنچا مگر اب جب کہ خالص ملکی حکومت ہوگی اور ہماری ملکی زبان میں نئے سے نئے علوم پڑھانے کے ذرائع و وسائل مہیا ہو چکے ہیں۔ اور جامعہ عثمانیہ میں اس کا عملی تجربہ بھی کیا جا چکا ہے تو انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے کے وہ بنیادی دلائل بھی باقی نہیں رہ گئے۔ جو لارڈ میکالے اور ولیم بینٹک نے پیش کیے تھے۔ ایسی صورت میں اب انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنا کوئی مناسب بات نہیں کہی جاسکتی۔ خوشی کی بات ہے کہ مرکزی حکومت ہند کے نئے رکن تعلیم نے قلم دان وزارت سنبھالتے ہی اس اہم مسئلہ پر توجہ کی۔ چنانچہ اس کو حل کرنے کے لیے وہ مختلف صوبوں کے وزرائے تعلیم اور یونیورسٹیوں کے ماہرین کو مشورہ کے لیے جمع کرنے والے ہیں اور توقع ہے کہ سال رواں یا آیندہ سال سے ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے دیا جائے اور ہندوستانی طلبہ جو ایک سو برس سے علوم کی تحصیل اجنبی زبان میں کرتے آئے ہیں۔ اس بار سے سبکدوش ہو جائیں اور وہ مختلف علوم کی تحصیل اپنی ملکی زبان میں کرسکیں اور انگریزی زبان کی تحصیل کو ایک معیاری ادبی زبان کی حیثیت سے برقرار

رکھ سکیں۔ امید ہے کہ ہندوستان کے ہر طبقہ کی طرف سے یہاں کے نظام تعلیم میں اس خوش گوار تبدیلی کا پرتپاک خیر مقدم کیا جائے گا۔

ہمارے لیے اس سے بھی زیادہ باعث مسرت یہ ہے کہ مرکزی حکومت ہند کے محکمہ تعلیم کی زمام ایک صاحب علم و فضل شخصیت کے ہاتھوں میں آجانے کی وجہ سے ہماری عربی و فارسی تعلیم کا مسئلہ بھی حکومت کے زیر توجہ مسائل کی فہرست میں داخل ہوگیا ہے اور صوبہ متحدہ اس سلسلہ کی مساعی کے لیے جولان گاہ قرار پایا ہے کہ دراصل یہی صوبہ ہندوستان کی عربی درس گاہوں کا مرکز ہے۔ یہاں جو تبدیلیاں رونما ہوں گی، وہ سارے ہندوستان کی عربی درس گاہوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں گی۔ ابھی ۲۲/فروری ۱۹۴۷ء کو عربی و فارسی کمیٹی کا جو اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا اور اس میں جو ماحول نظر آیا۔ وہ ہمارے لیے بہت کچھ حوصلہ افزا ہے۔ اس اجلاس میں ملک کی اہم درس گاہوں کے روح رواں حضرات نے عملی شرکت فرمائی اور ہندوستان میں عربی تعلیم کی اصلاح و تجدید کے مسئلہ پر اپنے قیمتی مشورے دیے۔

مولانا آزاد نے اپنے خطبۂ صدارت میں نصاب تعلیم کی اصلاح پر سب سے زیادہ توجہ فرمائی۔ جیسا کہ مولانا موصوف نے فرمایا، یہی دعوت تھی، جو آج سے پچاس برس پہلے ندوۃ العلماء کی تحریک کے نام سے ملک میں پیش کی گئی تھی اور بحمد اللہ کہ اس پچاس برس میں خواہ زبان سے اس دعوت کی قبولیت کا اقرار نہ کیا گیا ہو، مگر عملی طور پر اس کی صدائے بازگشت سے ہمارے عربی مدارس کے حجرے خالی نہیں رہے۔ آج عربی مدارس کا نصاب تعلیم بہت کچھ بدل چکا ہے، غیر ضروری علوم کی منتہی کتابیں، درس سے خارج کی جاچکی ہیں، علوم آلیہ کو آلہ و وسیلہ کی حیثیت سے پہچانا جاچکا ہے، پھر عربی علم ادب اور دوسرے نئے علوم کو مدرسوں میں کمی کے ساتھ سہی روشناس کیا جاچکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت کے جواب میں علمائے کرام کی جانب سے جو تقریریں کی گئیں، وہ بھی امید افزا ہیں کہ دراصل اب اس کی ضرورت سے انکار کرنے کا دور گذر چکا۔ صالح زمین تیار ہوچکی ہے، صرف توجہ اور انہماک سے بے جھجھک کام کرنے کی ضرورت ہے، جن اصلاحات کا رائج ہونا باقی رہ گیا ہے، ان کو رائج کیا جائے اور جہاں طلبہ پر غیر ضروری کتابوں کا بار اب بھی باقی رہ گیا ہو اس کو ہلکا کیا جائے اور دینی علوم وفنون کے ساتھ عربی ادب ونقد و بلاغت کی

مکمل تعلیم دی جائے اور نصاب میں تاریخ، جغرافیہ، جدید فلسفہ، جدید ہیئت، ریاضی اور سائنس کے ضروری ابتدائی معلومات اور مطالعہ فطرت (نیچر اسٹڈی) کے مضامین بڑھائے جائیں۔ اور نئے علوم وفنون میں بصیرت حاصل کرنے کے لیے انگریزی ادب کو زبان ثانی کے طور پر پڑھایا جائے۔ اس طرح عربی تعلیم کے نصاب اور مدارس کے نظام کو ایک ایسے قالب میں لے آیا جائے کہ وہاں کے فارغ التحصیل علماء ہمارے دور حاضر کی دینی، ملی، علمی، تعلیمی اور تمدنی ضرورتوں کے لیے مفید ہو سکیں اور ملت کی صحیح رہنمائی کے فرائض انجام دے سکیں۔ صوبہ متحدہ کی عربی فارسی کمیٹی سے ہماری بہترین توقعات وابستہ ہیں۔ دعا ہے کہ اس کے ارکان یکجہتی سے اس مسئلہ پر غور وفکر فرمائیں اور باہمی صلاح ومشورہ سے مفید تجویزیں مرتب کریں اور ان کو نفاذ اور عمل میں لانے کے لائق بنا سکیں۔

اسی طرح بنگال اور سندھ کے صوبوں میں نئی یونیورسٹیوں کے قیام کی تجویزیں بھی در پیش ہیں۔ ان صوبوں میں سیاسی صورت حال نے مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ نئی یونیورسٹیاں تعلیم کے نئے خاکے اور نئی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر قائم کی جائیں گی۔

حکومت ہند کے تازہ فیصلہ کے مطابق اردو کے گہوارہ لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشن سے اردو زبان کے نشریات کا حصہ صرف ۳۰ فیصدی اور ہندی کا ۷۰ فیصدی ہوگا۔ اس فیصلہ کے ناموزوں ہونے کی آواز مستحکم دلائل کے ساتھ ملک کے مختلف ذمہ دار حلقوں کی طرف سے اٹھائی جا چکی ہے۔ حقیقت ہے کہ حکومت کا یہ فیصلہ خود اس کے قائم کیے ہوئے ان اصولوں کے بھی خلاف ہے، جن کی روشنی میں اس فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں نہ تو متعلقہ علاقوں کی زبان کی حیثیت واہمیت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور نہ اسٹیشن کی لسانی حیثیت کا کہ لکھنؤ بہر حال وہ محل وقوع ہے، جہاں اس زبان کی توسیع وترقی ہوئی ہے۔ ان حالات میں ایسے فیصلہ کا اعلان کرنا حد درجہ حیرت انگیز اور بڑی جسارت کا کام ہے، ضرورت ہے کہ حکومت ہند جلد سے جلد اس پر نظر ثانی کرے کہ اس کا دامن اردو اور اس کے مرکز لکھنؤ کی ادبی ولسانی عظمت کو مٹانے کے الزام سے بری رہے۔ (معارف، مارچ ۱۹۴۷ء)

مسلمانوں کی مذہبی اور تمدنی ضرورتیں اور ان کی تکمیل کی راہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے ساتھ ہی ان کی اجتماعی زندگی اور مذہبی

تنظیم کا شیرازہ ایسا بکھر گیا کہ ملت کے پورے نظام میں ابتری و پراگندگی پھیل گئی۔ نصف صدی پہلے سے مسلمانوں نے حکومت سے نظر التفات کی التجائیں کر کے اپنی اجتماعی شیرازہ بندی کی بار بار کوششیں کیں، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مجالس قانون ساز میں بھی انہوں نے انفرادی کوششوں سے اپنی تمدنی و مذہبی ضرورتوں کے لیے مختلف بل پیش کیے، مگر ان کا نتیجہ بھی کچھ اطمینان کے قابل نہیں نکلا۔ معارف نے آج سے اٹھائیس برس پہلے حکومت کو ان مسائل کی طرف توجہ دلائی، مگر نہ حکومت ہی نے ادھر توجہ کی اور نہ مسلمانوں نے۔

ہندوستان کے اسلامی عہد میں صدر جہاں کا منصب انہی ضرورتوں سے قائم تھا۔ اس کی نگرانی میں مسلمانوں کے مذہبی احکام و فرائض انجام پاتے تھے۔ اس عہد کے خاتمہ کے بعد برطانوی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں بھی یہ عہدے قائم رہے اور دیسی ریاستوں میں برائے نام سہی وہ آج بھی موجود ہیں۔ حیدر آباد کے صدر الصدور یا ناظم امور مذہبی کا منصب، یا بھوپال میں دار القضا کا محکمہ پچھلے ہی دور کی نشانیاں ہیں، پھر ہندو ریاستوں میں بڑودہ کے قاضی ''گوالیار کے مفتی'' اور برطانوی ہند میں بنگال کے ''قاضی نکاح'' بیسیوں صدی میں بھی وہاں کے سرکاری عہدہ دار ہیں اور اگر یورپی سلطنتوں کے زیر اثر ممالک کی مثال لائی جائے تو الجزائر، ٹیونس اور طرابلس وغیرہ کے مذہبی امور کے ادارے اب تک چلتے رہے ہیں۔

خلافت کی تحریک اور امارت شرعیہ کی تاسیس میں اسی نظام کے دوبارہ قیام کا خیال غالب تھا، مگر افسوس ہے کہ ایک بیرونی حکومت نے مسلمانوں کی زندگی کی اس بڑی ضرورت کا احساس نہیں کیا۔ لیکن اب جبکہ ایک نئے ہندوستان کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور اسلامی اکثریت اور اسلامی اقلیت کے صوبوں میں مسلم لیگ اور کانگریس کی حکومتیں قائم ہیں اور ملک کے لیے ایک نئے نظام نامہ کا خاکہ تیار کیا جا رہا ہے، یہی وہ وقت ہے جب اس مسئلہ پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اب ۳۵ء ایکٹ کی ماتحت حکومتیں چراغ سحری ہیں، جون ۴۸ء تک نیا ہندوستان اپنے نئے رنگ روپ میں سامنے آنے والا ہے۔ ہندوستان کا آیندہ نظام خواہ جیسا بھی ہوا سکے نقشہ میں جس اعتبار سے جس قسم کے رنگ بھی بھرے جائیں، بہر حال وہ آج برطانوی ہند سے ایک مختلف ہندوستان ہوگا۔ اسلامی اکثریت کے صوبوں میں اسلامی طاقت غالب ہوگی اسلیے وہاں اس

نظام پر غور کرنے کی ضرورت سے کسی کو انکار نہ ہوگا لیکن اسلامی اقلیت کے صوبے بھی مسلمانوں کی اس ضرورت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔

ہمیں اس سلسلہ میں قضاۃ کا تقرر کرنا ہے کہ نکاح وطلاق اور خلع کے مقدموں کا شرعی احکام کے مطابق فیصلہ ہو سکے۔ مسجدوں کے آباد ہونے کا نظام بنانا ہے کہ ان کے لیے ائمہ وخطیب مقرر کرنے کی سہولتیں حاصل ہوں، پھر مذہبی اوقاف کے انتظام کو نئی شکل میں لے آنا ہے۔ یہ اور اس قسم کی ساری ضرورتیں شیخ الاسلام ہی کی مرکزی مسند سے پوری کی جاسکتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ صوبوں میں اور اگر متحد مرکزی حکومت بنے تو مرکز میں امور مذہبی کے انصرام کے لیے ایک مستقل شعبہ قائم کیا جائے، جو پوری تنفیذی قوت کے مالک ہونے کے ساتھ وہ صوبہ یا مرکز کی حکومت کا ایک شریک جزء ہو، مگر وہ صوبہ یا مرکز کے حکمران طبقہ میں سے صرف مسلم عناصر سے وابستہ رہے اور صوبہ کی اسمبلی کے مسلمان ممبروں کے سامنے جواب دہ ہو۔ اس کے ساتھ اس شعبہ کا صدر حکومت کے کابینہ کا ایک رکن یا وزیر ہو۔

اگر اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو باعزت زندگی کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں اکثریت کے صوبوں کے مسائل کے ساتھ خاص طور پر ان مسائل پر بھی غور کرنا ہے کہ ان صوبوں میں ان کی اجتماعی زندگی کی پراگندگی کا خاتمہ ہو۔ آزاد ہندوستان میں ہر مذہب وملت کی مذہبی آزادی وثقافتی تحفظ کا اعلان بار بار دہرایا گیا ہے۔ اب ان کاغذی اعلانوں کی آزمائش کا وقت آپہنچا ہے۔ اس قسم کے کسی مذہبی شعبہ کا قیام مسلمانوں کے لیے خواہ وہ اکثریت کے صوبوں میں ہوں یا اقلیت کے۔ ان کی اہم دینی واجتماعی ضرورت ہے، اس لیے اگر موجودہ ناپائدار حکومتوں سے کسی زکوٰۃ یا بیت المال بل کو منظور کرانے کی کوششوں کے بجائے ملک کے ممتاز علماء وارباب فکر وسیع پیمانہ پر نظام حکومت سے منسلک ایک مذہبی شعبہ کی داغ بیل ڈالنے کی ایک اسکیم مرتب کرنے پر اپنا وقت صرف کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

اس اسکیم کے ضروری اجزاء میں شرعی مسائل واحکام کا اجرا ونفاذ کرنا اور اسلامی اوقاف، مساجد، دینی درس گاہیں، دارالافتاء، دارالقضاء اور ان کے ماتحت نکاح، طلاق، خلع، تفریق، شفعہ، وراثت، رویت ہلال، رمضان وعیدین کی تاریخ کی تعیین اور انتظام حج وغیرہ کے وسائل مہیا کرنا، داخل

ہوں گے۔ پھر اسی شعبہ کے ماتحت عشر وزکوٰۃ وصدقات اور عمومی اوقاف کے محاصل کو دینی شرائط کے مطابق وصول کرنا اور ان کو شرعی حدود وقیود کے مطابق صرف کرنا ہوگا۔ یہ اور ایسے ہی بیسیوں مسائل ہیں جو ہماری اجتماعی ضرورتوں کے لیے ہماری شیرازہ بندی کے منتظر ہیں نیز یہ بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ شرعی محاصل اور شرعی مقدمات کے اسٹامپ سے اس صیغہ کے سارے مصارف پورے کیے جاسکتے ہیں اور مرکز یا کسی صوبہ کے خزانہ پر جداگانہ مالی بار کے پڑنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ہے۔ امید ہے کہ ملک کے ارباب فکر اس مسئلہ پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے۔

اس وقت اصل ضرورت اسی نوعیت کے کسی مسودہ قانون کی ہے۔ امید ہے کہ اسلامی اخبارات خواہ وہ جس سیاسی مسلک ومشرب کے ہوں، اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کو ارباب فکر رہنماؤں اور عام مسلمانوں کے سامنے لائیں گے۔ (معارف، اپریل ۱۹۴۷ء)

ہندوستان کی آزادی اور مسلم اقلیت

ہندوستان میں دوسو برس کی برطانوی حکومت کی تاریخ کا آخری باب ۱۵/اگست ۴۷ء کو ختم ہوجائے گا۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ایسے جشن مسرت کے موقعے شاذ ونادر آتے ہیں۔ اس دن ہندوستان کا ہر باشندہ خواہ وہ اس کے حصہ ''انڈیا'' کا رہنے والا ہو یا نو قائم حکومت ''پاکستان'' کا۔ دنیا کی آزاد قوموں کے افراد کے دوش بدوش کھڑا ہوگا اور آزاد انڈیا اور پاکستان، دوسرے آزاد ملکوں کی طرف سے تہنیت کے پیامات وصول کریں گے اور جشن مسرت منائیں گے۔

معارف کی اشاعت ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہوتی ہے۔ اس ماہ کا پرچہ جب شائع ہوگا آزادی کی صبح طلوع ہوچکی ہوگی اور اسی دن ملک کے طول وعرض میں دوسو برس کے سامراجی جھنڈے سرنگوں کرکے اتارے جائیں گے اور ان کی جگہ دونو قائم حکومتوں کے وہ قومی پرچم حکومت کے ایوانوں پر لہرائے جائیں گے، جن کو ان حکومتوں کے رہنے والے شہریوں نے خواہ وہ اکثریت کے فرقہ کے ہوں یا اقلیت کے۔ عام اتفاق سے نشان عزت مان لیا ہے، ہم اپنے ماہنامہ کی تاریخ اشاعت سے فائدہ اٹھا کر ان سر بلند ہونے والے پرچموں کا دلی مسرت اور فخر سے خیر مقدم کرتے ہیں کہ وہ ہمارے سالہا سال کی جدوجہد کا مآل اور ایک مدت کی تمناؤں کے خواب کی تعبیر ہیں۔ نیز ہم جنگ آزادی کے ان سرفروش جانبازوں کو عقیدت کے پھول نذر کرتے ہیں، جو اگرچہ اب

ہمارے درمیان موجود نہیں، مگر ان کے روشن کارناموں سے ان کی یاد تازہ ہے اور ان پرچموں کے ان لہرانے والوں کی خدمت میں جوش مسرت و عقیدت کے ساتھ خراج تحسین پیش کرتے ہیں، جن کی مدبرانہ حکمت عملیوں اور شبانہ یوم جدو جہد سے یہ روز سعید دیکھنے میں آیا۔ اور اب جن کے ہاتھوں میں اس ملک کے مستقبل کی تعمیر کی عنان ہوگی۔

برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے والے ملکوں امریکہ، آئرلینڈ اور مصر اور دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اور اس کے نتیجہ میں اگرچہ بعض مماثلتیں پائی جاتی ہیں لیکن ہندوستان کی ۳۰ سالہ جدو جہد کی یہ امتیازی شان رہی ہے کہ یہاں کی تحریک عدم تشدد کے اصول پر چلائی گئی اور آج دنیا کی عام روش کے خلاف حکومت کے اختیارات پرامن طریقہ سے اس ملک کے رہنے والوں کے ہاتھوں میں منتقل ہورہے ہیں، خوش قسمت ہیں وہ رہنما اور وہ رہرو جو اس امن کی راہ سے منزل مقصود کو پہنچے ہیں۔

آزادی کی جدو جہد کے اس تیس برس کے مختصر وقفہ میں سیاست کے طوفان میں مختلف اتار چڑھاؤ آیا کیے اور اگرچہ ادھر چند سال سے مسلمانوں کی اکثریت ایک سیاسی جماعت سے ناراض رہی لیکن یہ حقیقت تاریخ کے صفحہ سے مٹائی نہیں جاسکتی کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں نے لگاتار بیش از بیش حصہ لیا اور اپنی ناقابل فراموش قربانیاں پیش کیں۔ آج جس طرح بال گنگادھر تلک، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سی آر داس اور لالہ لاجپت رائے کے عزیز خدمات کی یاد تازہ ہوگئی، اسی طرح حضرت مولانا محمود الحسن، مسیح الملک حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسٹر مظہر الحق، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مسٹر حسن امام، مولانا محمد علی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد اور مولانا شوکت علی (اللہ تعالیٰ ان کی تربتوں کو ٹھنڈا رکھے) کی روحیں خوش ہوں گی کہ انھوں نے جس نصب العین کے حاصل کرنے کے لیے زندگی بھر اپنی جدو جہد جاری رکھی۔ اور مصیبتیں جھیلیں، بالآخر ان کے اخلاف اس مقصد عزیز کو حاصل کرلینے میں کامیاب ہوگئے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے ایک دوسرے مکتب خیال کے ارباب حل وعقد نے ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کی اصلاحات اور آزادی کے ثمرات میں سے مسلمانوں کے جداگانہ حقوق و اختیارات کی تعیین کے لیے سیاسی مجلس کی بنا ڈالی تھی، ملک میں ہندو مسلم اختلافات کی تاریخ پر نظر رکھنے والے

جانتے ہیں کہ اگر بعض موقعوں پر اکثریت کے فرقہ والوں کے رہنماؤں سے بعض لغزشیں نہ ہوئی ہوتیں تو معلوم نہیں کب یہ مسئلہ طے ہو چکا ہوتا لیکن کشمکش کے پیہم جاری رہنے اور حالات کے بدل جانے سے اس مجلس میں سرفروش و آزمودہ کار جانباز بھی داخل ہو گئے اور اس مجلس کی ہیئت ترکیبی بدل گئی اور اس نے اپنا نصب العین ایک جداگانہ ریاست کا قیام قرار دے لیا اور جو بالآخر ایک کامیاب قیادت میں پورا ہوا۔ مبارک ہو مسلمانان پاکستان کو کہ وہ فائز المرام ہوئے اور مسلمانوں کی ایک نئی سلطنت کا وجود عمل میں آیا۔

اگرچہ یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ جب سات سال کی مسلسل جدوجہد اور مذہبی منافرت کے پھیل جانے کی وجہ سے ہزاروں ہزار مسلمانوں کے جام شہادت نوش کر لینے کے بعد نتیجہ برآمد ہونے کا موقع سامنے آیا۔ تو دوسری طرف سے تقسیم در تقسیم کی تحریک اٹھائی گئی۔ اور صرف تین مہینے کی تگ ودو میں وہ بھی منظور کر لی گئی۔ یہی سبب ہے کہ آج اس تاریخی موقع پر ملک میں حقیقی مسرت کی عام لہر موجود نہیں۔ ملک کا ایک طبقہ اس سے اگر اس لیے مایوس ہے کہ ایک متحد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور آزاد صوبوں کی متحد وفاقی حکومت قائم کرنے کی کوششیں رائگاں گئیں تو دوسرے حلقہ میں اس لیے کامل مسرت نہیں کہ ان کی اکثریت کے وہ صوبے جو اصل جان تھے، تقسیم ہو گئے۔ بایں ہمہ دونوں طبقوں کے نصب العین حاصل ہوئے۔ ایک تقسیم شدہ ہندوستان لیکن وہ آزاد ہوا اور ایک ادھورا پاکستان۔ بہرحال وہ قائم ہو گیا۔

دنیا کے انقلابات کی تاریخ میں مختلف قوموں، طبقوں اور جماعتوں کی کشمکش میں تلخیوں کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اقلیتوں کا مسئلہ ابھی جیوں کا تیوں لاینحل پڑا ہے۔ اور بعض ممتاز ہندو قوم پرور جو ساری عمر اپنے مسلک میں راسخ العقیدہ رہے۔ اس موقع پر اپنے کو سنبھالے رکھنے میں کامیاب نہیں رہے۔ اور اس منصوبہ کے ردعمل کے طور پر اشتعال اور جذبۂ انتقام میں ہندوستانی زبان کے بجائے ہندی کو "قومی" زبان قرار دینے اور انڈیا یونین میں رہنے والی اقلیت کے شہری حقوق تک پر پابندیاں لگانے کی آواز اٹھا رہے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ وہ اس طوفانی سیلاب میں اپنا دامن بچا نہ سکے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ ان کے یہ وقتی اور جذباتی تاثرات سیاسیات کے طوفانی بحران کے خاتمہ پر ختم ہو جائیں گے کہ ملک کو ترقی اور نئی تعمیر کی راہ پر لگانا ہے تو جذبات،

خیالات اور عام حالات میں سکون پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ نیز یہ خوشی کی بات بھی ہے کہ بعض حلقوں میں پچھلی تلخیوں کی یاد کو فراموش کردینے کا جذبہ بھی پیدا ہو چکا ہے اور یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ان سیاسی جماعتوں نے وقت اور ماحول سے متاثر ہوکر، اس منصوبہ کو دونوں نو قائم حکومتوں میں تلخیوں اور اختلافات کو برقرار رکھنے کے بجائے پائدار امن اور دوستی قائم کرنے کے لیے قبول کیا ہے۔ توقع ہے کہ ایک وہ دن بھی آئے گا جب پچھلی کدورتیں مٹ جائیں اور انتقام کے جذبات فنا ہوجائیں کہ جب روز روز کے نئے معاشی مسائل سامنے آئیں گے اور دونوں ریاستوں کی نگاہیں وسائل ترقی پر مرکوز ہوں گی تو پھر انتظامی امور میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور باہم ایک دوسرے کی خیر سگالی کی آرزومند رہنے کی ضرورت محسوس ہوگی کہ ان کی متحدہ کوششوں سے اس ملک کی پچھلی شاندار روایات زندہ ہوں اور دنیا کی قوموں میں اس کو بلند مرتبہ حاصل ہو۔

اسلامی ہند کی تاریخ کا وسیع سلسلہ جو دارالمصنّفین میں زیر تالیف ہے۔ یہ فال نیک ہے کہ اس کی پہلی جلد تاریخ سندھ اس وقت شائع ہو رہی ہے، جب سندھ اسلامی ہند کا نیا مرکز حکومت بن رہا ہے۔ یہ سندھ کے اسلامی فتوحات کی پہلی مفصل تاریخ ہے اور اس موقع پر خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہے۔ (معارف، اگست ۱۹۴۷ء)

آزادی اور قتل و غارت گری

کہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو گئے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں قتل و غارت گری و بربادی جو انتہائی سنگ دلی سے ہو رہی ہے۔ وہ ہر ہندو اور مسلمان کے لیے سخت قابل افسوس ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی تک اہل ہند آزادی کی سچی قدر کرنے سے محروم ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو ڈر ہے کہ ملی ہوئی نعمت بھی ان سے زائل نہ ہوجائے۔

وقت تو یہ تھا کہ دونوں قومیں اپنے اپنے دائروں میں ملک کی خوش حالی اور باشندوں کی راحت رسانی کی مختلف تجویزوں کو زیر عمل لانے میں اپنی کوششیں صرف کرتیں۔ لیکن اس کے بجائے ملک کی تباہی و بربادی کا سامان کیا جا رہا ہے، ڈر ہے کہ کہیں دنیا کی نگاہ میں یہ اس بات کی دلیل نہ بن جائے کہ یہ ملک ابھی غلام ہی بننے کے لائق تھا اور جو امانت اس کے سپرد کی گئی ہے۔ اس

کی حفاظت کی اہلیت اس میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔

(معارف، ستمبر ۱۹۴۷ء)

آزادی اور قتل و غارت گری

ہندوستان کے محب وطن سالہا سال سے آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے اور اس کی قربان گاہ پر عزیز سے عزیز متاع نثار کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن اس کے ملتے ہی جن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے مستقبل کے سارے خوش آیند تصورات خواب پریشاں بن کر رہ گئے۔ ہندوستان آزادی انصاف اور رواداری کا علم بلند کر کے ایشیا کی رہبری کا پیام لے کر اٹھا تھا مگر آج وہ اپنے گھر میں لگی ہوئی آگ کو بھی بجھانے پر قادر نہیں۔ انڈین یونین اور پاکستان دونوں اپنی برادر کشی، قتل و غارت گری اور جنون آمیز درندگی کی رسوا کن حرکتوں سے اپنے عہد غلامی سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہیں۔

برطانوی حکومت کے ۳/ جون کے اعلان کو سیاسی جماعتوں نے اس توقع سے قبول کیا تھا کہ فرقہ وارانہ نزاعیں ختم ہو جائیں گی اور دونوں نوآبادیوں کو اپنے دائرہ میں ترقی کے مواقع ہاتھ آئیں گے۔ لیکن حد بندی کمیشن کے فیصلہ کے شائع ہوتے ہی گویا اس کے خرمن پر بجلی گر پڑی اور فسادوں کی لہر جو پہلے سے موجود تھی، اس تیزی سے آگے بڑھی اور ایسے ہولناک حادثات رونما ہوئے کہ بنگال و بہار کی المیہ داستانیں بھی ماند پڑ گئیں، ہزاروں ہزار معصوم بچے اور بے زبان عورتیں نوک شمشیر کا نشانہ بنیں، لاکھوں لاکھ انسان بے خانماں برباد ہوئے، آبادیوں کی آبادیاں اور محلوں کے محلے جلا کر خاکستر کیے گئے اور سینکڑوں میل کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اجاڑ دی گئیں۔ ہر قتل، غارت گری اور فتنہ انگیزی کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے لیکن یہ اتنا بڑا المیہ پیش آیا کہ اس کے مقصد کی کوئی صحیح تعیین نہیں کی جا سکتی، سوائے اس کے مجنون انسانوں نے اپنے جاہلانہ جوش جنون میں اپنے وحشیانہ جذبۂ انتقام کی پیاس کو بجھایا، مگر مآل کار انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔

انڈین یونین اور پاکستان کے ہندو اور مسلمان اپنی آبادی کے جس تناسب سے ہیں، یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی کسی دوسرے فرقہ کے افراد کو اس طرح ختم کر سکتا ہے کہ اس مذہب کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہ جائے۔ بعض کوتاہ بینوں کے سامنے سسلی اور اندلس کی مثالیں ہیں۔ ہندوؤں کی بعض نوقائم جماعتیں قتل و غارت گری سے اس تاریخ کو دہرانا چاہتی ہیں اور بعض نادان

مسلمانوں کا ایک طبقہ شدت خوف سے انہی مثالوں کو سامنے رکھ کر لرزاں و ترساں اور سر چھپانے کے لیے کسی مامون جگہ کی تلاش میں سر گرداں ہے۔ مگر یہ اس راہ سے سوچنے والوں کی صریح نادانی ہے۔ وہ اس کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر مسلمان سسلی اور اسپین سے ایک ایک کر کے نکل آئے تو دوسرے راستہ سے انہوں نے اس براعظم کی سب سے عظیم الشان سلطنت بیزنطی کی شہنشاہی کو ختم کر دیا۔ وہ اپنی ان سے بہت کم قوتوں کو سسلی اور اسپین کی بازیافت میں لگا کر کامیاب ہو سکتے تھے مگر اس وقت کی بساط سیاست کا نقشہ کچھ اور تھا، اس کے مطابق انہوں نے عمل کیا پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ وہ اپنے طرز عمل سے سالہا سال تک جن نظریوں کی مخالفت کرتے رہے۔ اپنے اس بے سود نئے تخیل یعنی نازی اصولوں کے مطابق وحدانی ہندو قوم اور وحدانی ہندو حکومت سے انہی کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ایسی حکومتوں کی کوششیں نہ انڈین یونین میں کامیاب ہو سکتی ہیں اور نہ پاکستان میں۔

دلی کا المیہ سب سے زیادہ اندوہ ناک ہے۔ یہ غریب معلوم نہیں کتنی مرتبہ لٹی اور آباد ہوئی۔ اگرچہ اس کی ہر ہر بربادی ایک نئی آبادی کا پیش خیمہ بنی، مگر اس کی پچھلی بربادیاں سلطنت کے انقلاب کے لیے تھیں، اس مرتبہ سلطنت کے انقلاب کے بعد یہاں عوام نے عوام کو قتل کیا اور ایسی تباہی آئی کہ ۵۷ء کی تباہیوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ دلی کے اس المیہ میں وہاں کے ممتاز علمی و ادبی اداروں کے قیمتی ذخیروں کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ جامع مسجد کے اردو بازار کے مرکزی تجارتی کتب خانوں پر معلوم نہیں کیا افتاد گذری، لیکن جامعہ ملیہ کے قیمتی کتب خانہ (قرول باغ) اور اس کے ترقی یافتہ تجارتی مکتبہ کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ندوۃ المصنّفین کے ماہنامہ برہان کا مکتبہ لوٹ لیا گیا، بوڑھی انجمن ترقی اردو ہند مرکزی دفتر اور اس کے تجارتی کتب خانہ کو بھی تباہ کر دیا گیا۔ کیا یہ بربادیاں اسکندریہ کے کتب خانہ کی بربادی سے کم ہیں، جن کا صدیوں تک ماتم کیا جا چکا ہے۔

قتل و غارت گری کا یہ نامتناہی سلسلہ رک سکتا ہے۔ اگر گذرے ہوئے واقعات کو فراموش کیا جائے۔ الزام دہی کے سلسلہ کو روکا جائے۔ ہندو، مسلمانوں اور سکھوں میں سے کون فرقہ ہے جس کی بڑی تعداد کے ہاتھ اس خون سے رنگین نہیں، پھر ایک دوسرے پر الزام رکھنے سے کیا حاصل؟ ان میں سے ہر فرقہ کو عصبیت سے بلند ہو کر اپنی انسانیت سوز حرکتوں کا جائزہ لینا اور قاتلوں کے ہاتھ کے بجائے خود اپنے رنگین ہاتھوں کو دیکھنا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے نہ ہندو مت کے مطابق ہے اور نہ اسلام

کے اور نہ گرونانک جی نے ایسی وحشیانہ حرکتوں کی کبھی تلقین کی ہے، مگر یہ کیا ستم ہے کہ یہ سب کچھ مذہب اور دھرم ہی کے نام اور اسی کے خاطر کیا جارہا ہے اور اسی کو قومی برتری اور دین اور دھرم کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر ہم میں واقعی مذہبی درد اور قومی ہمدردی ہے تو ہمیں اپنے دین اور دھرم کی تعلیمات پر نگاہ رکھنی چاہیے اور اسی سے وہ راہ صواب مل سکتی ہے جو امن وامان کی منزل تک پہنچا سکے گی۔

بہار کے سانحہ کے موقع پر مظلوموں کو ترک وطن کا مشورہ دیا گیا تھا اور ہزاروں ہزار مسلمانوں نے اس صدا کو لبیک کہا تھا۔ پھر تھوڑے سے سکون کے بعد انہیں بہار میں واپس لانے کی تحریک اٹھائی گئی اور بہت سے لوگ شکستہ حالی کے ساتھ واپس لائے گئے۔ اب موجودہ خوں ریز حادثات سے مسلم عوام میں ترک وطن کے جذبات نئے سرے سے ابھر پڑے ہیں اور ان میں عام سراسیمگی اور پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ کیا مسلمان جہاں گئے، شمشیر کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر گئے یا جہاں رہے تلوار کے سایہ میں پناہ گزیں رہے۔ حبشہ پر مسلمانوں نے کبھی چڑھائی نہیں کی مگر وہاں آدھی سے زیادہ آبادی مسلمان ہے، افریقہ کے بہت سے مقامات ہیں، جہاں مسلمان سپاہیوں کی تلوار نہیں پہنچی مگر وہاں مسلمانوں کی بڑی آبادیاں قائم ہیں، چین پر مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہیں کی مگر تین چار کرور مسلمان وہاں نامسلمان چینیوں کے ساتھ امن کی زندگی گذار رہے ہیں۔ انڈونیشیا کبھی کسی مسلمان تاجدار کے زیر نگیں نہیں آیا مگر وہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ خود ہندوستان میں بنگال، کشمیر اور سندھ اسلامی دارالسلطنت کی سطوت سے دور ہے مگر وہاں آج بھی غالب اکثریت موجود ہے۔ ان کے برخلاف آگرہ، دلی، اودھ مسلمان سلاطین اور ان کی تہذیب وتمدن کے مرکز تھے، مگر مسلمانوں کی آبادی ۱۵ فیصدی سے آگے نہیں بڑھی، پھر انڈین یونین کے مسلمانوں کے لیے کون سی بات ہے کہ وہ ۴ ½ کرور کی عظیم تعداد میں ہونے کے باوجود سراسیمہ اور پریشان ہیں؟

ہم نے مسلمانوں کو اس وقت بھی مشورہ دیا تھا اور آج بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ دل جمعی سے اپنے وطن میں جمے رہیں۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ راستے پر خطر ہیں، نقل مکانی کی جرأت کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ ہاں سال دو سال گذرنے کے بعد جب حالات میں سکون پیدا ہوجائے، منافرت کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں، بربریت کا دور ختم ہوجائے اور لوگ انسانیت کی عزت کرنا سیکھ لیں، تو پھر دل کے پورے سکون اور طمانیت کے ساتھ غور وفکر کی راہیں کھلی رہیں گی اور جسے اپنے کسی

پسندیدہ ملک میں جانا ہوگا تو وہ جاسکے گا اور اپنے ماحول کے اعتبار سے اپنی سہولتیں حاصل کرسکے گا۔

موجودہ حالات میں مستقبل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم رہنا، دشوار ہے۔ اس وقت انڈین یونین یا پاکستان کے صوبوں کی اسمبلیوں یا مجالس بلدیات میں کثرت رائے سے جو فیصلے ہورہے ہیں، انہیں ہم پائدار نہیں سمجھتے۔ اس پرآشوب زمانہ میں ان فیصلوں اور اقداموں میں چاہے، وہ جتنی بھی چھپی ہوئی ہوں مگر غم وغصہ، نفرت اور انتقام کی تلخیاں موجود ہیں۔ حالات کے پرسکون ہونے کے بعد ہوسکتا ہے کہ یہ فیصلے عقل وخرد کی ترازو پر نئے سرے سے تولے جائیں اور دلائل کا وزن ان کو ان اپنے فیصلوں کے بدلنے پر مجبور کرے۔ **لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔**

(معارف، اکتوبر ۱۹۴۷ء)

زبان کا مسئلہ

زبان کے مسئلہ میں کسی صاحب نے لیڈر میں ایک تجویز پیش کی ہے کہ انڈین یونین اس مسئلہ میں عجلت سے کام نہ لے، اگر پاکستان کی حکومت ۴۰ فیصدی (؟) غیر مسلم باشندوں کے جذبات کا لحاظ نہ کرے اور اردو کے ساتھ ہندی زبان اور رسم خط کو سرکاری زبان کا درجہ نہ دے تو انڈین یونین بھی حق بجانب ہوگی کہ وہ اپنی صرف ۱۲ فی صدی آبادی کا لحاظ نہ کرکے ہندی زبان اور رسم خط کو سرکاری زبان کا درجہ دے دے۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان کی حکومت سے اپنی جگہ یہ مطالبہ درست ہے اور پاکستان کے قیام میں انڈین یونین کے مسلمانوں کا جو حصہ رہا ہے جزائے احسان کے طور پر پاکستان کو اپنے فیصلوں کے وقت انڈین یونین کے مسلمانوں کی اس یونین میں سیاسی منزلت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ بایں ہمہ یونین کے ذمہ داروں سے یہ بھی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ کیا پاکستان کو انہوں نے اسی نقطہ نظر سے قبول کیا تھا کہ یونین کے مسلمانوں کے ساتھ یرغمال کا برتاؤ کیا جائے گا جو لوگ اس ملک کو اپنا آبائی وطن تصور کریں ان کے متعلق یہ کیسے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے ساتھ جو برتاؤ کیا جائے، اس میں غیر ملکی حکومت کے اپنی اقلیت کے ساتھ برتاؤ سے موازنہ کرلیا جائے، یہ دوسری بات ہے کہ انسانیت شرافت اور عدل وانصاف کے نام پر دوسری حکومتوں کو صحیح راہ اختیار کرنے کی تلقین کی جائے اور اس میں کامیابی نہ ہو تو ایک حکومت دوسری حکومت کے ساتھ جو کچھ کرسکتی ہے اور جو وسائل اختیار کرسکتی

ہے اس کو عمل میں لایا جائے، یہ تو کسی طرح مناسب نہیں کہ یہاں کی اقلیتوں اور پاکستان کی اقلیتوں کو ایک ترازو پر رکھا جائے اور اسی معیار سے ایک دوسرے کے حقوق کو تول کر ان کی تعیین کی جائے۔

صوبہ متحدہ میں ہندی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جاچکا ہے اور اس پر عمل درآمد شروع ہوچکا ہے۔افسوس کی بات ہے کہ اردو کے مرکز میں اردو کو اس طرح نظر انداز کیا گیا، ہندی اور اردو کو مساوی درجہ کے ساتھ سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کوئی ایسا نہیں ہے، جس کی نظیر موجود نہ ہو، کناڈا، سوئٹزرلینڈ اور جنوبی افریقہ میں دو زبانوں میں وہاں کا کاروبار جاری ہے اگر امریکہ اور دوسرے ملکوں کے کانسٹی ٹیوشن کو سامنے رکھ کر یہاں قانون سازی کی جاسکتی ہے تو کیا زبان کے معاملہ میں دوسرے ملکوں کی مثال کو سامنے نہیں رکھا جاسکتا؟ اور اب تو خود ہمارے یہاں مشرقی پنجاب میں ہندی اور گورمکھی دو زبانوں اور رسم خط کو سرکاری درجہ دیا جاچکا ہے۔

لیکن معلوم ہے کہ یہ زمانہ دلائل کا نہیں جذبات کا ہے۔یوپی حکومت کے وزرا آپ سے آپ دلائل بھی دینے کی زحمت اٹھا رہے ہیں، پالیوال جی فرماتے ہیں کہ اردو صرف شہری حلقہ کی زبان ہے، جس میں ہر مذہب وملت کے لوگ رہتے ہیں، دیہی آبادی کی زبان نہیں۔دوسری طرف اردو کے قدیم محسن سمپورنا نند جی کا ارشاد ہے کہ اردو اس صوبہ میں صرف ۱۴ فیصدی آبادی کی زبان ہے، اس کو سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔پہلے یہ وزراء اپنے بیانوں میں کسی ایک بات پر اتفاق کرلیں، پھر جب موجودہ فساد انگیز ذہنیت کے دور کا خاتمہ ہوگا اور مسائل کو دلائل سے پرکھنے کا دور آئے گا اس وقت ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر گفتگو کی جاسکے گی اور شاید اس وقت اردو کو وہ مرتبہ حاصل ہوسکے گا جو اس کو اپنے مرکز میں حاصل رہنا چاہیے۔

(معارف،نومبر ۱۹۴۷ء)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

اردو لٹریچر میں الحاد و فحش نگاری کی وبا

نئے اور ترقی پسند ادب کے دل پسند ناموں سے اردو لٹریچر میں الحاد و بے دینی اور عریانی و فحش نگاری کی جو وبا پھیل رہی ہے، اس کی مضرتوں کو بلا استثنا ہر سنجیدہ طبقہ محسوس کر رہا ہے اور مختلف حلقوں سے اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگی ہیں، اشخاص کے علاوہ بعض اخبارات و رسائل نے بھی اس کی طرف توجہ کی ہے، اس سلسلہ میں سے مؤثر قدم بمبئی کے ایک ادارہ اردو اصلاح ادب کانفرنس نے اٹھایا ہے، اس کے قیام کا مقصد ہی نئے ادب کی اس بے راہ روی کی اصلاح ہے اور اس میں نئے اور پرانے دونوں خیال کے سنجیدہ اشخاص برابر کے شریک ہیں، چنانچہ گذشتہ اگست میں جناب ماہر القادری کی صدرات میں جناب راجہ صاحب محمود آباد نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا اور ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر سلیم چشتی، لاہور اور دوسرے مختلف طبقہ و خیال کے اشخاص نے تقریریں کیں، ضرورت ہے کہ سنجیدہ اخبارات و رسائل بھی اس اخلاقی اصلاح میں پورا حصہ لیں۔

کہا جاتا ہے کہ نیا ادب زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان اور ہماری معاشرتی خرابیوں کا مصلح ہے اور سیاسی انقلاب مظلوموں، کسانوں اور مزدوروں کی حمایت و ہمدردی اس کا مقصد ہے، یہ سب تسلیم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ الحاد و بے دینی اور عریانی و فحش نگاری ان میں سے کس چیز کے لیے ضروری ہے اور کیا بغیر اس کے معاشرتی خرابیوں کی اصلاح اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوسکتی، پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں نئے ادب کا کون سا مقصد موجود نہیں ہے، بلکہ انہوں نے اس زمانہ سے ان مقاصد کی تبلیغ شروع کی جب موجودہ ترقی پسند ادیبوں نے ہوش بھی نہ سنبھالا تھا اور انہوں نے جو روح پیش کر دی ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمارے ادیبوں کو عرصہ لگے گا لیکن

اس کے باوجود مذہب کے استخفاف اور فحش نگاری کا کیا ذکر، ان کی تحریریں متانت کے حدود سے نہیں نکلنے پائی ہیں اور دین ومذہب اور سیاست ہر چیز کو اپنے درجہ پر رکھا ہے، اگر معاشرتی اصلاح کے سلسلہ میں اخلاقی کمزوریوں کا اظہار ناگزیر ہو تو اس سے اس طرح گزرنا چاہیے کہ اصل مقصد بھی فوت نہ ہو اور ادب کی پاکیزگی پر دھبہ بھی نہ آنے پائے، یہی ایک اچھے ادیب کا کمال ہے۔

نئے ادب والوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ خود ان کے مقصد کے لیے مفید نہیں ہے، اس لیے کہ غیر سنجیدہ تحریر کا اثر اچھا اور دیرپا نہیں پڑتا، جو ادب سنجیدگی کے دائرہ سے نکلے گا، ممکن ہے زمانہ کے فساد مذاق کی وجہ سے اس کو عارضی فروغ حاصل ہو جائے لیکن بالآخر ختم ہو جائے گا، ہماری پرانی شاعری آخر کیوں بدنام اور آج کیوں دم توڑ رہی ہے؟ جان صاحب کی ریختی، امانت کا واسوخت، اپنے دور کے رجحانات کے پورے ترجمان اور ترقی پسند ادب کی اصطلاح میں ادب و زندگی کی مطابقت کا نمونہ بھی ہیں لیکن آج ان کا جو درجہ ہے، وہ معلوم ہے، ایسی حالت میں آج کے غیر سنجیدہ لٹریچر کے ساتھ کل زمانہ جو فیصلہ کرے گا، اس کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔

ترقی پسند اپنے اس ادبی تنزل کو روشن خیالی اور آزادی اور اس کے خلاف لب کشائی کو تنگ نظری اور رجعت پسندی سے تعبیر کرتے ہیں، شاید انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ آزادی اور روشن خیالی ایک خاص دائرہ کے اندر تو آزادی ہے، اس سے باہر نکل کر وحشت بن جاتی ہے، بلکہ بے قید آزادی ہی کا نام وحشت ہے، تہذیب وشائستگی نام ہے پابندیوں کا، ایک مہذب انسان مختلف قسم کے قیود اور ذمہ داریوں کا پابند ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں ایک وحشی انسان پر کوئی پابندی نہیں، شائستگی کا درجہ جتنا بڑھتا جائے گا، اتنی ہی پابندیاں بڑھتی جائیں گی، پھر قانوناً اور اخلاقاً آزادی کی اجازت اسی حد تک ہے جب تک دوسروں کے حقوق پر اس کا اثر نہ پڑے، دوسروں کے حقوق کی سرحد شروع ہوتے ہی آزادی پر پابندی عائد ہو جاتی ہے، اسی پر ہم سب کا عمل ہے، بڑے سے بڑا ترقی پسند انقلابی بھی کسی عزیز اور بزرگ کی سچی اور واقعی برائی بھی اعلانیہ بیان کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور نہ اس کو قانوناً اور اخلاقاً اس کا حق ہے، ایسی حالت میں خدا اور رسول اور مذہب کا استہزاء جو ایک مسلمان کی سب سے زیادہ عزیز متاع ہے، کس آئین سے جائز ہو سکتا ہے؟ کیا مشق آزادی کے لیے صرف مذہب ہی رہ گیا ہے؟

نئے ادب کو سب سے زیادہ بدنام ان نام نہاد ترقی پسندوں نے کیا ہے جن کو اس کی اصلی غرض و غایت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ان کو اس کی عملی وسیاسی حیثیت سے واقفیت ہے، بلکہ ان کا مقصد صرف اپنی گرمیٔ بازار ہے، انھوں نے دیکھا کہ نئے بازار میں اسی جنس کی مانگ ہے، اس لیے پرانے بازار سے اپنی دوکان بڑھا کر نئے بازار میں لگادی، یہی وجہ ہے کہ نئے ادب کے دعویٰ کے برعکس ان کے ادب اور ان کی زندگی میں کوئی مطابقت نہیں، زبان پر انقلاب اور مزدوروں کی ہمدردی کا نعرہ ہے لیکن زندگی سراسر رندانہ، زبان سرمایہ داروں کی دشنام طرازی میں مشغول ہے لیکن پیٹ ان کے خوان کرم کر ریزہ چیں ہے۔

درحقیقت مذہب کو موسمی ہواؤں یعنی زمانہ کے تغیر پذیر خیالات کا پابند بنانا بڑی اصولی غلطی ہے، اس لیے کہ یہ ہوائیں تو برابر بدلتی رہتی ہیں، ہر پچیس تیس سال کے بعد خیالات اور نقطۂ نظر بدل جاتے ہیں، مذہب کہاں تک ان کے ساتھ قالب بدلتا رہے گا، ادھر چند ہی برسوں کے اندر خیالات میں کتنے مدو جزر ہو چکے ہیں، ایک زمانہ میں مذہب کو مغربی خیالات اور جدید علوم وفنون کے مطابق ڈھالنا بڑے فخر کی بات اور ترقی پسندی کی معراج سمجھی جاتی تھی لیکن آج اس کی حیثیت ایک مضحکہ انگیز کوشش سے زیادہ نہیں ہے، اس دور کے ایک قریب العہد بزرگ جو علی گڑھ کالج کے پرانے ممتاز تعلیم یافتہ اور صوبہ کے ایک اعلیٰ عہدہ پر ممتاز ہیں، اپنے عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں علامہ اور سرسید احمد خان وغیرہ سے خفا ہوں کہ انھوں نے جزم و ایمان میں تذبذب پیدا کردیا، بلا سے تھوڑے سے مسلمان بددین ہوجاتے، اسلام تو بدنہ ہوتا، اس لٹریچر نے سخت نقصان پہنچایا، اس پچاس برس کے بعد مغرب جو کچھ بول رہا ہے وہ عین اسلام ہے، مگر اس وقت کی مغربی ذہنیت پر اسلام کو منطبق کرنے کی فکر میں نہ معلوم کہاں سے کہاں اسلام کو پہنچادیا اور ان کے اعقاب اب اور خطرۂ ایمان بن گئے ہیں، والحمد اللہ نحن براء من ذلک۔''

دیکھیے کہ ایک تہائی صدی کے اندر نقطۂ نظر اور خیالات میں کتنا عظیم فرق ہوگیا، آج سے تیس سال پیش تر جو لٹریچر ترقی پسند سمجھا جاتا تھا، آج اسی دور کے ایک تعلیم یافتہ کی زبان سے اس کی یہ قیمت قرار پاتی ہے، مذاق کے اور خیالات کے تغیر کے ساتھ آج کے ناقدین مذہب اور متکلمین کے

افکار وخیالات کے ساتھ کل یہی واقعہ پیش آنے والا ہے، اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ مذہب کے استہزاء، اس پر تنقید یا اس کو زمانہ کے مذاق کے مطابق ڈھالنے کے بجائے لوگوں کے خیالات کو اس کی صداقتوں کے مطابق بنانے اور ان میں مذہب کا صحیح ذوق اور وجدان پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔(معارف، اکتوبر ۱۹۴۳ء)

اردو زبان میں انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کی تجویز

ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ نے اپنی نئی زندگی میں اردو اور ہندی کے رکے ہوئے کاموں کا سلسلہ پھر شروع کر دیا ہے اور اردو سکشن نے مختلف فنون پر مفید کتابوں کی تالیف واشاعت کا پروگرام بنایا ہے جس کا اخبارات اور رسائل میں اعلان ہو چکا ہے، اس پروگرام میں ابتدا سے ۱۹۴۲ء تک کی تمام اردو مطبوعات کی فہرست کی ترتیب بھی شامل ہے، سب سے اول مولانا شبلی مرحوم کی تحریک سے محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی نے اس کام کو انجام دیا تھا، ان کی مرتبہ فہرست ۱۹۲۳ء میں شائع ہو چکی ہے لیکن اس میں تمام مطبوعات کا احاطہ نہ ہوسکا تھا، اس کے بعد تقریباً دس گیارہ سال ہوئے ہندوستانی اکیڈمی نے اردو زبان کے سروے کے سلسلہ میں اس وقت تک کی اردو تصانیف کی فہرست بھی مرتب کرائی تھی، یہ بھی ناقص تھی اور اس کو بھی کئی سال ہو گئے، اردو کتابوں کی تالیف اور دوسری زبانوں کے اردو تراجم اور ان کی اشاعت کا اصل زمانہ یہی بیس پچیس سال کی مدت ہے، اس میں جتنی کتابیں تالیف وترجمہ ہوئیں، اتنی اس سے پہلے نصف صدی بلکہ شاید پوری صدی میں نہ ہوئی تھیں، اس لیے ایک نئی فہرست کی ضرورت تھی، جس کی جانب ہندوستانی اکیڈمی نے توجہ کی ہے لیکن یہ کام کسی ایک فرد یا ایک ادارہ کے بس کا نہیں ہے اور مختلف کتب خانوں کے مہتمموں، تجارتی مکتبوں، مطبعوں اور ناشروں کی امداد کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہوسکتی، امید ہے کہ یہ لوگ اس مفید کام کی تکمیل میں اکیڈمی کی پوری مدد کریں گے، مزید معلومات اور تفصیلات سکریٹری ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے حاصل ہوسکتی ہیں۔

اکیڈمی نے مختلف فنون کی کتابوں کی تالیف کا جو پروگرام بنایا ہے وہ اپنی جگہ پر بہت مفید ہے لیکن ان موضوعوں پر مختلف اصحاب علم بھی کتابیں لکھتے رہتے ہیں اور علمی وادبی اداروں سے بھی نکلتی رہتی ہیں، اردو زبان میں انسائیکلوپیڈیا کی بڑی کمی ہے اور یہ کام اتنا عظیم الشان ہے کہ حکومت کی امداد و سرپرستی کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا، اگر ہندوستانی اکیڈمی اس علمی مہم کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو ایک

بڑی کمی پوری ہوجائے گی اور یہ اکیڈمی کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہوگا، یہ ایک ایسا کام ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے مفید ہے، ایک ہی انسائیکلوپیڈیا کے اردو اور ہندی دونوں ایڈیشن شائع ہوسکتے ہیں اور اس کام میں بیرونی اصحاب علم اور علمی ادارے بھی امداد اور اشتراک عمل کے لیے تیار ہوجائیں گے، اگر انسائیکلوپیڈیا کا کام ممکن نہ ہو تو ایک بک آف نالج کے طور پر عام معلومات ہی کی ایک کتاب تیار ہوجائے تو بھی غنیمت ہے، امید ہے کہ اکیڈمی کے محترم ارکان اس پر غور فرمائیں گے۔(معارف، دسمبر ۱۹۴۳ء)

شبلی انٹر کالج کو دولت آصفیہ کی مالی مدد

دولت آصفیہ کے فیض کرم سے ہندوستان کا کوئی اسلامی ادارہ محروم نہیں۔علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالمصنّفین بھی اس سرچشمۂ فیض سے سیراب ہیں۔ ناظرین معارف کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ ان کی تیسری یادگار شبلی انٹر کالج کو بھی اس مہینہ میں اس سرکار ابد قرار سے یکمشت پانچ ہزار کا گراں قدر عطیہ مرحمت ہوا ہے۔تمام وابستگان دامن شبلی اس عطیۂ شاہانہ کے ممنون اور سپاس گذار ہیں۔کیا عجب ہے کہ دولت آصفیہ کی نظر التفاق اور دست گیری سے شبلی انٹر کالج ایک دن ڈگری کالج کے درجہ تک پہنچ جائے۔گذشتہ مہینہ علامہ مرحوم کی یادگار کے سلسلہ میں شبلی کالج کے زیر اہتمام مختلف علمی و ادبی تقریبات ہوئیں اور متعدد اصحاب علم نے مولانا مرحوم کے سوانح، ان کے علمی و عملی کارناموں اور دوسرے علمی موضوعوں پر تقریریں کیں اور مقالات پڑھے۔(معارف، دسمبر ۱۹۴۳ء)

ہندوستان کے اسلامی عہد کے متعلق صحت اغلاط تاریخی کی تجویز

بیرونی اجنبی قوموں نے خاص سیاسی اغراض کے ماتحت ہندوستان کے اسلامی عہد کی نہایت غلط اور مسخ تاریخیں لکھیں، جن کا مقصد یہاں کے مختلف فرقوں میں باہم بغض و منافرت پھیلانا، ان کے دلوں سے ان کے شان دار ماضی اور ان کے اسلاف کے کارناموں کی وقعت گھٹانا، ان کی پستی اور نئی حکمراں قوم کی عظمت و برتری کا نقش جمانا تھا، اس کے جو مذموم نتائج نکلے وہ نگاہوں کے سامنے ہیں، اسی قسم کی تاریخیں تعلیم گاہوں میں داخل کی گئیں، اس لیے جدید تعلیم یافتہ نسل کے دل و دماغ ابتدا ہی سے ان کے زہریلے اثرات سے متاثر ہوتے رہے، اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود ہندوستانیوں نے

جو تاریخیں لکھیں وہ بھی بالعموم ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں، اس لیے عرصہ سے ایسی تاریخ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں واقعات کی صحت، غلط واقعات کی تحقیق وتنقید اور قومی تعمیر کے عناصر کا خاص لحاظ رکھا جائے، بعض اصحاب علم نے اپنے مضامین اور تحریروں میں اس مقصد کو پیش نظر بھی رکھا لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے بس کا نہیں ہے، اب بعض علمی و تعلیمی اداروں نے بھی اجتماعی طور سے یہ کام شروع کیا ہے، چنانچہ انڈین ہسٹری کانگریس، بھارتیہ اتہاس پریشد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تاریخ ہندوستان کی تدوین کا کام ہو رہا ہے، دارالمصنّفین نے بھی اس کو شروع کیا ہے، جس کا تذکرہ ان صفحات میں آچکا ہے۔

تاریخوں کے لکھنے کا موقع بار بار نہیں آتا، اس لیے ان اداروں کو ابتدا ہی سے مذکورۂ بالا اہم اور ضروری پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہیے، ورنہ اگر ان تاریخوں میں بھی فروگذاشتیں رہ گئیں تو پھر اس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی اور چوں کہ یہ اپنی قومی تاریخیں ہوں گی، اس لیے ان کی غلطیاں دوسری اقوام کی لکھی ہوئی تاریخوں سے غلطیوں سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوں گی۔

اس سلسلہ میں چند باتیں خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں ایک یہ کہ تاریخ لکھنے میں کسی قوم اور فرقے کا اپنے ذاتی نقطۂ نظر اور مخصوص قومی مقاصد سے یکسر خالی الذہن رہنا بہت دشوار ہے، اس لیے اس کی توقع بھی نہیں کی جاتی لیکن اگر مذکورہ بالا اہم مشترکہ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر دوسرے امور میں اپنے مخصوص قومی نقطۂ نظر کی ترجمانی میں چنداں مضائقہ نہیں ہے، دوسرے یہ کہ دنیا کی کسی حکومت کا دامن خامیوں اور کوتاہیوں سے پاک نہیں اور نہ سب کے سب حکمراں عدل ومساوات کا نمونہ ہوتے ہیں، کیا خود اپنی قومی حکومت کے ہاتھوں اپنے ہم قوم محکوموں کے ساتھ بے عنوانیاں نہیں ہوتیں اور کیا خود اپنی قوم کے ہاتھوں حکومتوں کو نقصان نہیں پہنچے اور کیا عدل ومساوات کا یہ دور جس کو مذہبی تعصب سے خالی کہا جاتا ہے، ایسی مثالوں سے خالی ہے، ایسی حالت میں کسی حکومت یا حکمراں کے ہر فعل کو محض اختلاف مذہب یا تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، بعض بے عنوانیاں حکومت کے ذاتی مصالح، عام سیاسی پالیسی اور مذہب سے قطع نظر ان کی قومی سرشت کا نتیجہ ہوتی ہے، جس کو مذہبی جذبہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جس کا اثر بلاتفریق مذہب تمام محکوموں پر پڑتا ہے، اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ گذشتہ حکومتوں کے ہر جائز اور ناجائز فعل کو سراہا جائے بلکہ یہ ہے کہ ان کو محض

اختلاف مذہب کی عینک سے نہ دیکھا جائے اوران کی غلطیوں اور بے عنوانیوں کوان کی حد کے اندر محدود رکھا جائے، انہیں آب ورنگ دے کر چمکایا نہ جائے اوران کی کوتاہیوں کے ساتھ فراخ دلی سے ان کے محاسن کا بھی اعتراف کیا جائے، یہ بھی واضح رہے کہ محض حسن ظن اورسوئے ظن سے ایک ہی واقعہ کے متعلق نتائج بالکل بدل جاتے ہیں، بلکہ بسااوقات متضاد ہوجاتے ہیں۔

کسی تاریخ خصوصاً اپنی قوم کی تاریخ کی تدوین میں اعلیٰ قومی مقاصد کالحاظ رکھنا تاریخ نگاری کی دیانت کے خلاف نہیں ہے، تاریخی دیانت اورخیانت کا مقصد یہ ہے کہ ذاتی جذبات، فرقہ وارانہ اغراض اور پست مقاصد کے لیے تاریخ کو مسخ یا اس پر ملمع نہ کیا جائے، یہ نہیں کہ غایت دیانت داری اورغیر جانب داری میں قومی تعمیر کے عناصر کونظر انداز کردیا جائے اورنہ اس دیانت کا ثبوت آج تک کسی قوم کے مورخ نے دیا ہے، موجودہ زمانہ کی تاریخوں کونہ صرف قوموں کونیک نام اور بدنام کرنے بلکہ ان کو بنانے اور بگاڑنے میں بھی دخل ہے، اس لیے ان کی تدوین میں کسی حال میں بھی قومی مقاصد سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ میں جس کا ابھی تعمیری دور ہے۔

(معارف، فروری ۱۹۴۴ء)

اردو کا حق

گذشتہ مہینہ کی آخری تاریخوں میں کاشی پرچارنی سبھا کی سلور جبلی منائی گئی، اس کے محترم صدر نے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں بڑی پرزورتقریر کی، اس میں دوباتیں خاص طور سے دلچسپ نظر آئیں، ایک ہندی کی عالم گیریت یعنی ہندوستان کے باہراس کی مقبولیت اور اشاعت کا دعویٰ، دوسرے ہندوستان میں ریڈیو کے ذریعہ عربی اور فارسی کلچر کی اشاعت کی سازش کا انکشاف، اب تک ہندی کے مشترکہ اورعمومی زبان ہونے کا دعویٰ ہندوستان کے اندر تک محدود تھا، اس کی عالم گیری کی یہ پہلی آواز ہے، دیکھیں آئندہ اس تخم ریزی سے کیا کیا شاخیں پھوٹتی ہیں، لائق صدر نے غالباً اس لیے ریڈیو پر غصہ کا اظہار کیا ہے کہ اس میں عام فہم زبان کیوں بولی جاتی ہے، ٹھیٹھ ہندی کیوں نہیں بولی جاتی لیکن وفور جوش میں جناب صدر کی نگاہ اس پہلو پر نہیں گئی کہ ان کا یہ غصہ اور الزام دوسرے لفظوں میں اس کا اعتراف ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان وہی ہے جو ریڈیو پر بولی جاتی ہے، اس لیے کہ ریڈیو میں وہی زبان چل سکتی ہے جسے سارا ہندوستان سمجھتا ہو۔

مالوی جی کا لہجہ البتہ اس مرتبہ خلاف معمول اردو کے حق میں مشفقانہ تھا، انہوں نے اس کو ہندی کی بہن تسلیم کیا ہے اور اس کی ترقی کی بھی خواہش ظاہر کی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہندی کو یہ ترجیحی حق عطا فرمایا ہے کہ عدالت کی زبان اسی کو ہونا چاہیے، اردو کو ہندی کی بہن تسلیم کرنے کے بعد پھر مادر ہند کے اس ترکہ میں ہندی کا ترجیحی حق کیوں ہے، اردو تو ہندو قانون وراثت کے مطابق بھی اس سے محروم نہیں ہوسکتی، اس پورے مجمع میں ایک بلبل ہند کے نغمہ میں صداقت تھی کہ "ہندوستان کی زبان وہی ہونی چاہیے جو صوبۂ متحدہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے" اردو کے حامی بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے۔ (معارف، فروری ۱۹۴۴ء)

عربی مدارس کی باہمی تنظیم اور اشتراک عمل کی ضرورت

ہندوستان میں اسلام اور اسلامی کلچر کی حفاظت کی مدعی تو بہت سی جماعتیں ہیں لیکن درحقیقت اس کی حفاظت و پاسبانی کا اصل فرض عربی مدارس ادا کرتے ہیں اور آج ہندوستان میں دین و مذہب کا جو چرچا اور اسلامی کلچر کے جو نقوش بھی باقی ہیں، وہ ان ہی کی بدولت ہیں، اسلامی کلچر کے حفاظتی قلعے مسلمانوں کے پرشکوہ ایوان نہیں بلکہ غریبوں کے یہی جھونپڑے ہیں، گو مسلمانوں کی غفلت سے ان مدارس کو دنیاوی فراغت واطمینان کے سامان بہت کم حاصل ہیں لیکن اس حالت میں بھی دین کی خدمت کا سررشتہ ان سچے خدمت گزاروں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے اور وہ صبر وقناعت کے ساتھ برابر اپنا فرض ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اگرچہ مذہبی تعلیم کا رواج روز بروز کم ہوتا جاتا ہے لیکن خدا کو ایک جماعت سے دین کی حفاظت کا کام لینا منظور ہے، اس لیے دینی تعلیم سے مسلمانوں کی غفلت کے باوجود الحمدللہ عربی مدارس کی کافی تعداد موجود ہے، ان سب کا مشترکہ مقصد دین اور دینی علوم کی خدمت ہے لیکن اس اتحاد مقصد کے باوجود ان میں باہم کوئی تنظیم اور اشتراک عمل نہیں ہے، جو تعلیمی اور دینی دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے، عموماً ایک مدرسہ کے طلبہ، مدرسین اور منتظمین دوسرے مدارس سے کوئی ربط وعلاقہ نہیں رکھتے بلکہ ایک دوسرے کے حالات تک سے بے خبر ہوتے ہیں، جس سے ان میں اتحاد و یگانگت کے بجائے اجنبیت اور دوری پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے تجربات اور مفید مشوروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اگرچہ یہ مدارس اپنی اپنی جگہ پر خاموشی کے ساتھ تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن ان کے ذمہ تنہا یہی فرض نہیں ہے، بلکہ ان پر اور بھی ذمہ داریاں ہیں، بہت سے مذہبی اور خود تعلیمی معاملات ایسے ہیں جن کے باہمی صلاح ومشورہ اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے، مذہبی اور تعلیمی ضروریات کے مطابق وقتاً فوقتاً نصاب اور طریقۂ تعلیم میں تغیر وتبدل کی ضرورت پیش آتی ہے، حالات کے اقتضاء کے مطابق دین کی خدمت کے بعض پرانے طریقے بدلتے اور نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، آئے دن نئے نئے مذہبی اور مذہب سے قریبی علاقہ رکھنے والے سیاسی ومعاشرتی مسائل پیش آتے رہتے ہیں، جن کا حل ان مدارس کے ذمہ ہے لیکن چوں کہ ان میں باہم اشتراک عمل تعلیم کے علاوہ خدمت دین کا کوئی مشترک پروگرام اور تقسیم عمل نہیں ہے، اس لیے مذکورۂ بالا مسائل میں بعض اوقات ان کا طریقۂ کار باہم مختلف بلکہ متضاد ہوجاتا ہے، جس سے ان میں بعد اور دوری بڑھتی ہے، ان حالات کے پیش نظر عربی مدارس کی تنظیم اور ان میں باہم اشتراک عمل کی بڑی ضرورت ہے۔

مختلف مدارس کی انفرادی خصوصیات کی بنا پر ان کے ذوق اور طریقۂ کار میں اختلاف ہونا ایک طبعی امر ہے، جو ہر زمانہ میں موجود رہا ہے بلکہ انفرادی طبعی رجحانات کی بنا پر خود ایک مدرسہ کے افراد کے ذوق اور طریقۂ کار میں باہم اختلاف ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے، اس لیے نفس اختلاف مذاق کوئی خطرہ کی چیز نہیں بشرطے کہ وہ باہمی مخالفت کا ذریعہ نہ بن جائے، مدارس کی تنظیم اور اشتراک عمل سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ذوق اور طریقۂ کار کے اختلاف کے باوجود ان میں اتحاد ویگانگت کا رشتہ قائم رہے گا اور آپس کی بے تعلقی اور ایک دوسرے کے حالات کی بے خبری سے عموماً جو بے اعتمادی، مدرسی عصبیت اور جماعت بندی پیدا ہوجاتی ہے، وہ نہ ہونے پائے گی اور مدارس کی انفرادی خصوصیات اور ان کا اختلاف ذوق تفریق کا ذریعہ بننے کے بجائے خدمت دین میں تفنن اور تنوع کی شکل اختیار کرلے گا۔

یہ مسئلہ ایک دوسرے پہلو سے بھی لائق توجہ ہے، یہ ظاہر ہے کہ کسی درس گاہ کے اثرات تعلیم ختم ہوجانے کے بعد بالکلیہ طلبہ سے زائل نہیں ہوجاتے، بلکہ آئندہ زندگی میں بھی کسی نہ کسی حد تک باقی رہتے ہیں، ان ہی طلبہ میں سے کچھ لوگ آگے چل کر مسلمانوں کے رہنما بنتے ہیں اور ان کی پبلک زندگی میں بھی ان اثرات کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں،، اس لیے اگر وہ مدارس سے باہمی یگانگت

اور اشتراک عمل کا سبق سیکھ کر نکلیں گے تو اس کے اچھے اثرات ان کی پبلک زندگی میں بھی ظاہر ہوں گے، جس کی اس زمانہ میں بڑی ضرورت ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کے اور بہت سے مفید کام اس تنظیم اور اشتراک عمل کے ذریعہ زیادہ بہتر طریقہ سے انجام پا سکتے ہیں جو انفرادی کوششوں کے ذریعہ ممکن نہیں۔(معارف، مارچ ۱۹۴۴ء)

مسلم یونیورسٹی میں تبلیغ اسلام کی ضرورت

چند دن ہوئے علی گڑھ میں ''اسلامی جماعت'' کے نام سے ایک نئی مجلس کا قیام عمل میں آیا ہے، جس کا تذکرہ ان صفحات میں آچکا ہے، اس مجلس کا مقصد مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح اور اسلامی شعائر کی پابندی کی تبلیغ اور اسلامی تعلیمات کا احیاء ہے، حال میں مجلس کے کارکنوں کی جانب سے اس کے اغراض و مقاصد اور اس کا نظام عمل شائع ہوا ہے، اس سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اب کارکنوں نے عملی قدم اٹھایا ہے اور وہ ہر صوبہ میں مجلس کی شاخیں قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ ارادہ نہایت مبارک ہے لیکن اس قسم کی تحریکیں عموماً آل انڈیا بننے کے بعد بے نتیجہ ہو جاتی ہیں، ایسا نہ ہو کہ اس تحریک کا بھی یہی انجام ہو، اس لیے اگر مجلس مذکور اس وسیع دائرۂ عمل میں اپنی زیادہ توجہ مسلم یونیورسٹی پر صرف کرے تو یہ سارے ہندوستان میں تبلیغ و اشاعت سے کم مفید نہ ہوگا، یونیورسٹی مسلمانوں کا مرکزی تعلیمی ادارہ ہے جس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے نوجوان طلبہ اور اہل علم و صاحب دماغ فضلاء کا اجتماع ہے، اگر اس کے اساتذہ اور طلبہ میں صحیح اسلامی روح پیدا ہو جائے اور وہ یہاں سے مذہبی اثرات لے کر نکلیں تو ان کے ذریعہ خود بخود یہ چیز سارے ہندوستان میں پھیل جائے گی لیکن اصلی سوال عملی کوشش کا ہے، اس قسم کی مجالس کے قیام سے اتنا تو بہرحال اندازہ ہوتا ہے کہ اب ہوا کا رخ بدل گیا ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مسلمانوں کی اصلی اور صحیح اصلاح کا احساس پیدا ہو گیا ہے جو امید ہے کہ آئندہ چل کر کوئی مفید صورت بھی اختیار کر لے۔(معارف، اپریل ۱۹۴۴ء)

مخرب اخلاق اردو لٹریچر کی عدم اشاعت کا مشورہ

ترقی پسند ادب کی عریاں نویسی اور فحش نگاری کے متعلق معارف میں بھی لکھا جا چکا ہے اور ہندوستان کے بہت سے سنجیدہ اصحاب علم اور اہل قلم حضرات نے بھی اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں

لیکن یہ وبا برابر پھیلتی جاتی ہے، اس پست اور مخرب اخلاق لٹریچر کی اشاعت میں پنجاب کے بعض ادبی رسالوں کا قدم سب سے آگے ہے اور انہوں نے ادب لطیف کے پردہ میں ادب کثیف کی اشاعت کو مستقل مقصد بنالیا ہے، جس کو کوئی سنجیدہ انسان پڑھ نہیں سکتا۔

پنجاب خصوصاً لاہور ہندوستان میں اردو ادب کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے لیکن افسوس وہاں کے برعکس نام نہند "ترقی پسند" ادیب، اپنی نافہمی سے اس کے اس امتیاز کو داغ دار بنا رہے ہیں، ناصاف آبادی کے اژدہام میں جہاں وبا کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے، حفظان صحت کے اہتمام کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے، اس لیے پنجاب کی ادبی پیداوار کی نگرانی کی بڑی ضرورت ہے اور یہ فرض سب سے زیادہ وہاں کے سنجیدہ اصحاب قلم پر عائد ہوتا ہے، جن کی لاہور میں کمی نہیں، وہاں زمین شعر وادب کے زمین دار بھی ہیں، آسمانِ صحافت کے مہر بھی ہیں، راہ ادب کے سالک بھی ہیں، کثافتوں کی تطہیر کے لیے زمزم وکوثر بھی موجود ہیں، ان کی موجودگی میں یہ ادبی گمراہی حیرت انگیز ہے، ان کی نوک قلم میں تو بڑے بڑے فاسد مادوں کو خارج کردینے کی قوت ہے، یہ ادبی فساد تو ان کی ادنیٰ توجہ سے دور ہوسکتا ہے۔ (معارف، مئی ۱۹۴۴ء)

اردو زبان کا مسئلہ

قومی اور جمہوری حکومت نے اردو زبان کے ساتھ چند مہینوں میں جو سلوک کیا وہ غیر ملکی اور مستبد حکومت چند صدیوں میں بھی نہ کرسکی تھی۔ اور اس کے جواز کے لیے جو دلیل پیش کی جاتی ہے، اس کو نہ منطق سے واسطہ ہے نہ سچائی سے، اسے کون منصف مزاج یقین کرسکتا ہے کہ صوبہ متحدہ کی اکثریت کی زبان ہندی اور اردو صرف ۱۴ فیصدی کی زبان ہے، یہاں تک تو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ علمی وادبی اردو، عام بول چال کی زبان اور شہری اور دیہاتی زبان میں فرق ہے لیکن صرف عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش، تلفظ کی صحت وشایستگی اور لب ولہجہ کا کوئی ایسا بنیادی فرق نہیں ہے جس کی بنا پر ان زبانوں کو بھی مختلف زبانیں کہا جائے، چہ جائیکہ ان کو ہندو مسلم زبانیں قرار دیا جائے، زبان کی یہ تقسیم بالکل نئی ہے شہر کے باشندوں کی زبان خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اسی طریقہ سے دیہات کے تمام باشندوں کی زبان بالکل ایک ہے، عام بول چال کی زبان ہندو مسلمان یکساں بولتے اور سمجھتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں جو زبان گڑھی جارہی ہے اسے نہ صرف مسلمان بلکہ وہ ہندو بھی نہیں سمجھتے جو

سنسکرت سے ناواقف ہیں اگر ہندی ہوتی تو بھی غنیمت تھا۔

اردو نہ صرف اس لیے کہ ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے بلکہ علمی لسانی سیاسی اور تمدنی کسی حیثیت سے بھی کوئی ہندوستانی زبان اس کے مقابلہ میں حکومت کی زبان بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، وہ خالص ہندوستان کی پیداشدہ ہے اس میں ہندو مسلم دونوں کلچروں کے عناصر یکساں ہیں اس کی زمین تمام تر ہندی اور پراکرت کی ہے، صرف گل بوٹے فارسی اور عربی کے ہیں اس کے قاعدے، مادے، مصادر اور اکثر نام، محاورے اور اصطلاحیں ہندی اور پراکرت وغیرہ کی ہیں صرف وہ اسماء اور اصطلاحیں جو ہندوستانی زبانوں میں نہ تھیں یا ان کے مقابلہ میں عربی اور فارسی کی ان سے زیادہ خوبصورت اور زبان کے لیے قابل قبول تھیں، ان دونوں زبانوں کی ہیں اور ان میں بیشتر الفاظ زبانوں پر اتنے چڑھ چکے ہیں کہ جنہیں ایک دیہاتی بھی آسانی سے سمجھتا ہے، زمینداری، کاشتکاری، مقدمہ عدالت اور حکومت کے مختلف شعبوں کے متعلق عربی اور فارسی کی جس قدر اصطلاحیں ہیں، انہیں کون دیہاتی نہیں سمجھتا، اردو میں ہندوستان کی پرانی زبانوں کے الفاظ کے مقابلہ میں عربی اور فارسی الفاظ کا تناسب چوتھائی سے بھی کم ہے۔ اس میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے مقامی اثرات بھی پوری طرح موجود ہیں، اس کی تفصیل میں پڑنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ راقم نے کئی سال ہوئے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے اجلاس میں اس موضوع پر ایک مفصل مقالہ پڑھا تھا، جو اکیڈمی کے رسالہ کے کئی نمبروں میں چھپ چکا ہے۔

اردو گو ہندو مسلم عوام کے اختلاط سے پیدا ہوئی لیکن اس نے حکومت کی گود میں پرورش پائی اور ایک عرصہ تک ہندو مسلمان ادیبوں اور اصحاب علم وقلم کی تصنیفی زبان رہ چکی ہے اور اب بھی ہے۔ اس نے ہندوستان کی اکثر پرانی زبانوں اور عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ بیرونی زبانوں کے بہترین عناصر کو جذب کیا ہے اس لیے اس میں جو وسعت ہے اور علوم وفنون اور حکومت وتمدن کے ہر شعبہ اور ہر شاخ کے متعلق جس قدر الفاظ اور اصطلاحیں اردو میں موجود ہیں، وہ ہندوستان کی کسی زبان میں بھی نہیں مل سکتیں، انگریزی حکومت اور مغربی تمدن نے جو نئی چیزیں پیدا کیں، ان کے مترادفات بھی اردو میں بن گئے، یا اصل زبان کے جو الفاظ اس میں کھپ سکتے تھے وہ اس میں جذب ہو کر اردو کا جز بن گئے اور آج کوئی نیا لفظ ایسا نہیں ہے جس کا مرادف اردو میں موجود نہ ہو، ان میں اکثر زبانوں پر

چڑھ کر عام ہو چکے ہیں۔ سیاسی حیثیت سے بھی اردو کی کچھ کم اہمیت نہیں، ایشیا کے اکثر ملکوں خصوصاً ہندوستان کے پڑوسی اسلامی ممالک میں ہر جگہ کم وبیش اردو کے سمجھنے والے موجود ہیں، ایشیا کے جن ملکوں میں بھی مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے، ان میں اردو نامانوس نہیں، اس لیے تمام ہندوستانی زبانوں میں ان ملکوں سے ربط وتعلق کا ذریعہ بھی اردو ہی ہو سکتی ہے، سنسکرت اور ہندی صرف ہندوستان کے اندر محدود ہے۔

اردو زبان کا مسئلہ ایسا متفقہ ہے جس پر نہ صرف ہر مسلک وخیال کے مسلمان بلکہ سنجیدہ اور صحیح الخیال ہندو بھی متحد ہیں، گاندھی جی کی رائے سب کو معلوم ہے، حال ہی میں لکھنؤ میں آل انڈیا اردو پریس اور آل انڈیا انجمن ترقی پسند مصنّفین کی جو کانفرنس ہوئی ہیں۔ ان میں ہندو اخبار نویسوں اور ادیبوں نے بھی بالاتفاق اردو کی حمایت اور حکومت کے رویہ پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی جانب سے اردو کی حمایت میں جو اعلان شائع ہوا ہے۔ اس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں اور سکھوں کے نام ہیں، انفرادی طور پر بھی بہت سے ممتاز ہندوؤں نے اردو کی تائید میں بیانات دیے ہیں اور اس جماعت کے علاوہ جو پراچین بھارت کو زندہ کرنا چاہتی ہے، حق پسند ہندو بھی اردو کے ساتھ حکومت کی روش کو پسند نہیں کرتے۔

کانگریس ایک طرف تو بلا اختلاف مذہب وملت ہندوستان کے تمام فرقوں کی نمایندگی، ان کے کلچر کے تحفظ اور متحدہ قومیت کی مدعی ہے، دوسری طرف اردو کے ساتھ جو ہندو مسلمانوں کے میل جول کی پیداوار ان کے اتحاد کی نشانی دونوں کے مشترک کلچر کا سب سے بڑا نمونہ اور اس کی امین ومحافظ ہے، کانگریسی حکومت کا یہ طرز عمل نہایت حیرت انگیز ہے، اگر اردو تنہا مسلمانوں کی زبان بھی ہوتی تو بھی ایک جمہوری ادارہ کی حیثیت سے اردو کا تحفظ کانگریس کا فرض تھا، زبان زبردستی پیدا نہیں کی جاتی، بلکہ طبعی اور فطری...... پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے، اس لیے اردو کے مقابلہ میں نئی زبان کا فروغ پانا آسان نہیں ہے اور ایک نہ ایک دن حکومت کو اردو کا واجبی حق ماننا پڑے گا۔ (معارف، جنوری ۱۹۴۸ء)

کانگریس کی ہندو مسلم اتحاد کی پالیسی اور ٹنڈن جی

ایک طرف کانگریس ہندو مسلم اتحاد ویکجہتی اور باہمی رواداری اور فیاضی کا وعظ کہتی ہے۔

دوسری طرف اس کے ذمہ دار اشخاص فتنہ انگیزی میں مشغول ہیں، حال میں صوبائی اسمبلی اور کانگریس کے صدر ٹنڈن جی نے جو تقریریں کی ہیں، وہ نہ صرف کانگریس کے اصولوں اور ملکی مصالح کے خلاف بلکہ حد درجہ شر انگیز ہیں، ان تقریروں میں انہوں ہندوستان و پاکستان کی تقسیم اور اس سلسلہ کے خونیں واقعات کو نہایت اشتعال انگیز طریقہ سے دہرایا ہے اور مسلمانوں سے ہندی زبان کے ساتھ ہندو کلچر کے جبری قبول کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور اردو زبان کو پیدائش کے علاوہ ہر حیثیت سے غیر ملکی، دو کلچروں کی تفریق اور ہندوستان و پاکستان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور تنہا ہندی کو ہندوستان کی مشترک زبان اور ہندوستانی کلچر کی نمایندہ قرار دیا ہے اور ان کو ہندوستان میں ہندی زبان اور ہندو کلچر کے علاوہ اور کسی زبان اور کلچر کو دیکھنا گوارا نہیں۔

اس سے قطع نظر کہ کانگریس کے ایک ذمہ دار کی زبان سے اس قسم کی تقریریں کہاں تک مناسب ہیں۔ حقیقت واقعہ علم و تحقیق اور منطق و استدلال کے لحاظ سے بھی نہایت مہمل ہے، اچھا برا جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب اس کو عوام کے سامنے بار بار دہرانے سے ان میں اشتعال انگیزی اور منافرت پھیلانے کے سوا کچھ حاصل نہیں، اردو کو غیر ملکی زبان کہنا یا اس سے ناواقفیت کا ثبوت ہے یا صریح جھوٹ ہے اس کی تردید میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، خود منصف مزاج ہندو تک اس کے جوابات دے چکے ہیں، اس لیے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں، اردو پر دو کلچروں کی تفریق اور ہندوستان کی تقسیم کا الزام لگانا اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز ہے۔ اب تک تو اس کو مسلمہ طور پر دونوں کلچروں کے اختلاط کی پیداوار، اس کا زندہ نمونہ اور ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی نشانی سمجھا جاتا تھا، ٹنڈن جی کا یہ انکشاف بالکل نیا اور یہ دعویٰ بالکل نرالا ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

پھر ہندوستان میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں، مرہٹی، گجراتی، سندھی، پنجابی، بنگالی، تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم وغیرہ اور آخر الذکر زبانیں تو اردو سے کہیں زیادہ ہندی سے دور اور اس سے مختلف ہیں اور اس کے بولنے والے ہندو انہیں چھوڑ کر ہندی کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہیں اور اس کی مخالفت میں جیل تک جا چکے ہیں ایسی حالت میں تنہا ہندی ہندوستان کی مشترک زبان اور ہندو کلچر کی نمایندہ کس طرح ہو سکتی ہے۔

رہا ہندوستانی اور بیرونی کلچر کا سوال تو ہندوستانی مسلمانوں کا کلچر خالص اسلامی کب ہے وہ تو ہندو مسلم کلچر کا مرکب ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کا کون سا شعبہ ہندو کلچر کے اثر سے خالی ہے، اس کا تو خود یہ حال ہے۔

ع نقشہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

لیکن اگر ٹنڈن جی کو بیرونی اثرات سے ایسے ہی ''چھوت'' ہے تو وہ ان کو کس کس چیز سے مٹائیں گے، ہندو مذہب تک اس سے پاک نہیں ہے، یہ مورتی پوجا کی مخالفت، آریہ سماج اور برہمو سماج کی تحریکیں، اچھوت ادھار، مساوات کی تعلیم، طلاق اور لڑکیوں کی وراثت کے قوانین اور اس قسم کی دوسری اصطلاحات کس شاستر میں ہیں اور کس کے اثرات ہیں؟ ع دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ۔ ٹنڈن جی اس زمانہ میں تو ہندوستان کے قدیم طریقہ کے مطابق کھانا تک نہیں کھا سکتے تو اور چیزوں کا کیا ذکر ہے پھر سارے بیرونی اثرات کو مٹانے کے بعد ہندوستانی تہذیب رہ کیا جائے گی اور ہندوستان کا حشر کیا ہوگا، یہ طعن و طنز نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں اور تہذیبوں کے اختلاط سے ایک دوسرے کا متاثر ہونا بالکل طبعی ہے جس سے کوئی قوم بھی مستثنیٰ نہیں خود مسلمانوں میں کتنے ہندوانہ رسوم رائج ہیں، دوسرے تمدنوں کے صالح اجزاء کو قبول کیے بغیر کوئی تمدن ترقی نہیں کرسکتا۔

ہندو مسلمانوں کا مشترک تمدن تو ایک ہزار سال پرانا ہے اور بہرحال مشرقی ہے، جس کے بہت سے عناصر خالص ہندی ہیں۔ ٹنڈن جی تو مغربی تمدن کے اثرات کو بھی جو خالص بدیسی ہے جس کو ہندوستانی کلچر سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کی عمر بھی ہندوستان میں نسبتاً بہت کم ہے نہیں مٹا سکے انڈین یونین کا سارا کارخانہ اسی پر قائم ہے ایسی حالت میں اس تمدن کو مٹانے کا تصور جو صدیوں سے ہندوستان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے، خیال خام سے زیادہ نہیں، ٹنڈن جی کو ان اوہام کو چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی بھلائی کا صحیح راستہ اختیار کرنا چاہیے وہ رجز خوانی تو بہت کر چکے، اب ذرا مہر و محبت کے زمزمہ کا بھی تجربہ کرلیں۔ (معارف، جون ۱۹۴۸ء)

ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر میں نظریات کا اختلاف

جدید ہندوستان کی تعمیر میں مختلف جماعتوں کے درمیان خیالات اور نظریوں کا جو اختلاف اور اس کی بنا پر جو اندرونی کشمکش ہے اس میں صرف ایک کانگریس سے صحیح رہنمائی کی امید تھی لیکن اس

وقت اس کی پالیسی خود کمزور مذبذب اور غیر معین سی ہے وہ اپنے بعض اصولوں سے ہٹ گئی ہے اس کے ارکان میں اختلاف ہے، صوبائی حکومتیں اس کے بہتیرے اصولوں اور فیصلوں کی پرواہ نہیں کرتیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت زبان کے جیسے اہم مسئلہ میں ان کی روش ہے۔ اس بارہ میں چند بلند نظر اور کشادہ دل کانگریسیوں کے علاوہ باقی پوری جماعت ہندی زبان اور اس کے ساتھ ہندو کلچر کی حامی ہے۔ آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے تو ہندستانی کو قومی و ملکی زبان قرار دیا ہے گو ابھی رسم الخط کا فیصلہ نہیں ہوا ہے مگر دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے ہندی زبان اور دیوں گری رسم الخط کی تجویز پیش کی ہے صوبائی حکومتیں علاحدہ ہندی نوازی کے ساتھ ساتھ اردو کشی میں بھی مشغول ہیں اور اس کار خیر میں سب سے زیادہ مستعد ہمارے صوبہ کی حکومت ہے سرکاری دفاتر سے تو پہلے ہی اردو نکل چکی تھی۔ اس نئے تعلیمی سال سے تعلیم سے بھی اس کو ختم کر دینے کے منصوبے تھے بلکہ اس کے احکام بھی صادر ہو چکے تھے۔ مگر غالباً تعلیمی دقتوں کی وجہ سے فی الحال اس کو اختیاری زبان کی حیثیت سے باقی رکھا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں انگریزی لازمی ہے۔

ہم کو ہندی سے اختلاف نہیں ہے اب تو وہ سرکاری زبان بن چکی ہے، اس لیے اس کی تعلیمی اہمیت بھی لازمی طور سے بڑھ جائے گی اور ہر شخص کے لیے اس کا سیکھنا ضروری ہے لیکن اتنا تو موقع دیا جائے کہ لوگ اسے سیکھ سکیں یہ کون سا اصول ہے کہ جو شخص آج تک ہندی سے بالکل ناواقف ہے اس کو کل ہی سے ہندی میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے یا جو طالب علم اب تک اس سے بیگانہ ہے اسے بغیر ہندی سیکھے ہوئے دفعتاً تمام مضامین کی تعلیم ہندی میں دی جائے اور یہ دقت صرف مسلمان طلبہ اور اساتذہ کے لیے نہیں بلکہ ہندوؤں کے لیے بھی ویسی ہی دشواری ہے۔

دوسرے یہ کہ اردو کے ساتھ اجنبی زبان کا برتاؤ نہ کیا جائے، چالیس لاکھ سکھوں کے خاطر تو گورمکھی اور اس کے رسم الخط کو سرکاری زبان بنایا جا سکتا ہے لیکن چار کرور مسلمانوں کے خاطر اردو زبان اس کی مستحق نہیں اور پھر قومیت واحدہ کا دعویٰ ہے۔

لیکن غنیمت ہے کہ ان حالات میں گورنر جنرل راجہ گوپال اچاریہ، پنڈت جواہر لال نہرو اور بابو راجندر پرشاد کی زبان سے البتہ وقتاً فوقتاً ہندوستانی کی حمایت کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے جس کو اصولاً مرکزی حکومت کی آواز ہونا چاہیے تھا لیکن خود کانگریس کے حلقہ سے ان کی مخالفت ہوتی ہے۔

چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کی مدراس کی اس تقریر سے جس میں انہوں نے ہندوستانی زبان کی حمایت اور اس کو سنسکرت اور فارسی الفاظ سے بوجھل بنانے کی مخالفت کی تھی خود دستور ساز اسمبلی کے بعض کانگریسی ممبروں نے سخت اختلاف کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ہندوستانی ایک دونسلی اور مبہم زبان ہے وہ بول چال میں یا ادبی حیثیت سے ملک کے کسی حصہ میں رائج نہیں رہی اور صوبائی اور قومی زبان صرف سنسکرت آمیز ہندی ہوسکتی ہے اور ہندوستان کی قومی زبان کو سنسکرت آمیز بنانے میں کوئی حرج نہیں یہ بیان موجودہ عام ذہنیت کا ایک نمونہ ہے ایک طرف تو کانگریسی حضرات اور کانگریسی حکومتیں ہر بات میں گاندھی جی کا حوالہ دیتی ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں دوسری طرف زبان کے معاملہ میں انہیں ان کی رائے اور وصیت کا کوئی پاس ولحاظ نہیں۔

درحقیقت ہندوستان کے ان نادان اور کوتاہ نظر دوستوں نے جو ہندوستان میں ہندو تہذیب کا خواب دیکھ رہے ہیں زبان کو ہندوؤں کا ایسا قومی مسئلہ بنایا ہے کہ بڑے بڑے دانا اس دام میں آگئے لیکن شاید ان کی نگاہ تہذیب وتمدن کی پیدائش ان کی ترقی اشاعت ومقبولیت اور ان کے زوال وخاتمہ کے طبعی اسباب واصولوں پر نہیں ہے ورنہ وہ ان کی فطری رفتار میں مزاحمت نہ کرتے زبان اور تہذیب ومعاشرت وغیرہ کلچر کے تمام اجزا نہ جبر وقوت سے پیدا کیے جاسکتے ہیں اور نہ مٹائے جاسکتے ہیں بلکہ وہ مختلف طبعی عوامل و اسباب کے ماتحت صدیوں بنتے اور بگڑتے ہیں اور ان کی اشاعت وترقی کا ذریعہ قوت نہیں بلکہ ان کی افادی حیثیت، حالات وضروریات کا تقاضا ان سے ان کی مطابقت اور ظاہری نفاست ودل آویزی ہیں۔اس لیے جو کلچر بھی ان اوصاف سے متصف ہوگا وہ خود بخود رائج اور مقبول ہوجائے گا اور کوئی قوت اسے نہ روک سکے گی، تاریخ تمدن کا یہ اصول ہمیشہ سے جاری ہے اور آیندہ بھی جاری رہے گا۔

اس اصول کے پیش نظر ہندو کلچر کے نقیبوں کو غور کرنا چاہیے کہ وہ موجودہ مشترک کلچر کے مقابلہ میں جو عربی ایرانی اور ہندو (اور اب اس میں انگریزی کو بھی شامل کرلینا چاہیے) تمدنوں کے حسین ودلکش عناصر کا بوقلموں اور دل فریب مرقع ہے اور جو صدیوں سے ہندوستانیوں کے رگ وریشہ میں سرایت کرچکا ہے اسے چھڑا کر ہزاروں برس پرانے اور بوسیدہ تمدن کو زندہ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوں گے اور کون ہندوستانی یہ رجعت قہقری کرنا پسند کرے گا۔ ہر دور کا کلچر اس زمانہ

کے سیاسی معاشرتی و معاشی اور دوسرے تمدنی حالات کی پیداوار اور اس کا نتیجہ اور انہی کے لیے موزوں و مناسب ہوتا ہے اور وہ دوسرے حالات میں نہیں چل سکتا اس لیے اس زمانہ میں پرانے کلچر کو زندہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ پھر وہی پرانے حالات بھی پیدا کیے جائیں اور ہندوستان کو کئی ہزار سال پیچھے کی طرف لوٹایا جائے اگر یہ خیال ہے تو البتہ پراچین بھارت کو زندہ کرنے میں مضائقہ نہیں لیکن اس پر غور کرلیا جائے کہ اس ہندوستانی تمدن کا دنیا میں کیا درجہ ہوگا اور وہ اپنا وجود کس طرح قائم رکھے گا، ان اوہام و خرافات کی اس زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں کہ زیادہ سے زیادہ چند معاشرتی آداب و رسوم بدل جائیں گے ورنہ پورے کلچر کو شدھ کرنے کے بعد اس میں رہ کیا جائے گا اور اس کی تصویر کیا ہوگی۔

ہندوستانی کلچر کی عمارت مختلف تہذیبوں کے ستونوں پر قائم ہے اور آئندہ بھی رہے گی، اسی میں اس کا حسن بھی ہے اور استحکام بھی۔ ان میں سے جس ستون کو بھی گرانے کی کوشش کی جائے گی، اس سے عمارت کی مضبوطی اور خوبصورتی میں فرق آجائے گا، ہندی زبان اور ہندو کلچر کے شور سے باہمی تفریق کے سوا اور کچھ حاصل نہیں، جس کے نتائج بد سے اب تک ہندوستان کو نجات نہیں ملی ہے۔ (معارف، اگست ۱۹۴۸ء)

فسادات اور انجمن ترقی اردو اور ندوۃ المصنّفین

ناظرین کو یہ معلوم ہے کہ دلی کے گذشتہ ہنگامے میں انجمن ترقی اردو اور ندوۃ المصنّفین کو بڑا نقصان پہنچا تھا اور خیال تھا کہ وہ مدتوں نہ سنبھل سکیں گے، لیکن اس کے مخلص کارکنوں نے ہمت و استقلال سے اس صدمہ کو برداشت کیا اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ندوۃ المصنّفین نے حسب معمول پھر اپنا کاروبار جاری کر دیا ہے اور اس نے کئی نئی کتابیں شائع کی ہیں، اب ان اداروں کی زندگی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے اس لیے ان کی امداد و اعانت اردو کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے اور کم سے کم مدد یہ ہے کہ ان کی مطبوعات و رسالہ کی خریداری اور اشاعت کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے ہم نے کسی گذشتہ اشاعت میں لکھا تھا کہ دیوان فغان جسے ہمارے رفیق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مرتب کیا تھا اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہونے والا تھا، دلی کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا لیکن ایک تازہ اطلاع سے معلوم ہوا کہ دیوان مذکور محفوظ ہے۔ (معارف، اگست ۱۹۴۸ء)

فرقہ واریت

فرقہ پروری اور الیکشن کے جنون کا اثر سب سے زیادہ دل و دماغ پر پڑتا ہے۔اس کا تازہ ثبوت ہندو مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر کھرے کی وہ تقریر ہے، جو انہوں نے حال ہی میں پٹنہ میں کی ہے۔اس میں انہوں نے سرمایہ داری اور امپیریلزم کی طرح اسلام کو بھی دنیا کے لیے خطرہ بتایا ہے اور ہندوؤں کو ڈرایا ہے کہ اسلام پھر سر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔اس نے تقسیم کے ذریعہ ایک اسلامی سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور اس کا شعار ہمیشہ جارحانہ رہا ہے۔اس لیے ہندوؤں کو اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندو مہا سبھا کا ساتھ دینا چاہیے۔

اگر اسلام دنیا کے لیے خطرہ ہوتا اور اس کا شعار جارحانہ ہوتا تو آج ہندوستان تہذیب و تمدن کے اس درجہ پر نہ ہوتا اور نہ اسلام کے خلاف زہر چکانی کے لیے ڈاکٹر کھرے کا وجود ہوتا۔ان کے اسلاف یا اسلام قبول کر چکے ہوتے یا اس کے جارحانہ شعار کا شکار ہو گئے ہوتے۔ان کا وجود خود ان کے دعوی کی تردید کے لیے کافی ہے۔اسلام سرنگوں کب تھا، جو اب سر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔وہ ہمیشہ سربلند رہا اور آیندہ بھی رہے گا۔وہ ہندوستان کی چہار دیواری میں محدود نہیں بلکہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ڈاکٹر کھرے کہاں کہاں اس کا مقابلہ کرتے پھریں گے　ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اسلام نے پاکستان نہیں قائم کرایا بلکہ وہ ڈاکٹر کھرے جیسے فرقہ پرستوں کی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ابھی دیکھیے یہ تنگ دلی و تنگ نظری اور کیا گل کھلاتی ہے اور اگر اسلام ہی نے پاکستان قائم کرایا تو کیا برائی کی۔جب کہ خود ڈاکٹر کھرے ہندوازم کے نعرہ کے زور سے ہندوستان میں ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ڈاکٹر کھرے جیسے لوگوں کو تو اسلام کا ممنون ہونا چاہیے۔اگر اسلام ہندوستان میں نہ ہوتا تو وہ کس بنیاد پر ہندو سبھا کی عمارت کھڑی کرتے۔اس لیے فرقہ پرستوں کو اسلام کا یہ احسان تو کم از کم ماننا ہی چاہیے۔سب سے زیادہ قابل تعریف ہماری سیکلر حکومت ہے جس نے ڈاکٹر کھرے جیسے لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو منہ میں آئے بکتے پھریں۔کیا اسی قسم کی آزادی ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی حاصل ہے؟

مردم شماری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک کی آبادی کے متعلق صحیح اعداد و شمار فراہم ہو جائیں

لیکن ہندوستان میں جو تازہ مردم شماری ہوئی ہے۔اس میں حتی الامکان اس کے خلاف عمل کیا گیا ہے اور مسلمانوں اور اردو بولنے والوں کی تعداد گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے اور اردو بولنے والوں کی زبان عموماً ہندی لکھی گئی ہے۔اس کی اتنی شکایتیں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں کہ اس کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں، بلکہ بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی مردم شماری ہی نہیں کی گئی۔اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دارالمصنّفین جیسے اہم اداروں کی جو ضلع کے صدر مقام میں ہے، مردم شماری نہیں ہوئی تھی اور اخبارات میں اس کی شکایت چھپنے کے بعد ۷/ مارچ کو کی گئی۔اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ معمولی طبقہ اور دیہات کے مسلمانوں کی مردم شماری میں کیا کیا بے عنوانیاں نہ ہوئی ہوں گی۔

مردم شماری کے عملہ نے مسلمانوں اور اردو بولنے والوں کی تعداد گھٹا کر اپنے نزدیک ہندو قوم اور ہندی زبان کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اس کی نظر اس پہلو پر نہیں گئی کہ اس سے مردم شماری ناقابل اعتبار ہوجائے گی یا گورنمنٹ پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوجائے گی۔یہ مسلم ہے کہ مردم شماری میں آبادی کی تعداد کچھ نہ کچھ ضرور بڑھ جاتی ہے اور گذشتہ مردم شماری کے کاغذات اس کے شاہد ہیں کہ ہر مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوتا رہا ہے اور اردو بولنے والوں کی تعداد ہندی بولنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ رہی ہے۔اس لیے اگر اس مردم شماری میں دونوں کی تعداد غیر معمولی سے گھٹ گئی تو اس کے دو ہی نتیجے نکالے جاسکتے ہیں۔ایک یہ کہ مردم شماری غلط ہوئی ہے یا گذشتہ فسادات میں اتنے مسلمان مارے گئے یا ترک وطن پر مجبور ہوئے کہ ان کی تعداد اتنی گھٹ گئی۔حالانکہ گورنمنٹ کے بیانات اس کے خلاف ہیں۔اس لیے یا یہ بیانات غلط ہیں یا وہ واقعات صحیح ہیں۔بہرصورت میں گورنمنٹ پر بڑی ذمہ داری عائد ہوجاتی ہے لیکن وہ مسلمانوں کے معاملہ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔اس لیے اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس کیوں ہو۔ بہرحال اس مردم شماری نے ایک پرانے انگریز عہدہ دار کا یہ قول سچ کر دکھایا کہ ہندوستانیوں میں اپنے ملک کی صحیح مردم شماری کرنے کی بھی اہلیت نہیں ہے۔ (معارف، مارچ ۱۹۵۱ء)

اوقاف کی اصلاح و تنظیم

مسلمانوں کے اوقاف کے تحفظ اور ان کی اصلاح و تنظیم کا مسئلہ ہمیشہ سے اہم تھا۔اب ہندوستان کے سیاسی و اقتصادی حالات نے اس کو اور زیادہ اہم بنا دیا ہے۔مسلمانوں کے تقریباً کل

ادارے مسلمان اہل خیر کی مدد سے چلتے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد تمام بڑے بڑے ادارے تو ہندوستان میں رہ گئے اور مسلمانوں کی آبادی کا بڑا حصہ پاکستان میں چلا گیا۔ ہندوستان کے بہت سے صاحب ثروت مسلمانوں نے بھی پاکستان کی راہ لی۔ اس سے اسلامی اداروں کی آمدنی کے ذرائع بہت گھٹ گئے۔ بعض اداروں کو گورنمنٹ سے جو مدد ملتی تھی، نام نہاد سیکلرزم کے بدولت اب اس کی بھی امید نہیں ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے تمام ادارے کم و بیش مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے بہ کثرت اور بڑے بڑے اوقاف ہیں۔ صرف اس صوبہ کے اوقاف کی آمدنی لاکھوں روپے سالانہ ہے لیکن ان کی حالت اتنی ابتر ہے کہ ان سے مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اگر ان کی پوری تنظیم اور ان کے مصارف کی اصلاح ہوجائے، تو تنہا ان کی آمدنی اسلامی اداروں کے لیے کافی ہے اور ان کو کسی دوسری امداد کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر جمعیۃ العلماء کی جانب سے مسلمانوں کے اوقاف کے متعلق ایک مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا ہے۔ اس قسم کی صوبائی کوششیں اس سے پہلے بھی ہوچکی ہیں۔ صوبہ متحدہ اور بہار میں تو باقاعدہ نیم سرکاری محکمۂ اوقاف قائم ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ بچے کھچے اوقاف آیندہ اتلاف سے محفوظ اور متولی کسی قدر محتاط ہوگئے، مگر مسلمانوں کی ضروریات کو اب بھی ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس سے زیادہ موثر اور بااختیار نظام کی ضرورت ہے، جس کے ذریعہ اوقاف کی پوری تنظیم اور ان کے مصارف کی ایسی اصلاح ہوسکے، جس سے مسلمانوں کی مذہبی وملی ضروریات کے لیے وہ مفید اور کارآمد بن سکیں۔

اس سلسلہ میں نفس وقف کے مسائل پر بھی مذہبی حیثیت سے غور اور فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے مثلاً بہت سے اوقاف ایسے ہیں جن کے مصارف نہ شرعی نقطہ نظر سے صحیح ہیں اور نہ ان سے مسلمانوں کو کوئی مذہبی یا دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا ایک مقصد مثلاً تعلیم مدارس کے لیے بہ کثرت چھوٹے چھوٹے اوقاف ہیں، جن کا بہت کم حصہ ان پر صرف ہوتا ہے اور اگر صرف بھی کیا جائے تو یہ اوقاف اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کے متفرق خرچ سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اگر ان کی آمدنی جمع کرکے ایک نظام کے ماتحت تعلیمی ضروریات میں صرف کی جائے تو وہ زیادہ مفید ہوگی۔ اس لیے

وقف کے مسئلہ پر اس حیثیت سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے قوانین کی فقہی جزئیات اٹل اور ناقابل ترمیم ہیں۔ یا مسلمانوں کی ضروریات کے مطابق ان میں ترمیم و وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے مصارف متعین ہیں لیکن ہر زمانہ کے علماء وفقہاء مسلمانوں کی ضروریات کے لحاظ سے ان کے مفہوم ومنشا میں وسعت پیدا کرتے رہے ہیں۔ کیا اس قسم کی وسعت وقف کے مصارف میں بھی پیدا کی جاسکتی ہے، جس سے وقف کا مقصد بھی فوت نہ ہو اور اس سے مسلمانوں کی مذہبی وملی ضروریات بھی پوری ہوسکیں۔ مثلاً وقف کا مقصد، خیر، صدقۂ جاریہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔ اب اگر کسی وقف کے غیر شرعی صرف سے یہ مقصد نہ حاصل ہوتا ہو تو اس کا کوئی حصہ دوسرے مذہبی کاموں میں جو وقف کے موجودہ مصرف سے زیادہ اہم وضروری ہوں صرف کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

اس قسم کے اور بھی قابل غور پہلو ہیں۔ جو اصحاب نظر کی نگاہ میں ہوں گے۔ مسلمانوں کے اکثر اوقاف مذہبی اغراض کے لیے ہیں۔ اگر وہ صحیح مصرف میں صرف کیے جائیں، تو ان کی بہت سی مذہبی ضروریات پوری ہوسکتی ہیں لیکن اس سے پورا فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے، جب مذکورہ بالا نقطۂ نظر سے وقف کے مسائل پر غور کر کے ان کے مصارف کی تصحیح اور ان میں وسعت پیدا کی جائے۔ اس قسم کی اصلاحیں اسلامی ملکوں کے اوقاف میں بھی جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تو اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ ان سطور میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ انشاءاللہ آئندہ کسی موقع پر ہم تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات پیش کریں گے۔ (معارف، مئی ۱۹۵۱ء)

آزادی اور ہندوستانی مسلمان

ہندوستان کی آزادی کی نعمت کو اس کی فرقہ پرستی، تنگ دلی اور تنگ نظری نے اقلیتوں کے لیے سراسر زحمت بنادیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہورہا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ خصوصاً تعلیم اور زبان کے ذریعہ ان کی قومی وملی خصوصیات کو مٹانے اور ان کے کلچر کو بدلنے کی کوشش سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ ہندی حکومت کی زبان ہوچکی ہے، اس لیے اس کے سیکھنے میں اب کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ جب مسلمانوں نے انگریزوں کے زمانہ میں انگریزی سیکھنے میں جو ان کے لیے بالکل اجنبی زبان تھی، تامل نہیں کیا، تو ہندی کے سیکھنے میں جو ملکی زبان ہے اور جس سے وہ نامانوس بھی

نہیں ہیں، ان کو کیا عذر ہوسکتا ہے۔

مگر سوال جو کچھ ہے وہ ان کے مذہب اور کلچر کے تحفظ کا ہے۔ ہندوستان کی حکومت سیکولر ہے، جس میں ہر فرقہ اور طبقہ کو اپنی ملی خصوصیات و روایات قائم و برقرار رکھنے کا پورا حق ہے۔ اس لیے اس کا تعلیمی نظام ایسا ہونا چاہیے، جس میں ہندو اور مسلم دونوں کلچروں کی نمایندگی ہو یعنی نصاب کی کتابوں میں دونوں کی مذہبی و ملی روایات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مگر ہمارا تعلیمی نظام اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں ہندو مذہب، ہندو روایات، بلکہ ان کی میتھالوجی تک کی پوری کتھا موجود ہے، مگر مسلمانوں کے مذہب، ان کی تاریخ اور ان کے اکابر کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ ایسے نصاب کو پڑھ کر مسلمان نوجوانوں کی جو نسل تیار ہوگی، اس کا اپنے مذہب و روایات سے کیا علاقہ رہ جائے گا۔ وہ محض نام کی مسلمان اور اپنے افکار و تصورات اور کلچر کے لحاظ سے ہندو ہوگی اور اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ ایک قسم کی کلچر کشی اور ذہنی ارتداد کے مترادف ہوگا۔

مگر مسلمان کر ہی کیا سکتے ہیں۔ چار و ناچار ان کو یہ بھی گوارا تھا مگر فرقہ پرستوں کو اس پر بھی چین نہیں ہے۔ اور اب انہوں نے ہندی کتابوں میں مسلمانوں کے مذہب اور ان کے پیغمبر کی علانیہ تحقیر شروع کردی ہے۔ اور ادھر چند دنوں کے اندر پرارمبھک وشو کا اتیہاس، سنسار کے اتیہاس کی روپ ریکھا، سنسار کا سرل اتیہاس، وشو پریچے، وشوا اتیہاس کی روپ ریکھا اور جے ہند ریڈر۔ بہت سی ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق نہایت نازیبا باتیں تحریر ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں نصاب میں داخل ہیں، جن کو مسلمان بچے بھی پڑھیں گے جو نہ صرف تعلیمی نقطہ نظر سے قابل اعتراض بلکہ انسانیت و شرافت اور تہذیب و اخلاق کے بھی منافی ہیں۔ وشوا اتیہاس کی روپ ریکھا کو تو حکومت نے مسلمانوں کے احتجاج پر نصاب سے خارج کردیا ہے مگر اور کتابوں کے متعلق ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی ہے۔

ایسی کتابوں کو محض نصاب سے خارج کردینے سے حکومت اپنی ذمہ داری سے بری نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کی جو کتابیں نصاب میں نہیں ہیں۔ ان کے متعلق اس کا طرز عمل کیا ہوگا۔ ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح حکومت نے اخبار شحنۂ شریعت کانپور کے ایڈیٹر پر سوامی دیانند سرسوتی کی توہین کے جرم میں مقدمہ قائم کیا ہے۔ اسی طرح اس کو مذکورہ بالا کتابوں کے مصنّفین پر مقدمہ چلا کر

اپنی انصاف پسندی اورفرض شناسی کا ثبوت دینا چاہیے۔ ورنہ سمجھا جائے گا کہ ہندو مذہب کے خلاف تو مسلمانوں کی لب کشائی جرم ہے لیکن ہندوؤں کو پوری آزادی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کے خلاف جو چاہیں لکھتے رہیں۔

حیرت اس پر ہے کہ نصاب کی کتابوں کی جانچ کے لیے ٹکسٹ بک کمیٹی موجود ہے۔جس کا فرض ہے کہ وہ پوری جانچ کے بعد کتابوں کا انتخاب کرے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کتابیں کس طرح نصاب میں داخل ہوجاتی ہیں۔اس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ٹکسٹ بک کمیٹی میں مسلمان ممبر نہیں ہوتے یاان کی آواز بے اثر ہوتی ہے یااب ان میں اتنی بھی جرأت نہیں رہ گئی ہے کہ وہ اس قسم کی کتابوں پر اعتراض کرسکیں۔اس کے انسداد کی صرف یہ صورت ہے کہ ایسے مصنّفین کو ان کی فتنہ انگیزی کی پوری سزا دی جائے تاکہ آیندہ کسی مصنف کو اس قسم کی جرأت نہ ہو۔ ورنہ محض سیکولرزم کی زریں نقاب سے حقیقت کا مکروہ چہرہ نہیں چھپ سکتا۔

لکھنؤ کے اسکولوں کے سپرنٹنڈنٹ تعلیمات نے حال میں ایک سرکلر جاری کیا ہے، جس میں وہاں کے پرائمری اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جن لڑکوں کی مادری زبان اردو ہے، ان کو اردو میں تعلیم دی جائے اور مادری زبان کا فیصلہ بچوں کے سرپرست کریں گے۔اس قسم کے احکام دکھانے کے لیے بہت جاری ہوا کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس پر عمل کہاں تک ہوتا ہے۔لکھنؤ صوبہ کا صدر مقام ہےاور وہاں ایک جماعت اس مسئلہ سے عملی دلچسپی رکھتی ہے۔اس لیے ممکن ہے کہ اس پر عمل کیا جائے لیکن اگر درحقیقت اس بارہ میں محکمۂ تعلیم کی پالیسی بدلی ہے،تو اس قسم کے احکام پورے صوبہ کے لیے ہونے چاہئیں، ورنہ تنہا ایک لکھنؤ کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم سے کیا حاصل ہوگا۔ (معارف، ستمبر ۱۹۵۱ء)

صوبہ متحدہ میں
اردو کی علاقائی حیثیت تسلیم کرانے کی مہم

اردو کو صوبہ متحدہ کی علاقائی زبان تسلیم کرانے کی مہم دو اداروں انجمن ترقی اردو ہند اور موتمر اردو کانپور نے اپنے ہاتھوں میں لی ہے۔اور دونوں نے الگ الگ اپنا کام شروع کردیا ہے۔اس کام میں جس قدر ادارے بھی حصہ لیں، اس کے لیے مفید ہی ہوگا، مگر اس تحریک کو دو چیزوں سے بچانے

کی سخت ضرورت ہے۔ ایک فرقہ واریت، دوسرے آپس کا اختلاف۔ اس سے اصل مقصد کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ موجودہ فضا میں ہر وہ چیز جو غلط یا صحیح کسی فرقہ کی جانب منسوب کی جا سکتی ہو، وہ بڑی آسانی سے فرقہ وارانہ شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اس سے بچانے کی صرف یہ صورت ہے کہ اس تحریک کو سیاست کے خارزار میں نہ الجھایا جائے، بلکہ خالص لسانی مسئلہ رکھا جائے اور بلا تفریق مذہب وملت اردو کے تمام حامیوں کو اس تحریک میں شریک کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ ان کو برابر کا ذمہ دار بنایا جائے، جیسا کہ انجمن ترقی اردو نے کیا ہے، آج بھی ہندوؤں اور سکھوں کی خاصی جماعت اردو کو اپنی زبان سمجھتی ہے جو اس تحریک میں ضرور ساتھ دے گی اور دے رہی ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ اس کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور دستخط حاصل کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ خود اردو کے حامیوں کے درمیان بھی اختلاف کو بچانا ہے۔ اس تحریک میں جو ادارے بھی حصہ لینا چاہیں، ان کا پورا خیر مقدم اور ان سے اشتراک عمل کرنا چاہیے۔ مگر تحریک کی قیادت ایک ہی ادارے کے ہاتھوں میں رہنی چاہیے اور اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں انجمن ترقی اردو ہے۔ طوائف الملوکی حصول مقصد کے لیے مضر ہوگی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ انجمن ترقی اردو ایک نیم سرکاری ادارہ ہے، اس لیے وہ اپنے کاموں میں پوری طرح آزاد نہیں ہے اور اردو کی خدمت کے بعض پہلوؤں میں اس کا مسلک بھی جمہور کے نقطۂ نظر سے کسی قدر مختلف ہے۔ اسی لیے اس کے کارکنوں نے اس کا دائرہ محض اپنی ہم خیال جماعت تک محدود رکھا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ مرحوم انجمن ترقی اردو کی جانشین اور ایک مستقل اور منظم ادارہ ہے اور ایک طرح کی مرکزیت بھی اس کو حاصل ہے۔ اس لیے تحریک کی قیادت اسی کے ہاتھوں میں رہنی چاہیے اور دوسرے اداروں کو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

چنانچہ دارالمصنّفین اس تحریک میں انجمن ترقی اردو کے ساتھ ہے مگر انجمن کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ دوسرے اداروں خصوصاً موتمر اردو کانپور کو اپنے ساتھ ملانے اور اس کا اشتراک عمل حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ایک ہی مقصد کے لیے دو جماعتوں کا اپنا راستہ الگ الگ بنانا مناسب نہیں ہے۔ اس اتحاد کی جانب پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ اس تحریک کے سلسلہ میں آخر دسمبر میں دونوں

کے جو عام اجلاس الگ الگ ہونے والے ہیں، ان کو مشترک ہونا چاہیے اور باہمی مفاہمت اور صلاح ومشورہ کے بعد آیندہ کے لیے متفقہ طریق عمل طے کرنا چاہیے۔ ممکن ہے موتمر اردو کے کارکنوں کو انجمن ترقی اردو سے کچھ شکایتیں ہوں اور وہ صحیح بھی ہوں، مگر اس کام میں اختلاف مناسب نہیں ہے۔ ایک بڑے مقصد کے حصول کے لیے خفیف اور معمولی اختلافات کو بھلا دینا چاہیے، ورنہ اس سے اگر اصل مقصد کو نقصان پہنچ گیا تو یہ اردو کے ساتھ دوستی نہیں، بلکہ دشمنی ہوگی۔ (معارف، دسمبر ۱۹۵۱ء)

اردو کنونشن، لکھنؤ

اردو کنونشن لکھنؤ میں اگرچہ اردو کے حامیوں کا پورا اجتماع نہ ہوسکا لیکن اپنے مقصد ومنشا کے لحاظ سے وہ بڑی حد تک کامیاب رہا اور بلا تفریق مذہب وملت اردو کے تمام حامیوں نے اس میں شرکت کی اور اس کی تائید وحمایت میں پورا حصہ لیا، جس پر ان کی تقریریں شاہد ہیں، کنونشن کے محترم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مجلس استقبالیہ کے صدر پنڈت کشن پرشاد کول، انجمن ترقی اردو کے سکریٹری قاضی عبدالغفار صاحب اور دوسرے ممتاز شرکاء نے اپنی تقریروں میں اردو کی اہمیت، اس کے قانونی حق، اس کے ساتھ حکومت کے معاندانہ رویہ، اس کی حق تلفی اور مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے مسئلہ میں حکومت کی وعدہ خلافیوں کی پوری تفصیل بیان کی اور کنونشن کے اغراض ومقاصد، ان کے حصول کے قانونی ذرائع، طریقۂ کار اور ان سے متعلق دوسرے اہم امور ومسائل پر روشنی ڈالی، یقین ہے کہ اس کنونشن کے بعد اردو کی مہم جو پہلے سے جاری تھی اور زیادہ ضبط ونظام اور وسعت کے ساتھ انجام پائے گی۔

اردو کا مسئلہ درحقیقت سیاسی سے زیادہ قومی، لسانی اور تہذیبی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو، ہندو مسلم اتحاد، ہندوستان کے مشترک کلچر اور متحدہ قومیت کی سب سے بڑی نشانی ہے اور اس وصف میں ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور سب زبانیں مقامی اور صوبائی ہیں اور خاص خاص کلچروں کی نمایندگی کرتی ہیں اور اردو پورے ہندوستان کی ثانوی اور مشترک زبان ہے۔ اس میں اس کے تمام فرقوں اور طبقوں کے کلچر کی روح جھلکتی ہے۔ دلی، اترپردیش اور بہار وغیر کے علاوہ جن کی اردو مادری زبان ہے، ان صوبوں میں بھی جن کی وہ مادری زبان نہیں ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں رائج ہے اور ان کے دیہاتوں تک میں سمجھی جاتی ہے اور بڑے بڑے شہروں اور خاص خاص علاقوں میں بولی بھی

جاتی ہے۔ اور مختلف صوبوں کے باشندوں کے درمیان افہام وتفہیم کا ذریعہ ہی اردو ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب زبان ہے۔ اپنا وقیع لٹریچر اور سنجیدہ علمی وادبی ذخیرہ رکھتی ہے۔ اور ایک بلند اور شائستہ کلچر کی مالک ہے۔ اس لیے ایک ایسی ترقی یافتہ زبان کو مٹانا جو اتنی گوناگوں خصوصیات کی حامل ہو، نہ صرف تعصب وتنگ نظری بلکہ علم وتمدن اور قوم وملک کے ساتھ دشمنی ہے اس سے متحدہ قومیت کو نقصان پہنچے گا۔ حکومت کا اعتبار اٹھ جائے گا اور اس کے سیکلرزم کے دعویٰ کی تردید ہوگی۔ اس لیے اردو کا مسئلہ حکومت کے تدبر اور اس کے عدل وانصاف کا سب سے بڑا امتحان ہے اگر حکومت اردو کو وہ درجہ نہیں دے سکتی جس کی وہ حقیقتاً مستحق ہے تو اس کو اس حق سے تو محروم نہ کرنا چاہیے جو ہندوستان کی ان چھوٹی چھوٹی مقامی زبانوں کو حاصل ہے، جن کی اردو کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اردو کی مخالفت کے اور اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہندی کے انتہا پسند حامیوں کا یہ وہم بھی ہے کہ اگر اردو کی شمع روشن رہی تو اس کے سامنے ہندی کا دیا نہ جل سکے گا، جو سراسر غلط ہے۔ ہندی کے سرکاری زبان بن جانے کے بعد اس کو تنگ نظری کے سوا اور کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی، جب اردو، انگریزی کی ترقی کو جو بالکل اجنبی اور نامانوس زبان تھی، نہ روک سکی تو ہندی کی راہ میں کیا رکاوٹ پیدا کرے گی جبکہ دونوں زبانیں اصلاً ایک اور ایک ہی درخت کی دو شاخیں اور ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ہندی کے ان نادان دوستوں کا ذکر نہیں جو اس پر بیرونی سایہ بھی پڑنے دینا نہیں چاہتے، لیکن جو لوگ اس کی ترقی اور وسعت کے خواہش مند ہیں اس کے لحاظ سے بھی اردو کو باقی رکھنا ضروری ہے اس لیے کہ جب یہ دونوں زبانیں ساتھ ساتھ چلیں گی تو ایک دوسرے سے متاثر ہوں گی اور اردو کی لطافت اور نفاست سے ہندی کا رنگ روپ اور نکھرے گا اور ہندی کی ملاحت اور اردو کی صباحت کے میل سے زبان کا ایک نیا روپ، ایک نیا حسن اور نیا کلچر پیدا ہوگا جو آزاد ہندوستان کی متحدہ قومیت کا سب سے بڑا نشان ہوگا۔ زبانیں جبر وقوت سے بنائی اور مٹائی نہیں جاسکتیں، بلکہ طبعی عوامل کے ماتحت صدیوں میں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اس لیے ہندوستان میں ایک نہ ایک دن عام بول چال کی زبان پیدا ہوکر رہے گی جو نہ خالص اردو ہوگی اور نہ شدھ ہندی بلکہ ان دونوں کی آسان اور سلیس شکل ہوگی، یہی زبان ہندوستان کی اصل مشترک زبان ہوگی۔

ہم نے پہلے بھی یہی مشورہ دیا تھا اور اب بھی ہماری یہی رائے ہے کہ اردو کی موجودہ تحریک کی قیادت انجمن ترقی اردو کے ہاتھوں میں رہنی چاہیے اور دوسرے اداروں کو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ اس لیے کہ اس میں اسی جماعت یا ادارہ کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں جو پہلے سے مستقل اور منظم ہو اور پبلک اور گورنمنٹ دونوں میں اس اعتبار و اعتماد حاصل ہو یہ خصوصیات صرف انجمن ترقی اردو میں ہیں۔ انجمن کے متعلق یہ بدگمانی صحیح نہیں ہے کہ وہ نیم سرکاری ادارہ ہے اس لیے ممکن ہے کہ آیندہ ضرورت کے وقت وہ تیز قدم نہ اٹھا سکے اور کسی نازک مرحلہ میں اس کام کو ادھورا چھوڑ کر الگ ہو جائے، اولاً یہ مہم صرف ایک قانونی وکالت ہے جس میں کسی انقلابی قدم کی ضرورت ہی نہ پیش آئے گی لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو اب انجمن پیچھے قدم نہیں ہٹا سکتی۔ اس لیے کہ اس تحریک کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس کا وجود اس سے وابستہ ہو گیا ہے اگر وہ اس کام میں کسی قسم کی کمزوری دکھائے گی، تو وہ ختم ہو جائے گی اور اب اردو کا مسئلہ قومی بن گیا ہے۔ اس لیے انجمن کی علاحدگی سے وہ ختم بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انجمن سے اس کو نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

اس تحریک کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جہاں جہاں اس کی آواز پہنچ گئی ہے لوگوں میں اس کو کامیاب بنانے کا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اعظم گڑھ کے دور دراز دیہاتوں کے باشندے فارم لینے کے لیے برابر آ رہے ہیں۔ اور دارالمصنّفین اس وقت تک کئی ہزار فارم اپنے پاس سے چھپوا کر تقسیم کر چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس جوش اور مستعدی سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اگر یہ کام پورے ضبط و نظام سے کیا گیا تو بیس لاکھ کیا چالیس لاکھ دستخطوں کا حصول بھی مشکل نہیں ہے۔ (معارف، جنوری ۱۹۵۲ء)

جامعہ عثمانیہ کی قلب ماہیت

جامعہ عثمانیہ کے ہندی یونیورسٹی بنائے جانے کی خبر عرصہ سے گرم تھی۔ بالآخر یہ حادثہ ہو کر رہا۔ اب اس کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ اور اس کا ذریعۂ تعلیم ہندی زبان ہوگی۔ ہندوستان کا پورا نظام تعلیم ہی ہندیایا جا رہا ہے اور رفتہ رفتہ تمام یونیورسٹیوں کی تعلیمی زبان ہندی ہو جائے گی۔ اردو کی یونیورسٹی صرف ایک جامعہ عثمانیہ تھی، اگر حکومت اس کو باقی رہنے دیتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا اور اس سے ہندی کو کیا نقصان پہنچتا مگر اردو دشمنی کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا اور اردو کی اس

تنہا یونیورسٹی کو بھی مٹادیا گیا۔

صبح تک تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادصبا یادگار شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

جامعہ عثمانیہ بڑی ریاضت کا پھل اور ملکی زبان میں تعلیم کا ایسا کامیاب تجربہ تھا، جس کا اعتراف یورپ کی یونیورسٹیوں تک کو کرنا پڑا۔ اس کا عظیم الشان اور بیش قیمت علمی ذخیرہ جو کروروں روپے کے صرف اور بڑے بڑے فضلاء اور اصحاب علم وکمال کی برسوں کی محنت وجانکاہی کا نتیجہ تھا، اس طرح چشم وزدن میں خاک میں ملادیا گیا۔ اب ردی کے سوا وہ کس کام میں آئے گا۔ اس لیے یہ واقعہ ایسا دردناک علمی حادثہ ہے جو نہ صرف اردو دشمنی بلکہ علم وتہذیب سے بھی دشمنی کا ثبوت ہے۔

پرانے زمانہ کے بعض فاتحوں کو آج صرف اس لیے غارت گر اور دشمن علم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مفتوح قوموں کے علمی ذخیروں اور تہذیب وتمدن کو مٹایا تھا۔ کیا جامعہ عثمانیہ کی یہ بربادی اس سے کم ہے۔ بلکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی نکل آتے تھے، جو مفتوح قوموں کے علوم سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو محفوظ رکھتے تھے۔ مگر ہماری حکومت کا کارنامہ ان غارت گروں سے بھی بڑھ گیا اور اس حکومت کے ہاتھوں انجام پایا جو جمہوری اور سیکولر کہلاتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کو ختم کردینا تو آسان ہے مگر تاریخ اس واقعہ کو فراموش نہ کرے گی اور آیندہ نسلیں اس علم نوازی کو عبرت کے ساتھ یاد کرتی رہیں گی۔ (معارف، مئی ۱۹۵۲ء)

مسلم یونیورسٹی کے نئے پرووائس چانسلر

یہ خبر بڑی مسرت افزا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی پرووائس چانسلری کے لیے افضل العلماء مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب سابق پرنسپل محمڈن کالج مدراس کا انتخاب ہوا ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب سے علمی و تعلیمی حلقوں کے علاوہ شمالی ہندوستان کے لوگ کم واقف ہوں گے۔ موصوف مشرقی ومغربی دونوں علوم کے فاضل اور عالم باعمل ہیں۔ انھوں نے عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی کی تعلیم اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی فل کی ڈگری حاصل کی، عام طور سے انگریزی کی تعلیم عربی تعلیم کے اثرات کو بہت کم کردیتی ہے مگر مولانا عبدالحق صاحب کی ذات اس سے مستثنیٰ اور مسلمانوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کا مثالی نمونہ ہے۔

بہت عرصہ ہوا کہ موصوف آکسفورڈ کی واپسی کے بعد دارالمصنفین تشریف لائے تھے اور

اس وقت جب وہ تازہ ولایت تھے۔ ان کی دینداری، مولویانہ وضع اور سادگی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ قیاس بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ان کو انگریزی سے دور کا بھی علاقہ ہے۔ وہ ہندوستان کے چند مسلمان ماہرین تعلیم میں سے ایک ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیم سے ان کو بڑی دلچسپی ہے۔ مدراس میں انہوں نے ان کی بڑی تعلیمی خدمات انجام دیں۔ ان کے متعدد اسکول اور کالج قائم کیے، اس لحاظ سے ان کو مدراس کا سرسید کہنا چاہیے، اس لیے مسلم یونیورسٹی کی پرووائس چانسلری کے لیے ان کا انتخاب نہایت موزوں ومناسب ہے۔ اور یہ یونیورسٹی کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو مولانا عبدالحق صاحب جیسے فاضل ماہر تعلیم اور دیندار مسلمان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ یقین ہے کہ ان کے تعلیمی تجربات سے یونیورسٹی کو بڑا افائدہ پہنچے گا اور ان کے اخلاقی ودینی اثر سے طلبہ کے خیالات اور زندگی میں بھی تبدیلی پیدا ہوگی۔

(معارف، مئی ۱۹۵۲ء)

اسلامی کتب خانوں کی بربادی

ہندوستان کے اسلامی کتب خانوں کی بربادی کی داستان بڑی دردناک ہے۔ ۵۷ء کے انقلاب میں مسلمانوں کی سیاسی واقتصادی تباہی اور علمی زوال کے بعد ہزاروں نادرونایاب کتابیں یورپ خصوصاً لندن پہنچ گئیں، جو آج تک اس کے کتب خانوں کی زینت ہیں اور بے شمار کتابیں ان کے مالکوں کی غفلت اور نااہلی کی وجہ سے ردّی کی ٹوکری اور کیڑوں کی نذر ہوگئیں۔ اس بربادی کے بعد بھی بڑے کتب خانوں کے علاوہ ان قصبات ودیہات تک میں جہاں مسلمانوں کے قدیم گھرانے آباد ہیں۔ بہ کثرت چھوٹے چھوٹے شخصی کتب خانے موجود، جن میں بعض اوقات ایسی نادرونایاب کتابیں مل جاتی ہیں، جو بڑے بڑے کتب خانوں میں نہیں ملتیں، مگر یہ ذخیرہ بھی رفتہ رفتہ برباد ہوتا جارہا ہے۔ اگر اس کی حفاظت کا کوئی سامان نہ کیا گیا تو چند دنوں میں باقی ماندہ کتابیں بھی بے نام ونشان ہوجائیں گی۔

ان کتابوں کی حفاظت کا احساس سب سے پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بانیوں کو ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کانفرنس کے مقاصد میں ایک مقصد ان کتابوں کی تلاش اور ان کا تحفظ بھی رکھا تھا۔ مگر کانفرنس کے دورعروج میں اس کو دوسری تعلیمی ذمہ داریوں کی وجہ سے اس کام کا

موقع نہ مل سکا۔ پھر وہ بے جان ہوگئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے اپنی سکریٹری شپ کے زمانہ میں ازسرنو اس کی تحریک کی، مگر وہ بھی آگے نہ بڑھ سکی۔

غدر ۵۷ء کے بعد پھر بھی مسلمانوں کی ایک حیثیت اور ان میں اسلامی علوم کا کچھ نہ کچھ ذوق باقی رہ گیا اور انگریزی حکومت بھی کسی نہ کسی حد تک مشرقی علوم وفنون کی قدرداں وسرپرست تھی۔ اس لیے ان کا نام ونشان باقی رہ گیا تھا، مگر نئے انقلاب میں ان تمام چیزوں کا خاتمہ ہوگیا ہے اور جدید تعلیمی نظام میں جب اردو زبان تک کی گنجائش نہیں ہے تو دوسرے اسلامی علوم وفنون اور ان کی نادر ونایاب کتابوں کی حفاظت کا کیا سوال۔ اس لیے اب یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہم ہوگیا ہے۔ یہ کتابیں اور کتب خانے جن لوگوں کی ملک ہیں، ان میں نہ ان کا مذاق ہے اور نہ ان سے فائدہ اٹھانے اور اس کی حفاظت کی صلاحیت ہے۔ اس لیے اگر ان کے تحفظ کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ بچی کھچی کتابیں بھی چند دنوں میں برباد ہوجائیں گی۔ ان کی حفاظت کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور دارالمصنّفین وغیرہ اسلامی اداروں کو دے دی جائیں۔ اس سے ان کی حفاظت کا سامان بھی ہوجائے گا اور ان سے فائدہ بھی اٹھایا جاسکے گا۔ (معارف، جولائی ۱۹۵۲ء)

امرت بازار پتر کا اور توہین رسالتؐ

مسلمان کیا دنیا کا کوئی صاحب مذہب بھی اپنے پیغمبر کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے مسلمانوں نے ''امرت پتر کا'' کے خلاف جس قدر احتجاج بھی کیا وہ کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کے طریقے اور موقع ومحل سے کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے، مگر جو شخص بھی دین وملت بلکہ تہذیب و شرافت رکھتا ہے وہ اس پر اعتراض نہیں کرسکتا۔ چنانچہ قریب قریب ہر مقام کے سنجیدہ ہندوؤں نے بھی امرت پتر کا کے خلاف اظہار بیزاری کیا، مگر ہندوستان کی فضا اتنی زہریلی ہے کہ ہر چیز فرقہ وارانہ شکل اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ فرقہ پرستوں نے جو مسلمانوں کے خلاف دل کا غبار نکالنے کے لیے موقع کے منتظر ہی رہتے ہیں۔ اس مسئلہ کو بھی فرقہ وارانہ شکل دے دی اور مسلمانوں کے سواد اعظم کو چھوڑ کر جنھوں نے یوم آزادی کی مخالفت میں کوئی حصہ نہیں لیا، محض ان کی ایک محدود ومختصر جماعت کے وقتی اور جذباتی فعل کو آڑ بنا کر مسلمانوں کے خلاف جو جو فتنہ انگیزیاں کی ہیں اور پوری مسلمان قوم

کو جس طرح نشانۂ ملامت بنایا ہے۔ وہ حد درجہ افسوس ناک ہے۔

فرقہ پرستوں سے تو اس کی شکایت بیجا ہے۔ ان کا تو کام ہی مسلمان دشمنی ہے اور ان کا وجود ہی اس سے وابستہ ہے۔ مگر حیرت ان گندم نما جو فروش کانگریسیوں پر ہے جو کسی موقع پر بھی مسلمانوں کی مخالفت سے نہیں چوکتے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی انہوں نے ان کو غدار وغیرہ کے پرانے اور پٹے ہوئے القاب دے ڈالے، جن کی اب کوئی اہمیت باقی نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی مسلمان متاثر ہوسکتا ہے۔ درحقیقت مسلمان نہیں بلکہ وہ لوگ غدار ہیں جو اپنے ذاتی اغراض کے لیے فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا کر ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں، مگر یہ سارا زور مسلمانوں ہی کے مقابلہ میں ہے۔ سکھوں کے مقابلہ میں کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہوئی، جنہوں نے انبالہ میں یوم بربادی منایا اور ان کے اخبار پربھات نے فرقہ پرستوں کو چیلنج کیا۔

اس قسم کے معاملات میں حکومت اور مسلمانوں دونوں کو اپنی پوزیشن اور ذمہ داری پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے مسلمان جس نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ اس کا ان کو پورا اندازہ ہوگا۔ فرقہ پرست ہر وقت ان کی تاک میں لگے رہتے ہیں اور ان کی ادنیٰ بے احتیاطی سے ان کے خلاف طوفان کھڑا ہوسکتا ہے۔ ان حالات میں ان کے لیے بڑی احتیاط اور ہوش مندی کی ضرورت ہے اور اشتعال کے موقعوں پر بھی ان کو ضبط وتحمل کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے اور ایسا دانش مندانہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے، جس سے ان کے حقوق اور عزت ووقار کو بھی صدمہ نہ پہنچے اور فرقہ پرستوں کو بھی ان کی مخالفت کا کوئی بہانہ نہ مل سکے اور ان نادان دوستوں سے بھی بچنا چاہیے جو اپنی لیڈری اور ذاتی اغراض کے لیے پوری قوم کے نقصان کی پروا نہیں کرتے۔

حکومت پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی کمزوری سے مسلمانوں کے مقابلہ میں فرقہ پرستوں کا قلم اور زبان بالکل آزاد ہے۔ وہ ان کے خلاف جو طوفان بھی بپا کریں ان پر کوئی احتساب نہیں۔ چنانچہ اسی احتجاج کے سلسلہ میں مسلمانوں کے خلاف جیسی اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں اور جیسے زہریلے مضامین لکھے گئے۔ ان سے ہر وقت فتنہ وفساد کی آگ بھڑک سکتی ہے اور سہارنپور وغیرہ میں تو ایسے شرمناک مظاہرے کیے گئے، جن سے انسانیت وشرافت کی گردن جھک جاتی ہے، مگر حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ مسلمانوں کی خاطر نہ سہی، کیا ملک کے امن و

امان کے لیے بھی حکومت ان کی جانب توجہ نہیں کرسکتی تھی۔اگر مسلمانوں کی جانب سے ہندوؤں کے خلاف اس کا عشر عشیر مظاہرہ بھی ہوتا تو معلوم نہیں کتنے مسلمان جیل پہنچ گئے ہوتے۔کیا سیکولرزم کے یہی معنی ہیں، جس کا ڈھنڈورا ساری دنیا میں پیٹا جاتا ہے، جب تک اس ملک میں ہر فرقہ کے حقوق اور ان کی عزت و ناموس محفوظ نہیں ہے۔اس وقت تک دنیا کو محض سیکولرزم کے لفظ سے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ (معارف، ستمبر ۱۹۵۲ء)

اوقاف اور نظام قضا

ہندوستان میں مسلمانوں کے اوقاف کے تحفظ اور اصلاح کا مسئلہ ہمیشہ سے توجہ کا محتاج تھا۔اب حالات نے اس کو اور زیادہ اہم بنادیا ہے۔بہت سے قدیم اوقاف متولیوں کی غفلت اور نااہلی کی وجہ سے برباد ہوچکے ہیں۔پھر بھی کروروں روپے سالانہ کے اوقاف باقی ہیں، مگر بیشتر اوقاف کی حالت نہایت ابتر ہے اور ان کا بڑا حصہ متولیوں کے ذاتی مصرف میں آتا ہے۔کم اوقاف ایسے نکلیں گے جو صحیح مصرف میں صرف ہوتے ہیں۔بعض صوبوں میں ان کی نگرانی کے لیے جو نیم سرکاری بورڈ قائم ہیں، ان سے ان کی بے عنوانیوں کا پورا تدارک نہیں ہوسکتا۔اس کے لیے زیادہ مکمل نظام کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کے بیشتر اسلامی ادارے اور مسلمانوں کی مذہبی وقومی تحریکیں صاحب ثروت مسلمانوں کی امداد سے چلتی تھیں۔جن کی بڑی تعداد پاکستان چلی گئی، جو لوگ باقی رہ گئے ہیں۔ان کی مالی حالت خود بگڑ گئی ہے اور تنہا ان کی مدد سے کام نہیں چل سکتا۔اس لیے کم وبیش تمام اسلامی ادارے مالی دشواریوں میں مبتلا ہیں۔اگر اسلامی اوقاف کی حفاظت اور ان کی اصلاح کا پورا انتظام ہوجائے تو تنہا ان کی آمدنی مسلمانوں کے جملہ مذہبی وقومی ضروریات کے لیے کافی ہے اور کسی مدد کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

دوسرا مسئلہ نظام قضا کا ہے۔اگرچہ برٹش گورنمنٹ کے زمانہ سے ہندوستان کے تمام فرقوں کے مذہبی اور رواجی امور ومعاملات میں ان کا پرسنل لا مانا جاتا ہے، مگر مسلمانوں کا پرسنل لا، جس حد تک عدالتوں میں رائج ہے، وہ ناقص ہے اور اس کا نظام بھی الگ نہیں ہے، بلکہ عام حکام جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہوتے ہیں۔ان معاملات کا بھی فیصلہ کرتے ہیں۔مسلمانوں کے نکاح طلاق، تفریق

یا خلع ، مہر اور وقف وو راثت سے متعلق فقہی مسائل اور ان کی باریکیوں کو غیر کیا مسلم حکام بھی نہیں سمجھ سکتے۔اس لیے وہ فیصلہ میں غلطی کر جاتے ہیں۔اور بعض معاملات میں مسلمانوں کے پرسنل لا اور عام قانون میں تعارض بھی پیدا ہوجاتا ہے، جس سے بڑی دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں اور اس کے بدولت بہت سی زندگیاں برباد ہوجاتی ہیں، جس کا تجربہ روزانہ ہوتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ علماء کی بڑی جماعت اس قسم کے معاملات کے فیصلہ کے لیے مسلمان حاکم کو ضروری سمجھتی ہے۔اس لیے ان غیر مسلم ملکوں میں بھی جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے۔ ہر زمانہ میں ان کا نظام قضا الگ رہا ہے۔ ہندوستان میں ۵۷ء کے بعد اس کا خاتمہ ہوا اور اس زمانہ میں مسلمانوں میں اتنی سکت باقی نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اس کے قیام کی کوشش کرتے ،مگر بعد میں وقتاً فوقتاً اس کی تحریک ہوتی رہی اور بعض جزوی قوانین بھی بنتے رہے۔لیکن اس کے مستقل نظام کے قیام کی نوبت نہ آسکی۔

اب مولوی محمد احمد صاحب کاظمی جمعیۃ العلماء کے مشورہ سے اوقاف کے تحفظ و اصلاح اور نظام قضا کے قیام کے لیے پارلیمنٹ میں بل پیش کرنے والے ہیں۔ یہ دونوں بل نہایت ضروری ہیں، مگر بعض جماعتوں کی جانب سے اس بدگمانی کی بنا پر اس کی مخالفت شروع ہوگئی ہے کہ جمعیۃ العلماء قانون کے ذریعہ مسلمانوں کے اوقاف پر قبضہ کر کے ان کو اپنے عقائد اور اپنی صواب دید کے مطابق صرف کرنا چاہتی ہے لیکن یہ اندیشہ صحیح نہیں ہے۔ دونوں بلوں کے مسودے شائع ہو چکے ہیں۔ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس سے اس قسم کا شبہہ کیا جاسکے، جب اغراض وقف میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی ہے اور اس کا جو نظام قائم ہوگا۔اس میں ہر عقیدہ اور خیال کے مسلمانوں کی نمایندگی ہوگی تو جمعیۃ العلماء کے قبضہ اور اس کے من مانی تصرفات کا کوئی امکان ہی نہیں ہے اور ابھی تو یہ مسودہ بل کی شکل میں ہے۔اس میں ترمیم ہوسکتی ہے اور اس قسم کے خطرات کا انسداد کیا جاسکتا ہے مگر محض سوئے ظن یا اختلاف عقائد کی بنا پر ایک ضروری اور مفید کام کی مخالفت مناسب نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کے ہر طبقہ کو اس بل کی پوری تائید کرنی چاہیے۔

مگر جمعیۃ العلماء کے ارکان سے بھی یہ گذارش ہے کہ وہ اپنے کسی طرز عمل سے کسی جماعت کو شکایت اور بدگمانی کا موقع نہ دیں۔خود ہماری نگاہ میں بھی یہ چیز کھٹکی کہ قضاۃ کے انتخاب کے لیے

جن مدارس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نام نہیں ہے اور اس کے مقابلہ میں ایسے مدارس تک کے نام موجود ہیں، جن کی کوئی حیثیت و اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے اگر اہل ندوہ کو اس سے بدگمانی پیدا ہو تو بیجا نہ ہوگی۔ اس لیے جمعیۃ العلماء کو اس فروگذاشت کی تلافی کرنی چاہیے۔

(معارف، نومبر ۱۹۵۲ء)

اردو بحیثیت علاقائی زبان

ہندوستان کے ان تمام افراد اور جماعتوں میں جو پراچین بھارت کا خواب دیکھتی ہیں اور مسلمانوں کے دور کی کسی یادگار کو خواہ وہ ہندو مسلمانوں کی مشترک کوششوں کا نتیجہ اور ان دونوں کے اتحاد و اتفاق کی کتنی ہی عزیز نشانی کیوں نہ ہو، باقی رکھنا گوارا نہیں کرتیں۔ اردو کی مخالفت میں جس قدر اتحاد خیال ہے، اس کی مثال کسی اور مسئلہ میں نہیں مل سکتی اور اس میں قوم پرور اور فرقہ پرست کسی کا بھی استثنا نہیں ہے۔ ان دونوں میں صرف فرق یہ ہے کہ فرقہ پرست صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور نام نہاد قوم پرست جو اپنے دلی جذبات کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتے۔ وہ چور دروازوں سے اردو کی مخالفت کرتے ہیں اور اس میدان میں ان کا قدم فرقہ پرستوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔

چنانچہ جب سے اردو علاقائی زبان کی تحریک شروع ہوئی ہے اس کی مخالفت کا ایک طوفان بپا ہے اور اس کے خلاف درجنوں بیانات نکل چکے اور تجویزیں منظور ہو چکی ہیں۔ اور اب نیا حربہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس تحریک کی فرقہ پرستی کا پروپیگنڈا شروع ہو گیا ہے۔ فرقہ پرستوں کی جانب سے تو اس قسم کی باتیں نئی اور تعجب انگیز نہیں ہیں، مگر حیرت اس پر ہے کہ اتر پردیش پولٹیکل کانفرنس بنارس میں بھی اسی آواز کو دہرایا گیا ہے اور ایک رزولیوشن میں اردو علاقائی زبان کی تحریک کو فرقہ وارانہ اور صوبہ کی وحدت کے خلاف قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ کہنے کو یہ رزولیوشن غیر سرکاری ہے۔ لیکن درحقیقت پوری کانفرنس کی ترجمانی ہے۔ ورنہ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ایسا نفاق انگیز رزولیوشن، وہ غیر سرکاری ہی سہی، پاس کس طرح ہوا اور اس کو پیش کرنے کی اجازت کس طرح دی گئی۔ البتہ محرک نے اردو کے ساتھ اتنی رعایت کی ہے کہ حکومت سے اس کی تعلیم میں سہولت پیدا کرنے کی سفارش کی ہے۔ ٹنڈن جی نے حسب معمول اس رزولیوشن کی پرزور تائید کی ہے مگر مروت میں ان کو بھی اتنا کہنا پڑا کہ وہ اردو ادب کے خلاف نہیں ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ جب اردو زبان ہی نہ رہے گی تو

اس کا ادب کیا آثار قدیمہ کے کام آئے گا، تاہم اردو زبان کو ان دونوں محسنوں کی اس فیاضی اور رواداری کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

یہ رزولیوشن عقل و منطق کا عجیب مضحکہ انگیز نمونہ ہے۔ اردو علاقائی زبان کی تحریک کو فرقہ پرستی سے کیا علاقہ اور اس سے صوبہ کی وحدت کو کس طرح نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اردو تنہا مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ چنانچہ اس تعصب و فرقہ پرستی کے دور میں بھی لاکھوں ہندو اس کو اپنی زبان مانتے ہیں اور ہر مقام کے بہت سے ممتاز ہندو اصحاب اس تحریک میں عملاً شریک اور اس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے آئین میں یہاں کی موجودہ تسلیم شدہ زبانوں میں ایک زبان اردو کو بھی مانا گیا ہے اور اگر بالفرض اس کو تنہا مسلمانوں ہی کی زبان مان لیا جائے تو بھی ہندوستان کے آئین میں ہر فرقہ کی زبان اور کلچر کے تحفظ کی دفعات موجود ہیں۔ اس لیے ان دونوں صورتوں میں اردو کو اس کا قانونی اور واجبی حق دلانے کی تحریک کو فرقہ پرستی کس طرح کہا جا سکتا ہے۔

یہ بھی عجیب منطق ہے کہ ہندوستان کے اور تمام صوبوں میں جہاں صوبائی زبانوں کو بھی ان کا حق دیا گیا ہے اور ہندی اور مقامی زبانیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ صوبوں کی وحدت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا ہے۔ اور اس صوبہ میں اردو کو علاقائی زبان مان لینے سے اس کی وحدت میں فرق آ جائے گا۔ انگریزوں کے زمانہ میں جب بیک وقت انگریزی، اردو اور ہندی تین تین زبانیں رائج تھیں، صوبہ کی وحدت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا اور اب دو زبانوں سے اس کی وحدت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ درحقیقت لغو اور مہمل بات کبھی عقل کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے اردو ہی ہندو مسلم اتحاد اور دونوں کے کلچروں کی مشترک نشانی ہے اور آج بھی اسی کے ذریعہ قومی وحدت استوار ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کو باقی رکھنے کی نہیں بلکہ اس کو مٹانے کی کوشش فرقہ پرستی اور وحدت شکنی ہے۔

اگرچہ اردو کی تعلیم میں سہولت پیدا کرنے کی سفارش محض نمائشی ہے اور خود محرک کو اس کی بے اثری کا یقین اور اس کا پورا علم ہے کہ حکومت اور اس کے شعبۂ تعلیم دونوں میں ان سے بھی بڑھ کر اردو کے ہمدرد و ہوا خواہ موجود ہیں، ورنہ وہ اس سفارش کو قریب نہ آنے دیتے، تاہم اس سے اتنا بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی دل میں اردو کے اس صوبہ کی علاقائی زبان ہونے کی معترف ہیں۔ ورنہ انہوں نے پنجابی، بنگالی، گجراتی وغیرہ ہندوستان کی کسی اور زبان کے لیے کیوں نہ یہ سفارش کی۔

اس رزولیوشن کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس کی تقویت اور معقولیت کے ثبوت کے لیے بعض مسلمانوں سے بھی اس کی تائید کرائی گئی ہے، جن کے نام پردۂ راز میں ہیں۔ ورنہ ان کی حیثیت کا اندازہ ہوجاتا۔ اس کا اصولی جواب تو یہی ہے کہ اگر چند مسلمانوں نے اپنے اغراض سے مجبور ہوکر اس تحریک کی مخالفت کی ہے تو ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت اس میں عملاً شریک ہے۔ اس کے علاوہ جب گذشتہ الیکشن میں جن سنگھ کو بعض ہمنوا مسلمان مل گئے تھے، تو کسی صاحب غرض سے مسلمان سے اردو کی مخالفت کرادینا کیا مشکل ہے۔ زبان تو زبان ہے ایسے لوگوں سے مذہب تک خریدا جاسکتا ہے۔

ان مخالفتوں سے اس کا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے مخالفین بھی اس کی قوت کا لوہا مانتے ہیں۔ ورنہ ایک ایسی زبان کی مخالفت میں جو بعض لوگوں کے نزدیک اس صوبہ کی زبان ہی نہیں ہے۔ اتنی قوت صرف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ اس صوبہ کی عام اور مقبول زبان اردو ہی ہے۔ مگر ان مخالفتوں سے اس تحریک کو نقصان پہنچنے کے بجائے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی پہنچے گا۔ سکون اور خاموشی کی حالت میں ممکن تھا، اس کے کارکنوں میں کچھ سستی رہتی، مگر اب مخالفین کا شوروغوغا ان کو بیدار اور ہوشیار کرتا رہے گا اور اتنی مخالفتوں کے بعد اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچانا اردو کے ہر بہی خواہ کا اور زیادہ فرض ہوگیا ہے اور یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس صوبہ کی زبان بن کر رہے گی۔ (معارف، دسمبر ۱۹۵۲ء)

مسلمانوں کی مذہبی اور ابتدائی تعلیم اور سیکولر حکومت

کوئی سیکولر حکومت کسی فرقہ کی مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں کرتی۔ ہر ملک میں مختلف فرقے ہوتے ہیں۔ اس لیے حکومت سب کی تعلیم کا انتظام کر بھی نہیں سکتی۔ چنانچہ انگریزوں کے زمانہ میں بھی اس کا انتظام نہیں تھا۔ اس لیے ہندوستان کی موجودہ حکومت پر بھی اس کی ذمہ داری نہیں ہے، مگر ان دونوں حکومتوں میں بڑا فرق ہے۔ انگریزی حکومت عملاً سیکولر تھی اور اس کا نظام تعلیم بھی سیکولر تھا۔ اس میں کسی مذہب کا کوئی شائبہ نہ تھا اور ہندوستان کی حکوت اگرچہ قانوناً سیکولر ہے مگر ان فرقہ پرستوں کے غلبہ اور قوت کی وجہ سے اس کی سیکولرزم کامیاب نہیں ہونے پاتی، جن کا مقصد ایسے ملک اور ایسی قوم کی تعمیر ہے جو اپنی روح کے اعتبار سے خالص ہندو مذہب کا نمونہ ہو اور یہ نقطہ نظر ہندوستان کے

تمام تعمیری کاموں میں نمایاں ہے۔اس لیے اس کا نظام تعلیم بھی اسی کے مطابق بنایا گیا ہے۔اگر یہ تعلیم محض ہندی زبان تک محدود ہوتی تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔اب وہ ملک کی قومی زبان بن چکی ہے۔جب مسلمانوں نے انگریزوں کے زمانہ میں ایک اجنبی زبان کو سیکھا تو ان کو ہندی سیکھنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے جو ایک ملکی زبان ہے،مگر موجودہ نظام تعلیم کا مقصد تمام فرقوں کو ہندو تہذیب کے قالب میں ڈھالنا ہے۔چنانچہ پرائمری تعلیم کا نصاب اور اس کا طریقہ تعلیم جو عنقریب جبراً نافذ ہونے والی ہے۔تمامتر ہندو کلچر کا ترجمان ہے جس میں اور کسی فرقہ کی تہذیب وروایات کا کوئی نشان نہیں ہے۔

انگریزوں کے زمانہ میں جب حکومت اور تعلیم دونوں صحیح معنوں میں سیکولر تھیں۔ان کو کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہ تھا اور قانوناً اور عملاً تمام فرقوں کے حقوق یکساں تھے۔مشترک تعلیم خالص غیر مذہبی تھی۔اردو اور ہندی کا درجہ تعلیم میں برابر تھا۔انگریزوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ہندوستانی عوام سے ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔اس کے باوجود کوئی فرقہ بھی ان کے تمدنی اثرات سے بچ نہ سکا،تو ہندوازم کے اس طوفان میں مسلمانوں کا جو حشر ہوگا اس کے اثرات ابھی سے پرائمری اسکولوں میں تعلیم پانے والے مسلمان بچوں میں مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں۔اگر یہ صورت حال قائم رہی تو ہماری آیندہ نسلیں اپنے مذہب اور اپنی روایات سے بالکل بے گانہ ہوجائیں گی۔اور تمامتر ہندو تہذیب کے رنگ میں رنگ جائیں گی۔

اس کے تدارک کی دو ہی صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ انگریزوں کے زمانہ سے مکاتب اسلامیہ کا جو سلسلہ چلا آرہا ہے اور اب بالکل بے جان ہوگیا ہے۔اس کو محض نام کے لیے نہیں بلکہ صحیح معنوں میں قائم رکھا جائے اور صوبہ بمبئی کی طرح ہندی اسکولوں سے الگ اردو کے مستقل اسکول قائم کیے جائیں،جن میں مسلمان اپنی تہذیب کے مطابق تعلیم حاصل کرسکیں مگر ہمارے صوبہ کی حکومت کی جو تعلیمی پالیسی ہے اس میں قطعاً اس کا امکان نہیں ہے اور مسلمانوں میں قوت سے ان کو منوانے کی سکت باقی نہیں ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان خود اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا ایسا نظام قائم کریں،جس سے ان کی مروجہ سرکاری تعلیم میں بھی رکاوٹ نہ ہو اور وہ اردو زبان اور ابتدائی مذہبی تعلیم سے بھی بیگانہ نہ رہیں۔اگر مسلمان اس کے لیے مستعد ہوجائیں تو یہ کوئی دشوار کام نہیں ہے اور ہر ایسے مقام پر جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہو اس طرح کے مکتب قائم کیے جاسکتے ہیں اور

مسلمانوں کے سرکاری امدادی اسکولوں میں تو اس کا انتظام بہت آسان ہے۔اس مقصد کے لیے مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی کا سلسلۂ تعلیم قرآن بھی مفید ہے۔انہوں نے قرآن مجید کی تعلیم کا ایسا سائنٹفک نصاب مرتب کیا ہے، جس سے ہر عمر کا آدمی بہت تھوڑی مدت میں اپنے شوق وطلب کے مطابق عربی زبان، ترجمۂ قرآن اور اسلامی عقائد کی ابتدائی اور متوسط تعلیم حاصل کر سکتا ہے اور بچوں کو چند دنوں میں قرآن مجید کے ترجمہ سے مناسبت اور سمجھ دار آدمیوں میں اس کے ترجمہ کی پوری استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے اہم مسئلہ ان کے بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم کا ہے۔ اگر اس کی جانب توجہ نہ کی گئی تو ہماری آیندہ نسلیں محض نام کی مسلمان رہ جائیں گی۔جن کو اپنے مذہب اپنی تہذیب اور اپنی روایات سے کوئی علاقہ نہ ہوگا۔آج ہر مسلمان کو اس کا احساس ہے مگر ان میں قوت عمل نہیں ہے۔وہ جوش میں آکر ایک مرتبہ پہاڑ سے ٹکر لے سکتے ہیں، بلکہ جان تک دے سکتے ہیں مگر کسی کام کے لیے مسلسل جدو جہد نہیں کر سکتے اور اس وقت جوش کے بجائے ہوش و گوش اور خون کے بجائے سعی و عمل اور محنت و مشقت کا پسینہ بہانے کی ضرورت ہے۔قومیں دوسروں کے سہارے نہیں بلکہ اپنے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں۔اور جس قوم میں زندگی کا کس بل پیدا ہو جائے، اس کو کوئی قوت نہ دبا سکتی ہے اور نہ نظر انداز کر سکتی ہے۔محض دوسروں کے شکوہ و شکایت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

آج بھی ہندوستان میں جمعیۃ العلماء، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور جماعت اسلامی مسلمانوں کے متعدد آل انڈیا ادارے موجود ہیں۔اگر یہ سب مل کر اس کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو اس کا ہونا کچھ دشوار نہیں ہے۔خصوصاً جمعیۃ العلماء اور جماعت اسلامی کی شاخیں تو ہر جگہ قائم ہیں۔ ان کے ذریعہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔یہ وقت اختلاف کا نہیں اور کم سے کم مشترک معاملات میں مل کر کام کرنے کا ہے، ورنہ اگر مسلمان ہی باقی نہ رہ گئے تو یہ جماعتیں کس کام آئیں گی، اس لیے

ع گر کردنی ست چارہ مجنوں کنوں کنید

(معارف، مارچ ۱۹۵۳ء)

غلامی سے آزادی یا اخلاق وشرافت سے آزادی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے اس کو اخلاق و تہذیب اور انسانیت

وشرافت سے بھی آزادی مل گئی ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے معاملہ میں کسی کے زبان وقلم پر کوئی احتساب نہیں رہ گیا ہے، جس کی زبان میں جو آتا ہے کہہ گزرتا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اور امتحان وآزمائش کے جن حالات سے گذرے ہیں، وہی کیا کم ہیں کہ فرقہ پرستوں نے ان کی دل آزاری کے لیے ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کی تحقیر وتذلیل شروع کر دی ہے اور ادھر عرصہ سے کتابوں، مضامین اور تقریروں میں علانیہ ان کے خلاف زہر اگلا جارہا ہے۔ مگر اس کی کوئی باز پرس نہیں کی جاتی۔ اگر کسی مسلمان کی زبان وقلم سے اس کا عشر عشیر بھی ہندو مذہب کے خلاف نکل جاتا، تو اس پر قیامت آجاتی، مگر حکومت اس فتنہ انگیزی کی جانب کوئی توجہ نہیں کرتی۔

اسلام پر اس قسم کا حملہ شیشہ کے گھر میں بیٹھ کر قلعہ پر پتھر پھینکنے کے مرادف ہے۔ مسلمان اس کا پورا جواب دے سکتے ہیں، مگر حکومت کے مقابلہ میں مجبور و بے بس ہیں۔ اگر کسی مسلمان کے قلم سے ایک لفظ بھی ہندو مذہب کے خلاف نکل جاتا ہے، تو فوراً حکومت کی مشنری حرکت میں آجاتی ہے۔ یہ سیکولرزم کی بالکل نئی قسم ہے۔ آخر حکومت کب تک مسلمانوں کی توہین وتحقیر کا تماشہ دیکھتی اور ان کے ضبط وتحمل کا امتحان لیتی رہے گی۔ اس کو کچھ تو اپنی سیکولرزم کی لاج رکھنا چاہیے۔ کسی فرقہ کے مذہب کو برا بھلا کہنا قانون اور تہذیب وشرافت سب کے خلاف ہے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان اس سبق کو بھی بھولتا جاتا ہے۔ کم از کم اس معاملہ میں اس کو پاکستان سے سبق حاصل کرنا چاہیے، جہاں سے ایک آواز بھی ہندو مذہب کے خلاف سننے میں نہیں آتی۔

ہندوستان میں سیکولرزم اور قوم پروری اور فرقہ پرستی کے بھی نئے معنی ہیں۔ سیکلرزم کے معنی اکثریت کی تہذیب کا غلبہ وتسلط اور اقلیت کے حقوق کی پامالی، قوم پروری کا مفہوم، اکثریت کا قول وعمل خواہ وہ اس کے سراسر خلاف کیوں نہ ہو اور فرقہ پرستی کے معنی اقلیت کی آواز ہے خواہ حق و صداقت ہی پر مبنی ہو۔ چنانچہ آج اکثریت کا ہر فرد قوم پرور ہے اور اقلیت کا ہر فرد فرقہ پرست حتی کہ وہ لوگ اور وہ اخبارات بھی جن کی پوری عمر قوم پروری میں گذری اور جن کا دامن فرقہ پرستی کے ہر داغ سے پاک ہے۔ محض جمہوریت کے عطا کردہ حقوق کے تحفظ اور جمہوریت کو صحیح معنی میں جمہوریت بنانے کی کوشش کے جرم میں فرقہ پرستی کے الزام سے نہ بچ سکے اور فرقہ پرستوں کی نگاہ میں وہی قوم پرور ہے، جو اپنی ہر چیز کو ان کی خوشنودی کے لیے نثار کردے۔ (معارف، ستمبر ۱۹۵۳ء)

اردو کی علاقائی زبان کی تحریک

اردو علاقائی زبان کی تحریک کی ابتدائی کامیابی سے اس کے ان ازلی دشمنوں کی مخالفت تو اور تیز ہوگئی ہے، جو کسی حال میں بھی اردو کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر ایک طبقہ میں اس کے حقوق کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ چنانچہ اس کے بعض پرانے دشمنوں کا لب ولہجہ بدل گیا ہے۔ اتر پردیش کی حکومت کے رویہ میں بھی تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں۔ محکمہ تعلیم میں بھی اردو کی جانب کچھ توجہ ہے اور اسکولوں میں اردو پڑھنے والے اور اس کی تعلیم کے خواہش مند طلبہ کے اعداد وشمار فراہم کیے جارہے ہیں اور مقررہ شرائط پر اردو کی تعلیم کے انتظام کا سرکلر بھی دوبارہ جاری ہوگیا ہے۔ گو اردو کے حق میں یہ اچھی علامات ہیں، مگر ابھی ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور اردو کے کارکنوں کو اپنی کوشش برابر جاری رکھنی چاہیے، اگرچہ ابھی اردو کی تعلیم میں پرانی رکاوٹیں بدستور باقی ہیں لیکن اگر حکومت کی پالیسی میں درحقیقت تبدیلی ہوئی ہے تو یقین ہے کہ یہ دقتیں جلد دور ہوجائیں گی۔

(معارف، ستمبر ۱۹۵۳ء)

دارالمصنّفین کے لیے مرکزی حکومت کی امداد

دارالمصنّفین کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی کتابوں کی تجارت ہے اور بڑی حد تک اسی پر اس کے مصارف کا دار ومدار ہے۔ چنانچہ ریاست حیدرآباد اور بھوپال کی معمولی امدادوں کے علاوہ آج تک اس نے نہ کبھی عام چندہ کیا اور نہ حکومت سے کسی قسم کی امداد حاصل کی۔ انگریزوں کے زمانہ میں بعض ایسے موقعے بھی آئے، جب خود حکومت کی جانب سے امداد کی پیش کش کی گئی، مگر دارالمصنّفین نے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور اس کے کارکن محض بقدر کفاف گذارے پر قناعت کر کے علمی خدمت میں مصروف رہے مگر ادھر چند سال سے ہندوستان کی تقسیم اور ملک کے عام معاشی حالات کے اثر، ہندوستان و پاکستان کے سکہ کے اختلاف، ان کے تبادلہ کی دقتوں خصوصاً پاکستان کی عائد کردہ تجارتی پابندیوں کی وجہ سے پاکستان کی تجارت جو دارالمصنّفین کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھی، تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ ہندوستان کی تجارت بھی بہت گھٹ گئی، ریاستوں سے جو تھوڑی بہت مدد ملتی تھی، وہ بھی قریب قریب بند ہوگئی ہے۔ ان حالات میں دارالمصنّفین کا چلانا سخت دشوار تھا، پھر بھی کارکنان دارالمصنّفین آیندہ کی امید پر کئی سال تک کسی نہ کسی طرح کام چلاتے رہے، مگر اب اس کی کوئی صورت

نظر نہیں آتی تھی۔اس لیے مجبور ہو کر آخر میں حکومت ہند کی جانب رجوع کرنا پڑا اور مولانا مسعود علی صاحب نے دہلی جا کر مولانا ابوالکلام اور پنڈت جواہر لال نہرو سے صورت حال بیان کی۔

ان دونوں کا تعلق دارالمصنّفین سے بہت قدیم ہے۔مولانا ابوالکلام کا تو وہ گویا اپنا ادارہ ہے۔ان کے تعلقات کی نوعیت ان کے ان خطوط سے ظاہر ہوگی جو اسی پرچہ میں شائع کیے جارہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال کا تعلق دارالمصنّفین سے موروثی ہے۔خلافت اور نان کواپریشن کی تحریک کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک دارالمصنّفین ہندوستان کی جنگ آزادی کا ایک اہم مورچہ رہ چکا ہے۔اس کے کام پورے صوبے کے لیے نمونہ تھے۔اور اس زمانہ کے جو لیڈر بھی اعظم گڑھ آتے تھے، وہ دارالمصنّفین ہی میں ٹھہرتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو کا تو وہ مستقل قیام گاہ تھا، وہ اپنی زندگی بھر مشرقی اضلاع کی تمام سیاسی مہمیں دارالمصنّفین ہی کو مرکز قرار دے کر انجام دیتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس وضع داری کو قائم رکھا ہے۔ان کا جب بھی اعظم گڑھ آنا ہوتا ہے تو وہ دارالمصنّفین ہی میں ٹھہرتے ہیں۔اس لیے اس کے موجودہ نازک حالات سن کر ان دونوں نے اپنے تعلقات کا پورا حق ادا کر دیا۔مولانا ابوالکلام نے اپنے شعبہ سے فی الحال ایک سال کے لیے ساٹھ ہزار کی گراں قدر امداد منظور فرمائی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی پوری تائید کی اور پنڈت جی نے اپنی جیب خاص سے ایک ہزار روپیہ عطا کر کے اس کی لائف ممبری قبول کی جو دارالمصنّفین کے لیے طغرائے امتیاز ہے۔

حکومت ہند کی یہ امداد اس کی علم دوستی اور وسعت قلب کا بہت بڑا ثبوت ہے۔اس امداد نے دارالمصنّفین کو ایک بڑے خطرہ سے بچالیا، جس کے لیے نہ صرف ارکان دارالمصنّفین بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمان حکومت ہند خصوصاً مولانا ابوالکلام اور پنڈت جواہر لال نہرو کے شکر گذار ہیں، بلکہ ہر علم دوست کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیے۔اس موقع پر رفیع احمد صاحب قدوائی کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری ہے۔وہ خود دارالمصنّفین کے لائف ممبر بنے اور اس کے لیے کوشش بھی کر رہے ہیں اور یقین ہے کہ ان کے ذریعہ معقول مدد مل جائے گی۔

حکومت ہند کی اس علم دوستی نے عملاً ثابت کر دیا کہ ہندوستان میں اسلامی اداروں کی بھی گنجائش ہے۔ہمارے صوبہ کی حکومت کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے جس کے یہاں اسلامی ادارہ

کا کیا ذکر، اردو، بلکہ ہندوستانی اداروں کا بھی گذر نہیں ہے۔ دارالمصنّفین ایک ایسا ادارہ ہے جس کی شہرت ہندوستان کے باہر تک ہے، اس لیے حکومت نے اس کی مدد کرکے پوری دنیائے اسلام میں نیک نامی حاصل کی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر اس کا جو اثر پڑا ہے، اس کا اندازہ ان کے اخبارات سے ہوسکتا ہے۔ اس لیے دارالمصنّفین کو مدد دے کر حکومت نے خود اپنی مدد بھی کی ہے۔ کیا پاکستان کی اسلامی حکومت اس واقعہ سے کچھ سبق حاصل کرسکتی ہے کہ اس کے قوانین سے ایک اسلامی ادارہ کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ایک غیر مذہبی حکومت نے کی۔

اس میں شبہہ نہیں کہ موجودہ نازک حالات میں یہ بڑی مدد ہے اور اس نے دارالمصنّفین کو فوری خطرہ سے بچالیا۔ لیکن وہ اس کے مشکلات کا مستقل حل نہیں ہے۔ دارالمصنّفین کا سالانہ خرچ ایک لاکھ کے قریب ہے۔ اس لیے یہ امدادی رقم اس کی موجودہ آمدنی ملا کر صرف ایک سال کے مصارف کے لیے کافی ہوسکتی ہے اور جب تک اس کی آمدنی کا اصل ذریعہ یعنی اس کی تجارت ہندوستان اور خاص طور سے پاکستان میں اپنی اصلی حالت پر نہ آجائے گی۔ اس وقت تک اس کی مشکلات دور نہیں ہوسکتیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتمدن کے زوال کا زبانی شور وغل تو بہت مچاتے ہیں، مگر اس کے تحفظ کے اصلی ذرائع استعمال نہیں کرتے، ورنہ ہندوستان میں اب بھی ان کی اتنی بڑی تعداد ہے اور وہ اس حالت میں بھی ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وتمدن کے اداروں کو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر اپنے بل بوتے پر زندہ رکھ سکتے ہیں اور ان کو پاکستان کے مسلمانوں کی احتیاج ہی باقی نہ رہے، مگر ان میں اس کا احساس کہاں! (معارف، اکتوبر ۱۹۵۳ء)

کانگریس میں فرقہ پرست عناصر

کانگریس اپنی بے عنوانیوں، اپنے اصولوں کی پامالی، اپنے نصب العین سے انحراف، حکومت اور عہدوں کی ہوس اور گندم نما جو فروش کانگریسیوں کی بدولت جس نوبت کو پہنچ گئی ہے اور اس کے جو نتائج نکل رہے ہیں۔ اس کا احساس مخلص کانگریسیوں کو پوری طرح ہوگیا ہے اور وہ علانیہ ان خرابیوں کا اعتراف کرنے لگے ہیں اور ان کو دور کرکے کانگریس کو اصلی شکل میں لانا چاہتے ہیں، مگر خود غرض کانگریسیوں کی زندگی کا مدار ان خرابیوں پر ہے۔ اس لیے وہ اس راہ میں سب سے بڑے مزاحم

ہیں اور وقتی اغراض کے موقع پر محض اوچھی تدبیروں سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اسمبلی کے گذشتہ ضمنی انتخابات اور حال میں میونسپلٹی کے عام الیکشن کے موقع پر انہوں نے مختلف جائز وناجائز تدبیروں سے الیکشن جیتنے کی کوشش کی، مگر اب پبلک اتنی بیدار ہوچکی ہے کہ اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور کانگریس کو مجموعی حیثیت سے پورے صوبہ میں شکست اٹھانا پڑی۔ اس واقعہ سے خود غرض کانگریسیوں کی بھی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور الیکشن کے موقع پر اوچھے ہتھیاروں سے کامیابی حاصل کرنے کے بجائے کانگریس کی اصل خرابیوں کو دور کرکے اس کو مصبوط بنانے کی کوشش کرنا چاہیے، ورنہ اس کی موت یقینی ہے۔

کانگریس کو اس نوبت تک پہنچانے کی ذمہ داری ان فرقہ پرست اور خودغرض کانگریسیوں پر ہے جو کانگریسیت کے روپ میں حکومت اور کانگریس کمیٹیوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ انہیں کانگریس کے اصول ونصب العین سے کچھ بحث نہیں۔ اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے، جب تک کانگریس اس فاسد عنصر سے پاک نہ ہوگی اور اپنے اصولوں کو عملاً زندہ نہ کرے گی۔ اس وقت تک عارضی تدبیروں سے اس کے مردہ جسم میں زندگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس موقع پر اس کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔ صرف مسلمانوں کے متعلق بعض موٹی موٹی باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ کانگریس کا ایک بڑا مقصد فرقہ پرستی کا استیصال اور ہندو مسلم اتحاد ہے، جس کے لیے گاندھی جی نے جان دی۔ انڈین یونین سیکولر حکومت ہے اور ہندوستان کے دستور میں بلا امتیاز مذہب وملت ہندوستان کے تمام باشندوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ اس کے باوجود کانگریس یا کانگریسی حکومتوں نے ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ پرستی کے ازالہ کے لیے کیا عملی کوشش کی اور اس صوبہ میں زندگی کے کسی شعبہ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ مساویانہ سلوک ہے؟ اور دستور ہند کے رو سے ان کو جو حقوق حاصل ہیں اس کا عشر عشیر بھی ان کو ملتا ہے؟ حکومت تو ان حقوق کو کیا دیتی، اگر مسلمان خود ان کو حاصل کرنے کی کوشش یا ان کی پامالی پر احتجاج کرتے ہیں، تو الٹے فرقہ پرست قرار پاتے ہیں اور ان کو طعن وطنز کے تیر ونشتر کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ اردو کا ہے۔ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی نشانی اور دونوں کی مشترک تہذیب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہندوستان کے دستور میں بھی اس کو مسلمہ ہندوستانی زبانوں میں سے ایک زبان مانا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس کو اس صوبہ سے جس طرح نکالا گیا ہے

اس سے ہر شخص واقف ہے اور اس جرم میں ہمارے صوبہ کی حکومت اور کانگریس کمیٹی دونوں برابر کی شریک ہیں۔ اگرچہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے۔ چنانچہ اردو علاقائی زبان کی تحریک میں بھی دونوں کی کوششیں شریک ہیں اور اس سلسلہ میں جو وفد صدر جمہوریہ سے ملنے والا ہے، اس کے کئی ارکان ہندو ہیں، مگر مسلمانوں کو اس زبان کے ساتھ اس بنا پر ایک خاص خصوصیت ہے کہ ان کے مذہب و تاریخ اور تہذیب و روایات کا بڑا ذخیرہ اردو میں ہے۔ اور انھوں نے اس ہندوستانی زبان کی خاطر اپنی پرانی ادبی و دفتری زبان فارسی اور علمی و مذہبی زبان عربی تک کو روزانہ کی زندگی میں چھوڑ دیا اور عربی دانوں کی ایک مختصر جماعت کے علاوہ جن کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اردو ہی عام مسلمانوں کی علمی، ادبی اور تعلیمی زبان بھی بن گئی اور اب وہی ان کی مذہبی تعلیم کا بھی ذریعہ ہے۔ اس کے مٹانے کے معنی مسلمانوں کے مذہبی علمی اور تہذیبی سرمایہ کو مٹانا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں میں من حیث القوم کانگریس میں شرکت کا ولولہ کس طرح پیدا ہوسکتا ہے۔ انہی حالات کو دیکھ کر مولانا حسین احمد صاحب مدنی جیسے پرانے کانگریسی کو عرصہ ہوا اپنے مریدین اور متوسلین کو اجازت دینی پڑی کہ وہ جس پارٹی میں چاہیں شرکت کریں۔

مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو فاسد عنصر سے پاک کیا جائے۔ اس کے اصولوں اور نصب العین کو زندہ کیا جائے۔ اس کو عوام سے قریب لایا جائے، مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دے کر ان کی شکایتوں کا ازالہ کیا جائے، ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے کہ وہ اپنے وطن میں اپنے کو اجنبی نہ محسوس کریں، بلکہ ہندوستانی قومیت کا ایک جزء اور حکومت میں شریک و سہیم سمجھیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ پنڈت جواہر لال کی بدولت اپنی تمام خرابیوں کے باوجود کانگریس سب پارٹیوں میں غنیمت ہے اور آیندہ بھی اس کی اصلاح کی امید ہوسکتی ہے اور مسلمانوں کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ وہ پنڈت جواہر لال کو قوت پہنچائیں۔ اس لیے اگر ان کے ساتھ ذرا بھی وسعت قلب سے کام لیا جائے تو وہ دعوت دیئے بغیر دوڑ کر کانگریس کی طرف جائیں گے، مگر باعزت برتاؤ کے بغیر محض الیکشن کے موقع پر ان کے ووٹوں سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے وقتی دل جوئی کی کوئی قیمت نہیں اور اس قیمت پر من حیث القوم مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا مشکل ہے اور مسلمان تو مسلمان، ایمان دار اور منصف مزاج کانگریسی بھی شاید اس کو پسند

نہ کریں۔ باقی وقت پر کام چلانے کے لیے تو کچھ نہ کچھ مسلمان مل ہی جایا کریں گے۔

درحقیقت انڈین یونین کی جمہوریت اور سیکلرزم کا بھرم پنڈت جواہر لال کے دم سے قائم ہے اور انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی اصلاح بھی ایک حد تک کر لی ہے، مگر ان کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ صوبائی حکومتیں اور صوبائی کانگریس کمیٹیاں ہیں۔ خصوصاً ہمارے صوبہ کی حکومت اس میں سب سے آگے ہے۔ ابھی چند مہینے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے دلی کے اجلاس میں اردو کے جائز حقوق دیئے جانے کی تجویز پاس کی مگر اس صوبہ کی کانگریس کمیٹی نے اس کی پوری مخالفت کی اور اس کے محترم صدر نے اردو کی مخالفت میں نہایت سخت بیان دیا۔ اس لیے پنڈت جی کی کوششیں کامیاب نہیں ہونے پاتیں، مگر اب وقت آ گیا ہے کہ صوبائی کانگریس کمیٹیاں اور صوبائی حکومتیں پنڈت جی کی رہنمائی میں اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔ ورنہ ان کے تخت شہریاری کی خیر نہیں ہے اور آیندہ الیکشن میں ان کو اس کا نتیجہ معلوم ہوگا۔ اگر کانگریس اپنی اصلاح کا کوئی قدم اٹھاتی ہے، تو مسلمانوں کو اس میں پورا حصہ لینا چاہیے اور اس کار خیر میں مخلص اور سچے کانگریسیوں کو پوری قوت سے مدد پہنچانا چاہیے۔

(معارف، نومبر ۱۹۵۳ء)

دارالمصنّفین اور
مولانا سید سلیمان ندویؒ

دارالمصنّفین اور سید سلیمان ندوی گویا ایک ہی اسم کے دو مسمیٰ ایک ہی تصویر کے دو رخ اور آپس میں ایسے لازم ملزوم ہیں کہ ایک کے تصور سے دوسرے کا تصور جدا نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی دارالمصنّفین پر نثار کر دی۔ اس کو اپنے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ باہر کی دنیا تک اس کا نام بلند کیا اور اس کے لیے ایسی ایسی قربانیاں کیں، جن کی مثالیں اس زمانہ میں کم ملیں گی، اس گلشن علم کی پتی پتی میں ان کا خون جگر شامل اور اس کے ذرہ ذرہ پر ان کا نام ثبت ہے۔ اس سے ان کو وہی تعلق تھا جو ایک بوڑھے باپ کو اپنی جوان اکلوتی اور ہونہار اولاد سے ہوتا ہے۔ اگرچہ حالات نے ان کو دارالمصنّفین سے جدا کر دیا تھا، مگر اس کے ساتھ ان کی قلبی وابستگی آخر دم تک قائم رہی۔ وہ اس کی فلاح کی فکر سے کبھی بے تعلق نہیں ہوئے، اس کی ہر خلش پر بے چین

ہوجاتے تھے۔اس کے ازالہ کی تدبیریں بتاتے ،خطوط میں برابراس کے حالات پوچھتے اورمفید علمی مشورے دیتے رہتے۔غرض جسمانی اور قانونی طور سے جدا ہونے کے بعد بھی ان کی روح دارالمصنّفین سے وابستہ رہی۔

ان کے بھوپال جانے کے زمانہ یعنی جون ۱۹۴۶ء سے لے کر وفات تک دارالمصنّفین پر برابر نازک دور آتے رہے،خود دارالمصنّفین سے ان کا ہٹنا کم اہم واقعہ نہ تھا مگر بھوپال کے زمانہ قیام میں وہ بدستور دارالمصنّفین کے سکریٹری رہے۔وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کے لیے آتے بھی رہتے اور تحریری ہدایتیں بھیجتے رہتے تھے،جس سے کوئی نمایاں کمی محسوس نہ ہوتی تھی مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد اس کے اثرات ونتائج نے اس کو گوناگوں مشکلات میں مبتلا کردیا،جس کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔اس میں خود حضرت موصوف کا ترک وطن دارالمصنّفین کے لیے سب سے بڑا حادثہ تھا۔ان حالات کی بنا پر وہ خود اور کارکنان دارالمصنّفین بہت متردد رہتے تھے،مگر جب بھی راقم خطوط میں ان حالات سے بددلی ومایوسی کا اظہار کرتا تو اپنی محبت بھری تحریروں سے اطمینان وتسلی دلاتے،دل جوئی کرتے،حوصلہ وہمت بڑھاتے،اس زمانہ کے ان کے بہت سے اہم خطوط محفوظ ہیں،ان میں کوئی خط ایسا نہیں ہے جس میں دارالمصنّفین کے متعلق فکر وتشویش کا ظہور ہو،بعض خطوط کے ٹکڑے آیندہ سطور میں پیش کیے جاتے ہیں،جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرتؒ کو آخر دم تک دارالمصنّفین سے کتنی وابستگی اور اس کی فلاح وبہبود کی کتنی فکر رہی۔

راقم جب دارالمصنّفین کے متعلق کسی قسم کی تشویش کا اظہار یا ان کی واپسی کے لیے اصرار کرتا،تو گو خود بھی اس سے متاثر ہوتے،مگر جواب میں ہمیشہ ہمت بڑھاتے،اس قسم کی ایک تحریر کے جواب میں دسمبر ۱۹۴۸ء میں بھوپال سے ارقام فرماتے ہیں ”میں دور ہوں مگر حالات سے قیاس کرتا ہوں کہ دارالمصنّفین کا مستقبل خطرہ سے خالی نہیں ہے معلوم نہیں اس کو کیا پیش آئے۔یہ ظاہر ہے کہ اس کی تباہی میری تباہی ہے اور مجھے اس سے کتنا رنج ہوگا،آپ کا یہ کہنا کہ اگر آپ واپس نہیں آتے تو میرے لیے بھی کہیں فکر کیجیے،مناسب نہیں ہے۔کیونکہ دیر سویر ایک ضعیف العمر کو اس خاکدان فنا کو چھوڑنا ہی ہے اور آپ لوگوں کو بہرحال اس ادارہ کو چلانا ہے اور یہی عزم ہونا چاہیے“۔اگست ۱۹۴۹ء کے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں ”دارالمصنّفین کے متعلق آپ کو جو تشویش آج ہے وہ میرے

سامنے اول روز سے ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کو ہمت واستقلال بخشے۔ آپ اس قدر گھبراتے کیوں ہیں۔ دوامی زندگی لے کر تو کوئی آیا نہیں ہے۔ ع
آج وہ کل ہماری باری ہے، پھر کام تو آپ ہی لوگوں کو کرنا ہے''

ایک مرتبہ میری کسی تحریر کے جواب میں لکھا تھا کہ ''پہلے دارالمصنّفین ایک شخص (مولانا شبلی) کی یادگار تھا، اب اس کو دو کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو'' میں نے سمعنا واطعنا کہا اس جواب پر اظہار اطمینان فرمایا، اور لکھا کہ آپ کے اس اقرار سے خوشی ہوئی کہ آپ دارالمصنّفین کو دو کی یادگار سمجھ کر باقی رکھنے کی کوشش کریں گے، میری عمر چاند کے حساب سے اب ۶۹ سال کی ہوئی، اب وقت نئے کام کا نہ تھا مگر تقدیر الٰہی یہی تھی، کئی سال ہوئے راقم کو بعض ایسے مواقع ملے تھے، جن میں دارالمصنّفین کے مقابلہ میں زیادہ مالی فائدہ حاصل ہوتا تھا، مگر میں نے محض اس کی خدمت کی خاطر چھوڑ دیا۔ اس فیصلہ پر ان الفاظ میں خوشنودی کا اظہار فرمایا'' آپ نے اچھا کیا کہ کہیں کا قصد نہیں کیا، دارالمصنّفین کے باہر قدم نہ رکھیں، آپ کا معاوضہ حسب ضرورت ہمیشہ بڑھ سکتا ہے۔ آپ اس کو اپنی زندگی کا کام بنائیں ورنہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہو جائے گا''۔

پاکستان میں دارالمصنّفین جیسے ادارہ کے قیام کے لیے ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہیں، لوگوں نے اس کی تحریک اور اس کے لیے مالی پیش کش بھی کی، مگر بانی دارالمصنّفین نے اپنے محبوب ادارہ کی خاطر اس کو گوارا نہ کیا، چنانچہ جون ۱۹۵۰ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں ''دارالمصنّفین اب بھی مجھے عزیز ہے، یہاں متعدد اشخاص اہل ذوق واہل دولت نے دارالمصنّفین کے قیام کے لیے زمین اور سرمایہ کی پیش کش کی مگر میں نے قبول نہیں کیا۔ اس چیز کو دوسرے رنگ میں کرنا چاہتا ہوں تاکہ دارالمصنّفین کو نقصان نہ پہنچے''۔

حضرتؒ کے ترک وطن کے بعد جب دارالمصنّفین کے پرانے نظام میں تبدیلی آئی اور راقم کو شعبہ علمی کی نظامت سپرد کی گئی تو بڑی مسرت واطمینان کا اظہار فرمایا، چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں ''دارالمصنّفین میں آپ لوگوں نے جو کچھ طے کیا اس پر میں راضی اور درگاہ الٰہی میں داعی ہوں کہ اس کو دارالمصنّفین کے حق میں نافع فرمائے

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

آپ کے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسے ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہوسکتی ہے۔خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی موت کے بعد کا نقشہ دیکھ لیا، اب آپ سے جہاں تک ہوسکے دین وملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں اور ساتھ ہی اپنے رفقائے کار کی تیاری میں مصروف رہیں۔تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے۔الحمد اللہ آپ نے معارف اور شذرات کے معیار کو قائم رکھا اور ''س'' اور ''م'' میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہوتا ہو، وللہ الحمد''۔

اسی قسم کی حوصلہ افزا تحریریں میرے رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو بھی لکھتے رہتے تھے۔ایک خط میں ان کے متعلق راقم کو لکھتے ہیں ''آپ اپنے رفیق کار عزیزی صباح الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رفاقت کا پورا حق ادا کریں اور ان کی دل دہی، دل نوازی اور ان کی ضروریات پر پوری رعایت کے ساتھ نظر رکھیں اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھیں کہ ان کو دارالمصنّفین سے وحشت نہ ہو، میں نے یہ صرف اپنی طرف سے ناصحانہ پیش بینی کے طور پر لکھا ہے ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ ان میں سے ہر بات کا خود اپنی شرافت اور رفاقت پسندی سے لحاظ رکھتے ہیں اور اس کا خود انہیں بھی اقرار ہے''۔

ان اقتباسات سے اندازہ ہوگا کہ حضرت سید رحمۃ اللہ علیہ کو دارالمصنّفین چھوڑنے کے بعد بھی اس سے کتنی وابستگی تھی اور اس کی فلاح و بہبود کی کتنی فکر ان کو دامن گیر رہتی تھی۔اور اس کی بقا کے لیے اس کے خدام اور کارکنوں کی کس کس طرح سے دلجوئی اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے، باقی اس نااہل کے متعلق حضرت نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ محض ان کی حوصلہ افزائی اور بزرگانہ شفقت تھی، جس کا یہ ناکارہ کسی حیثیت سے بھی مستحق نہیں ہے ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک، البتہ یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حسن ظن کا اہل ثابت کرے اور حضرت مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔انشاء اللہ ان میں سے ہر وصیت حرز جان رہے گی اور اگر سکون واطمینان سے کام کرنے کا موقع ملا تو شبلی وسلیمان کا آستانہ مرتے دم تک نہ چھوٹے گا

مرا عہدیست باجاناں کہ تا جان در بدن دارم ہوا داری کویش را چو جان خویشتن دارم

(معارف، فروری ۱۹۵۴ء)

دارالمصنّفین کے لیے
مرکزی حکومت کی امداد، ٹنڈن جی کا ردعمل

یادش بخیر ٹنڈن جی ہمیشہ اپنے لطائف سے کچھ نہ کچھ سامان تفریح فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اس مرتبہ ان کی ہندی نوازی اور اردو دشمنی کا نزلہ دارالمصنّفین کی جانب رجوع ہوگیا۔ اور وہ وزارت تعلیم کے اس جرم پر پارلیمنٹ میں بہت گرجے ہیں کہ اس نے دارالمصنّفین جیسے ادارہ کو ساٹھ ہزار کی مدد دی جو اردو کا بھی ادارہ ہے اور اسلامی کلچر کا ترجمان بھی یعنی ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ اس لیے اس کی امداد تو ان کی نگاہ میں دوہرا جرم ہے۔ مولانا ابوالکلام نے اپنی جوابی تقریر میں اس تنگ دلی کا ایسا پرزور مدلل اور دندان شکن جواب دیا ہے کہ پورے ہاؤس نے اس کی تحسین کی اور انگریزی کے تقریباً تمام اخبارات نے اس کی داد دی، اس جواب کے بعد اس کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت باقی نہیں ہے مگر ٹنڈن جی کے لطائف کی داد نہ دینا بدمذاقی ہوگی۔

وہ ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت کے جوش میں ہمیشہ حقیقت اور معقولیت سے ایسی آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ ان کو یہ بھی ہوش نہیں رہ جاتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور جو زبان پر آجاتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں، بلاشبہہ دارالمصنّفین اردو کا بھی ادارہ ہے اور بقول ان کے اسلامی کلچر کا بھی مگر کیا جس ملک میں چار ساڑھے چار کروڑ مسلمان آباد ہوں اور حکومت کو ٹیکس بھی ادا کرتے ہوں، اس ملک میں ان کا ایک اہم ادارہ ساٹھ ہزار کی امداد کا بھی مستحق نہیں ہے اور سیکولر حکومت کا فرض صرف ہندی نوازی ہے جو حکومت لاکھوں روپے ہندی کی ترقی و اشاعت پر صرف کر رہی ہے اگر اس نے ایک اردو کے ادارہ کو ساٹھ ہزار کی رقم دے دی تو کون سا بڑا گناہ کیا۔

اس میں شبہہ نہیں کہ حکومت نے بڑے نازک وقت میں یہ امداد کی اور دارالمصنّفین کو فوری خطرہ سے بچالیا لیکن اس سے خود حکومت کو بھی فائدہ پہنچا، ہندوستان کے مسلمان اس کے شکر گذار ہوئے، دوسرے اسلامی ملکوں میں اس کو نیک نامی حاصل ہوئی اور اس کی علم دوستی کا شہرہ ہوا۔ دارالمصنّفین کی شہرت تنہا ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی ہے اگر محض ساٹھ ہزار کی رقم کی وجہ سے یہ ادارہ ختم ہوجاتا تو اسلامی ملک حکومت ہند کے متعلق کیا رائے قائم کرتے، اس امداد سے ان ملکوں میں اس کی سیکولرزم کا بھرم قائم ہوا۔ اور اس نے اپنے کو شماتت ہمسایہ سے بھی بچالیا لیکن

ٹنڈن جی کو ان فوائد اور مصالح سے کیا غرض، ان کو تو اردو اور اسلامی کلچر کے نام سے چڑھ ہے، خواہ ملک کے حق میں اس کا نتیجہ کچھ ہی نکلے، مگر ان کو یقین رکھنا چاہیے کہ جب تک مسلمان ہندوستان میں موجود ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس وقت تک یہ دونوں پتھر ان کی چھاتی پر دھرے رہیں گے۔ اور اس غم سے ان کو تاعمر نجات نہ ملے گی۔

ٹنڈن جی کو یہ معلوم کر کے اور بھی قلق ہوا ہوگا کہ اس کی امداد کی ذمہ داری تنہا مولانا ابوالکلام پر نہیں ہے بلکہ اس میں بڑا ہاتھ پنڈت جواہر لال نہرو کا ہے۔ ان کو دارالمصنّفین سے بہت پرانا تعلق ہے اور وہ اس کی علمی اہمیت اور سیاسی خدمات سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے اس امداد میں ان کی اتنی پرزور تائید شامل تھی کہ اس کو تحریک کہنا صحیح ہوگا۔

جناب آصف فیضی صاحب سابق سفیر مصر و حال ممبر یونین پبلک سروس کمیشن انڈین یونین کے ایک بڑے عہدہ دار ہی نہیں بلکہ ایک ممتاز صاحب علم و نظر بھی ہیں اور دارالمصنّفین کے پرانے قدردانوں میں ہیں۔ چنانچہ گذشتہ مہینہ محض اس کو دیکھنے کے لیے انہوں نے اعظم گڑھ کے سفر کی زحمت گوارا کی۔ اگرچہ بعض اتفاقی موانع کی وجہ سے ان کا قیام بہت مختصر رہا مگر اس مختصر صحبت میں اپنے علم و اخلاق کا گہرا نقش چھوڑ گئے۔ ان میں عہدہ کی شان و شوکت کے بجائے علم کی بڑائی اور بڑی سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدتوں ان کا ساتھ رہ چکا ہے، ان کی یہ آمد تو محض برائے نام رہی مگر آیندہ اس کی تلافی کا وعدہ کیا ہے، خدا کرے جلد اس کے ایفاء کی نوبت آئے۔

(معارف، اپریل ۱۹۵۴ء)

شادی اور طلاق کی
اصلاح سے متعلق پارلیمنٹ میں بل

اس وقت پارلیمنٹ میں ہندوؤں کی شادی اور طلاق کی اصلاح کے لیے ایک بل پیش ہے، اس قسم کے قوانین ہندو سماج کی اصلاح کے لیے ضروری ہیں کہ ان کے بغیر اس کی خرابیاں دور نہیں ہوسکتیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کسی فرقہ کے لیے کوئی ایسا قانون نہ بننے پائے جس سے دوسرے فرقوں کے پرسنل لا پر اثر پڑے گو اس بل میں اس قانون سے مسلمانوں، عیسائیوں، پارسیوں اور یہودیوں کو ایک حد تک مستثنیٰ کر دیا گیا ہے مگر اس استثنا میں وہ مسلمان، عیسائی، پارسی یا یہودی

شامل نہیں ہیں، جو کسی ہندو قانون یا ہندو رسم و رواج کے پابند ہوں گے یعنی ان میں سے جو لوگ کسی ہندو رسم و رواج کے پابند ہیں، ان پر یہ قانون نافذ ہوگا اور خواہ وہ مذہباً ہندو نہ ہوں مگر اس قانون کے نفاذ کی حد تک ان کو ہندو تصور کیا جائے گا، جو کسی حیثیت سے بھی صحیح نہیں ہے۔

ہندوستان کے بہت سے مسلمانوں خصوصاً ان کے پس ماندہ طبقوں میں بہت سے ہندو رسم و رواج جاری ہیں۔ یہ سب کے سب اس قانون کی زد میں آجائیں گے۔ حالانکہ یہ تو ان کی معاشرتی خرابی کا نتیجہ ہے، جس کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ اس کو صحیح مان کر ان پر ہندو قانون نافذ کر دیا جائے۔ یہ تو مسلمانوں کے پس ماندہ طبقوں کو ہندو بنانے کی ایک شکل ہوگی۔ اس قسم کے قوانین تو انگریزوں کے زمانہ میں بھی نہیں بنائے گئے جن کا اثر کسی فرقہ کے پرسنل لا پر پڑتا اور انگریزوں نے ہر فرقہ کے پرسنل لا کا پورا احترام کیا۔ اس لیے اس بل کی اس دفعہ کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

اسی طریقہ سے بعض اور دفعات بھی قابل اعتراض ہیں مثلاً یہ کہ اس قانون کی رو سے ہر اس قانونی اور غیر قانونی لڑکے کو جس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندو ہوگا، ہندو سمجھا جائے گا یا یہ کہ تبدیلی مذہب کی صورت میں صرف اس فریق کو علاحدگی کی درخواست دینے کا حق ہوگا، جو ہندو ہوگا۔ اگرچہ اسلامی قانون کی رو سے ہندو مسلمان کے درمیان رشتۂ مناکحت نہیں ہوسکتا، مگر سول میرج ایکٹ کے ذریعہ یا غیر قانونی طریقہ سے، بعض ہندو مسلمان آپس میں شادی کر لیتے ہیں، اگرچہ یہ شادی مذہبی حیثیت سے صحیح نہیں ہوتی مگر اس سے جو اولاد ہوگی وہ مسلمان بھی ہوسکتی ہے اس لیے قانوناً اس کو ہر حالت میں ہندو قرار دینا سراسر زیادتی ہے۔ اور تبدیلی مذہب کی صورت میں بھی صرف اس فریق کو علاحدگی کا حق دینا جو ہندو ہے قانونی مساوات کے بالکل خلاف اور دوسرے فریق کے ساتھ ناانصافی ہے اور اس سے پیچیدہ صورتیں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ اس لیے یا تو دونوں فریق کو علاحدگی کا حق دیا جائے یا سرے سے نکاح ہی کو فسخ قرار دیا جائے، جیسا کہ اسلامی قانون میں ہے بہرحال ابھی یہ بل معرض بحث میں ہے اس لیے یہ خرابیاں آسانی سے دور ہوسکتی ہیں۔ (معارف، مئی ۱۹۵۴ء)

دارالمصنّفین پر فرقہ واریت کے الزام کا جواب

جب سے حکومت ہند نے دارالمصنّفین کو ساٹھ ہزار کی امداد دی ہے، فرقہ پرستوں میں ایک شور برپا ہے، ٹنڈن جی نے پارلیمنٹ میں جو ہنگامہ برپا کیا اس کی تفصیل اخبارات میں آچکی ہے۔

اب ان کے دوسرے بھائی ڈاکٹر ہردیو باہری نے ۲۳ ؍مئی ۱۹۵۴ء کے ہفتہ وار آج میں دارالمصنّفین اور وزارت تعلیم کے خلاف ایک طویل مضمون لکھا ہے جس میں دارالمصنّفین کو ایک فرقہ پرست مذہبی ادارہ ثابت کرنے کی کوشش اور حکومت کو ایسے ادارہ کی امداد پر ملامت کی گئی ہے۔ اس مضمون میں جن باتوں کا تعلق حکومت سے ہے، ان سے ہم کو بحث نہیں مگر دارالمصنّفین پر جو جھوٹے الزام لگائے گئے ہیں اس کی جانب جو غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں اور اس کو جس بدنما شکل میں پیش کیا گیا ہے، اس کی تصحیح وتردید ضروری معلوم ہوئی۔

دارالمصنّفین پر جو بہتان باندھے گئے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے: (۱) وہ ایک خاص فرقہ کا مذہبی اور اسلامی کلچر کا ترجمان ادارہ ہے اور مذہبی کتابیں شائع کرتا ہے۔ مثلاً تاریخ اسلام ، سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین، اسلام اور عربی تمدن اور تاریخ سندھ۔ (۲) معارف بھارتی کلچر کا مذاق اڑاتا ہے۔ (۳) دارالمصنّفین کا اندرونی تعلق پاکستان سے ہے اور معارف اس کی صدائے بازگشت ہے۔ چنانچہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ حکومت کی بدسلوکی کا تذکرہ، اس کی پالیسی کی شکایت اور پاکستان کی تعریف کرتا رہتا ہے۔ (۴) ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب مسلمانوں نے اپنا سرمایہ پاکستان منتقل کرنا شروع کیا تو اعظم گڑھ کے کلکٹر نے دارالمصنّفین پر پہرہ بٹھا دیا اور جب سید سلیمان ندوی نے کانگریسیوں سے اس کی شکایت کی کہ وہ تو نیشنلسٹ ہیں ان پر کیوں پہرا بٹھایا گیا، اس وقت ہٹایا گیا۔ (۵) دارالمصنّفین کے ٹوٹ جانے کا خطرہ اس لیے پیدا ہوا کہ اس نے لاکھوں روپے کی کتابیں اور دوسری منقولہ چیزیں پاکستان منتقل کردیں مگر حکومت نے اس کا دامن بھر کر بچالیا، ابھی کچھ ندوی دارالمصنّفین میں موجود ہیں اس لیے جو روپیہ دیا ہے، اس کے بھی پاکستان پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔ (۶) معارف کی تحریر کے مطابق اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، اس کے ثبوت میں اس کے وہ شذرات نقل کیے ہیں جس میں اس نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اسلامی علوم وفنون کا سب سے بڑا ذخیرہ اور اسلامی کلچر کے سب سے زیادہ اثرات اردو میں ہیں۔ (۷) اس ادارہ نے اردو زبان کی بھی کوئی خدمت نہیں کی، اس کی خدمت ویسے ہی ہے، جیسی اردو کی خدمت عیسائی مشنری اور دوسرے مذہبی فرقوں سے ان کی مذہبی تبلیغ کے سلسلہ میں ضمناً ہوجاتی ہے، جس کو صحیح معنوں میں اردو کی خدمت نہیں کہا جاسکتا۔ (۸) مضمون نگار کو بڑی کوشش کے بعد بھی یہ نہ

معلوم ہوسکا کہ دارالمصنّفین نے اردو کی کیا خدمت کی ہے، اگر ہندی کی مخالفت کا نام اردو کی خدمت ہے تو البتہ اس نے اس کی خدمت کی ہے اور حکومت نے اس کو اسی خدمت کا انعام دیا ہے۔

یہ ان الزاموں کا خلاصہ ہے جو ایک فاضل ڈاکٹر نے دارالمصنّفین پر لگائے ہیں اور اس سلسلہ میں حکومت پر بھی دل کھول کر طعن وطنز کیا ہے۔ ان میں سے بعض باتیں تو سراسر جھوٹ ہیں، جن کو سچائی سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے اور بعض باتوں کو غلط شکل میں پیش کیا گیا ہے، ایسے جری اور بے باک لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جن کو جھوٹ کا طوفان کھڑا کرتے وقت اس کا خطرہ بھی نہیں پیدا ہوتا کہ دوسروں کے ہاتھ میں بھی قلم ہے، جو اس طلسم کو آسانی سے توڑ سکتے ہیں، اب ان الزاموں کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

(۱) دارالمصنّفین بلاشبہہ ایک اسلامی ادارہ ہے، مگر مذہبی نہیں بلکہ علمی ہے، ان دونوں میں بڑا فرق ہے، اس کا مقصد نفس علم وفن کی خدمت ہے، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی اور اسلامی ہو یا غیر اسلامی، البتہ اسلامی علوم سے اس کو خاص تعلق ہے، چنانچہ اب تک اس نے اسّی سے اوپر کتابیں شائع کی ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مذہبی ہیں اور باقی غیر مذہبی اور اس کی تصانیف وتراجم میں بڑا حصہ تاریخ وسوانح اور شعر وادب وغیرہ غیر مذہبی علوم کا ہے، جس میں فلسفہ، نفسیات اور انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی ہیں، ایسی حالت میں اس کو مذہبی ادارہ کہنا کہاں تک صحیح ہے، البتہ اس کی بیشتر تصانیف اسلامی علوم سے تعلق رکھتی ہیں، مگر ان کی حیثیت علمی ہے، مذہبی نہیں، فاضل مضمون نگار نے دارالمصنّفین کی تمام مطبوعات میں سے صرف چھ کا نام لیا ہے، ان میں بھی تین یعنی تاریخ اسلام، اسلام اور عربی تمدن اور تاریخ سندھ مذہبی نہیں، بلکہ تاریخی ہیں، اسلامی تاریخ پر تو غیر مسلم بھی لکھتے ہیں، کیا اس کو مذہبی کہا جائے گا، دراصل مضمون نگار دارالمصنّفین سے واقف ہی نہیں ہیں، اگر وہ اس کے قواعد اور اس کی مطبوعات کی فہرست ہی منگا کر دیکھ لیتے تو بھی ان کے مضمون میں اتنی غلط بیانی نہ ہوتی۔

(۲) معارف نے بھارتی کلچر کا مذاق کبھی نہیں اڑایا، البتہ اس نے ہندو مسلمانوں کی مشترک ترقی یافتہ اور صاف ستھری تہذیب کو مٹا کر پراچین بھارت کی پرانی اور فرسودہ تہذیب کو زندہ کرنے کی ضرور مخالفت کی، جس کی مخالفت سمجھدار اور سنجیدہ ہندو تک کرتے ہیں۔

(۳) پاکستان سے دارالمصنّفین کا رشتہ جوڑنا اور معارف کو اس کی صدائے بازگشت کہنا

سراسر بہتان ہے، اگر چہ دارالمصنّفین ایک خالص علمی ادارہ ہے اور اصولاً اس کو عملی سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اس کے متعدد ارکان پرانے کانگریسی ہیں، اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں ان کا عملی حصہ رہا ہے، جس سے پرانا کانگریسی طبقہ پوری طرح واقف ہے، دارالمصنّفین کے سیاسی خدمات کی تفصیل حال ہی میں اخبارات میں شائع ہوچکی ہے، یہ صحیح نہیں ہے کہ معارف ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ حکومت کی بدسلوکی کا تذکرہ اور اس کی پالیسی کی شکایت کرتا رہتا ہے، البتہ اس نے فرقہ پرستوں اور حکومت کے فرقہ پرست ارکان کی ضرور شکایت کی ہے اور حکومت کو بھی اس کی جانب توجہ دلائی ہے مگر یہ شکایت پاکستان سے تعلق یا اس کی صدائے بازگشت ہونے کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ اس حق کی بنا پر جو ہندوستان کے سیکولر اور جمہوری دستور نے مسلمانوں کو دیا ہے اور جس پر فرقہ پرستوں کے غلبہ کی بنا پر پورا عمل نہیں ہونے پاتا، مسلمانوں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا اعتراف نیشنلسٹ طبقہ تک کو ہے اور سچے کانگریسی بلکہ حق پسند ہندو تک اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں، اس لیے یہ سب بھی پاکستانی ہوئے، حکومت کو اس کی غلطیوں اور اس کے فرائض کی جانب توجہ اور ہندوستان کی سیکولر اور جمہوری حکومت کو صحیح معنوں میں سیکولر اور جمہوری...... بنانے کی کوشش کرنا فرقہ پرستی نہیں بلکہ قوم، ملک اور حکومت کی سچی خدمت ہے، ان کے دشمن وہ لوگ ہیں جو ان کو فرقہ پرستی کے غار میں ڈھکیل کر تباہ کرنا چاہتے ہیں، اگر چہ پاکستان کے کسی اچھے کام کی تعریف کرنا کوئی جرم نہیں ہے بلکہ عین حق پرستی ہے لیکن اتفاق سے معارف نے کبھی اس سلسلہ میں کچھ لکھا ہی نہیں، اگر مضمون نگار اپنے دعویٰ میں سچے تھے تو ان کو اس کے ثبوت میں معارف کی کوئی تحریر پیش کرنا چاہیے تھا، مسلمانوں کو دھمکانے کے لیے پاکستان کا نام ایک ہوّا بنالیا گیا ہے، جہاں کسی مسلمان نے اپنے کسی حق کے لیے لب کشائی کی اور جھٹ اس پر پاکستانی ہونے کی دفعہ عائد کردی گئی، مگر اب اس قسم کی دھمکیوں میں آنے کا وقت گذر چکا اور یہ چیز قابل توجہ بھی نہیں رہ گئی ہے۔

(۴) دارالمصنّفین کا سرمایہ پاکستان منتقل کرنے اور اس پر کلکٹر اعظم گڑھ کی نگرانی قائم کرنے کا افسانہ بھی بالکل من گڑھت ہے، اس بہتان پر مضمون نگار قانونی گرفت میں آسکتے ہیں، ان کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ اعظم گڑھ کے کلکٹروں نے دارالمصنّفین کو ہمیشہ عزت واحترام کی نظر سے

دیکھا اور دارالمصنّفین سے ان کے بڑے خوش گوار تعلقات رہے اور یہاں برابر ان کی آمد و رفت رہی، مضمون نگار کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ جس ادارہ کے تعلقات تمام بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں سے رہے ہوں، جہاں گاندھی جی تک آچکے ہوں اور جو پنڈت موتی لال اور جواہر لال کا مستقل قیام گاہ رہ چکا ہو اور جس کے تعلقات آج بھی کانگریسی لیڈروں اور حکومت کے ارکان سے ہوں اور وہ یہاں آتے بھی رہتے ہوں اس کو آسانی سے مشتبہ قرار نہیں دیا جاسکتا، بہر حال اس پہرہ کی تصدیق یا تردید موجودہ کلکٹر صاحب کا کام ہے جن کے تعلقات دارالمصنّفین سے قائم ہیں اور وہ یہاں آتے بھی رہتے ہیں، مضمون نگار نے یہ بھی نہ خیال کیا کہ انہوں نے دارالمصنّفین پر پہرہ لگا کر ہندوستان میں مسلمانوں کی بے بسی کا خود ثبوت فراہم کر دیا کہ جب دارالمصنّفین جیسے ادارہ پر گورنمنٹ کی نگرانی ہوسکتی ہے تو پھر عام مسلمانوں کا حال کیا ہوگا۔

(۵) دارالمصنّفین کے لیے ٹوٹ جانے کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں، البتہ وہ مالی مشکلات میں ضرور مبتلا ہوگیا ہے اور یہ اس لیے نہیں کہ اس نے اپنا سرمایہ پاکستان منتقل کر دیا ہے بلکہ اس کا ایک سبب تو ملک کے عام اقتصادی اور تجارتی حالات ہیں، دوسرا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس کی کتابوں کے زیادہ خریدار مسلمان ہیں، جن کی بڑی تعداد پاکستان میں ہے اور ادھر چند سال سے ہندوستان اور پاکستان کے سکّہ کے اختلاف، اس کے تبادلہ کی دقتوں اور پاکستان کی تجارتی بندشوں کی وجہ سے پاکستان میں کتابیں جانا تقریباً بند ہوگئی ہیں، اگر آج پاکستان کی تجارت کھل جائے تو دارالمصنّفین کی ساری مالی دشواریاں دور ہوجائیں گی، یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ دارالمصنّفین کا کوئی کارکن بھی پاکستان نہیں گیا اور نہ آیندہ اس کا ارادہ ہے، دارالمصنّفین کا سارا کارخانہ ہندوستان ہی میں ہے، ایسی حالت میں کون عقلمند اس کو باور کرسکتا ہے کہ اس کے کارکن اپنا سارا سرمایہ پاکستان منتقل کرکے خود ہندوستان میں رہ کر پیٹ پر پتھر باندھیں گے، اس میں شبہہ نہیں کہ پاکستان میں دارالمصنّفین کی ترقی کے زیادہ مواقع ہیں اور وہاں اس کو حکومت اور پبلک دونوں سے مدد مل سکتی ہے، مگر اس کا مقصد حصول زر نہیں، بلکہ علم و فن خصوصاً اسلامی علوم کی خدمت ہے جس کی ضرورت ہندوستان میں زیادہ ہے اس لیے انشاءاللہ وہ یہیں رہ کر ان کی خدمت کرے گا اور بقول مضمون نگار ''اسلامی کلچر'' کی حفاظت کا فرض انجام دے گا، اگر مضمون نگار کو

گورنمنٹ کی عطا کردہ ساٹھ ہزار کی رقم کے پاکستان منتقل ہوجانے کا خطرہ ہے تو ان کو چاہیے کہ وہ کلکٹر صاحب اعظم گڑھ سے کہہ کر دارالمصنّفین پر پھر پہرہ لگوادیں۔

(٦) معارف نے کبھی اردو کو تنہا مسلمانوں کی زبان نہیں لکھا، وہ تو ہمیشہ سے اس کا مدعی اور مبلغ ہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان، ان کے اتحاد و اتفاق کی یادگار اور ان کی مشترک تہذیب کی سب سے بڑی نشانی ہے، مضمون نگار نے معارف کے ان بے شمار شذرات کو چھوڑ کر جن میں بار بار اردو کے ہندو مسلمانوں کے مشترکہ زبان ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ایک ناتمام شذرہ لے کر جو ایک دوسرے سلسلہ میں لکھا گیا تھا، اس پر ایک عمارت کھڑی کردی ہے، یہ شذرہ درحقیقت مشرقی بنگال میں اردو کی مخالفت کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا کہ بنگالی زبان ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح صرف ہندو تہذیب کی ترجمان ہے۔اس لیے اگر بنگالی مسلمان اسلامی تہذیب سے آشنا ہونا چاہتے ہیں تو ان کو اردو کی مخالفت نہ کرنا چاہیے جس میں اسلامی علوم وفنون کا سب سے زیادہ ذخیرہ اور اسلامی کلچر کے اثرات ہیں، اس تحریر کو اردو کو تنہا مسلمانوں کی زبان قرار دینے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اس میں کہیں اردو زبان میں ہندو تہذیب کے اثرات کا انکار نہیں کیا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اور ساری زبانیں خالص ہندو کلچر کی ترجمان ہیں، ایک اردو ہی ایسی زبان ہے جس میں ہندو مسلم دونوں تہذیبوں کے مساوی اثرات ہیں، اس لیے وہی دونوں کی مشترک زبان ہوسکتی ہے، اس میں ہندوؤں کے مذہبی لٹریچر کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، اور ان کی اکثر مذہبی کتابوں کے ترجمے اردو میں ہوچکے ہیں اور روزمرہ کی عام بول چال کی اردو زبان پر ہندیت کا غلبہ ایسا مسلم مسئلہ ہے جس سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا، معارف میں ان تمام پہلوؤں پر شذرات ہی نہیں بلکہ مستقل مضامین موجود ہیں، جن میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ اردو لسانی اور تہذیبی دونوں حیثیتوں سے ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے، ان سارے شذرات اور مضامین کو چھوڑ کر ایک ناتمام شذرہ کو لے کر اس پر ایک پوری عمارت کھڑی کردینا دیانت کے خلاف ہے اس کے باوجود اس سے مضمون نگار کا مدعا ثابت نہیں ہوتا ہے۔

(۷) یہ کہنا کہ دارالمصنّفین نے اردو کی کوئی خدمت نہیں کی، آفتاب پر خاک ڈالنا ہے، ڈاکٹر باہری کے بھائی بندوں کو تو دارالمصنّفین سے سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ وہ اردو کا ادارہ ہے، اسی

لیے ان کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے اور ڈاکٹر صاحب سرے سے اس کی خدمت اردو ہی کے منکر ہیں، اب وہی بتلائیں کہ ان میں سے کس کو صحیح مانا جائے

ع کہیے یہ حکم رہے کہیے وہ ارشاد رہے

یہ غلط ہے کہ دوسری مذہبی جماعتوں کی طرح مذہبی خدمت کے سلسلہ میں دارالمصنّفین سے بھی ضمناً اردو کی خدمت ہوگئی جیسا کہ ابھی اوپر لکھا گیا ہے کہ دارالمصنّفین کی مطبوعات کا بڑا حصہ غیر مذہبی ہے اور اس نے تاریخ، سوانح، شعر و ادب وغیرہ کے علاوہ فلسفہ اور نفسیات وغیرہ بہت سے ایسے فنون کی کتابیں شائع کی ہیں جن کو نہ صرف مذہب بلکہ اسلامی علوم سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے اور خالص اردو اور فارسی شعر و ادب پر متعدد بلند پایہ کتابیں شائع کیں۔ شعر الہند اور گل رعنا اس درجہ کی کتابیں ہیں کہ اردو کے ایم اے کے کورس میں داخل ہیں، اقبال کے کلام پر ایک ضخیم کتاب اقبال کامل شائع کی، مولانا شبلی مرحوم کے اردو و فارسی کلام، ان کے مکاتیب اور ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ مرتب اور شائع کیا اور ان کی مشہور ادبی و تنقیدی کتاب موازنہ انیس و دبیر کا نیا ایڈیشن چھاپا، تیموری عہد کے فارسی شعرا کا تذکرہ بزم تیموریہ لکھوایا اور شعر العجم و موازنہ کا انتخاب مرتب کیا، شعر العجم کے کئی ایڈیشن شائع کیے، اگرچہ آخر الذکر تینوں کتابیں فارسی شعرا کا تذکرہ اور فارسی شاعری کی تنقید پر ہیں، مگر شعر العجم اردو کی ان بلند پایہ کتابوں میں ہے جنھوں نے سخن سنجی اور شعر و ادب کی تنقید کا صحیح مذاق پیدا کیا، اس کے علاوہ اردو زبان اور اس کے ادبیات پر معارف میں سینکڑوں مضامین اور ہزاروں صفحات شائع ہوئے، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تنہا مولانا سید سلیمان ندوی کے مضامین کی تعداد اتنی ہے کہ ان کا مجموعہ کئی سو صفحات میں کتابی شکل میں نقوش سلیمانی کے نام سے شائع ہوا ہے اگر اردو کے متعلق معارف کے تمام مضامین کو یکجا کیا جائے تو ان کے صفحات کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوجائے گی، یہ دارالمصنّفین کی اردو کی علمی اور ادبی خدمت کا اجمالی ذکر ہے، اس کے علاوہ اس نے سیاسی حیثیت سے اردو کی جو خدمت انجام دی، اس کی تفصیل معارف کے شذرات، پرانے اخبارات اور اردو، اور ہندوستانی کی انجمنوں سے معلوم ہوسکتی ہے، اگر اس کے بعد بھی مضمون نگار کو دارالمصنّفین کی اردو کی خدمت سے انکار ہے تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(۸) معارف نے ہندی کی کبھی مخالفت نہیں کی، بلکہ اس کو ملک کی قومی زبان مان کر مسلمانوں کو اس کے حاصل کرنے اور اس میں کمال پیدا کرنے کی تلقین کرتا رہا۔ البتہ جس طریقہ سے اردو کو مٹا کر ایک مصنوعی زبان کو زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس کی ضرور مخالفت کی اور اس کی مخالفت سمجھدار اور انصاف پسند ہندو تک کرتے ہیں۔ اس لیے معارف کی مخالفت کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ اس کا نام ہندی دشمنی ہے۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فاضل ڈاکٹر یا دارالمصنّفین سے واقف ہی نہیں ہیں اور انھوں نے محض سنی سنائی باتیں لکھ دی ہیں یا پھر عمداً اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے، اگر وہ خود دارالمصنّفین سے واقف نہیں تھے، تو اس کے قواعد اور اس کی کتابوں کی فہرست منگا کر دیکھ لیتے یا کسی واقف کار سے اس کے حالات پوچھ لیتے، تو ان کا مضمون اس قدر جھوٹ اور خرافات کا مجموعہ نہ ہوتا، اس قسم کے الزام پہلی مرتبہ دارالمصنّفین پر لگائے گئے ہیں۔ اس لیے ایک مرتبہ ان کا جواب دے دینا ضروری معلوم ہوا مگر آیندہ اس قسم کے خرافات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

(معارف، جون ۱۹۵۴ء)

بہار میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کی تحریک

اتر پردیش کے بعد اردو زبان کا دوسرا مرکز صوبہ بہار تھا۔ چنانچہ اس کے بعد اسی نے اردو علاقائی زبان کی تحریک کی جانب عملی قدم اٹھایا اور اس کی تائید میں دس لاکھ دستخط فراہم کیے اور گذشتہ مہینہ پنڈت کشن پرشاد کول کی صدارت میں پٹنہ میں اس کا نہایت کامیاب کنونشن ہوا، جس میں ہر فرقہ اور ہر طبقہ وخیال کے لوگوں نے اردو کی حمایت میں تقریریں کیں اور اس کو صوبہ بہار کی علاقائی زبان قرار دیئے جانے کا متفقہ مطالبہ کیا اور اس مطالبہ کو صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے عنقریب ایک وفد بھی جائے گا۔

جس حق کی پشت پر کوئی اخلاقی قوت ہوگی اور صاحب حق میں اس کے حصول کا عملی جذبہ اور ایثار وقربانی کا مادہ بھی موجود ہوگا وہ حق کبھی ضائع نہیں ہوسکتا۔ اور بالآخر مخالف قوتوں کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ گو ابھی اردو کی مخالفت بڑی حد تک قائم ہے اور اس کے لیے کوئی بڑی جدوجہد اور قربانی بھی نہیں کی گئی، مگر حامیان اردو کی محض ابتدائی کوششوں اور ان کے آیندہ عزم کا نتیجہ یہ ہے کہ

اردو کی مخالفت میں پہلی سی شدت باقی نہیں رہ گئی۔ اوراس کے مخالفین تک کو کم سے کم زبان ہی سے اس کے حقوق کا اعتراف کرنا پڑا، جس پر ان کی تقریریں شاہد ہیں اور ہمارے صوبہ کی حکومت کو جس کی حیثیت اردو کے مقابلہ میں ایک فریق کی ہے کسی نہ کسی حد تک اردو کے حقوق کا لحاظ رکھنا پڑا۔ چنانچہ شعبۂ تعلیم نے نئے نصاب میں اردو کی تعلیم کی گنجائش پیدا کردی ہے اوراس کے متعلق احکام بھی جاری کردیے ہیں، مگراس کے شرائط ایسے رکھے ہیں کہ حامیان اردو کی پوری کوشش کے بغیر ان کو عمل میں لانا دشوار ہے، ماتحت عملہ میں اردو کی مخالفت پوری طرح قائم ہے اور وہ قانونی اعتراض سے بچ کر اردو کی تعلیم میں رکاوٹیں پیدا کرسکتا ہے۔ اس لیے جب تک ایک مرتب نظام کے ماتحت اجتماعی جدوجہد نہ کی جائے گی اس وقت تک اس گنجائش سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اوراب وہ تمامتر اردو کے حامیوں کی مستعدی اورکوشش پر موقوف ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۵۴ء)

نصاب تعلیم اور اردو

شعبۂ تعلیم نے نئے تعلیمی سال سے پرائمری اسکولوں میں چند شرائط کے ساتھ اردو کی تعلیم کا انتظام کردیا تھا اوراس کی نگرانی کے لیے ایک خاص انسپکٹر بھی مقرر کردیا تھا اور ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں لازمی اور اختیاری مضامین کی ترتیب و تقسیم اس طرح رکھی تھی کہ کسی اہم مضمون کو چھوڑے بغیر آسانی کے ساتھ اردو لی جاسکتی تھی۔ اس سے یہ حسن ظن پیدا ہو چلا تھا کہ اردو کے ساتھ گورنمنٹ کا رویہ بدل چلا ہے اوراردو کے تمام حامی اس کے شکر گذار ہوئے تھے۔ مگر ابھی یہ مسرت پوری نہ ہونے پائی تھی کہ جونیر ہائی اسکول کے نصاب میں جو حال ہی میں شائع ہوا ہے، ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا گیا، اس میں اردو کو انگریزی کے ساتھ اس طرح ٹکرایا گیا ہے کہ دونوں کو ایک ساتھ نہیں لیا جاسکتا اور انگریزی کی اہمیت کی وجہ سے طالب علم اس کو لینے پر مجبور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو خود بخود تعلیم سے خارج ہوجائے گی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کے بارہ میں اب بھی گورنمنٹ کی نیت صاف نہیں ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اردو ختم بھی ہوجائے اوراس پر اردو کشی کا الزام بھی نہ آنے پائے، مگر ان تدبیروں سے وہ اس الزام سے دامن نہیں بچا سکتی۔ اگر وہ حقیقتاً اردو کی تعلیم چاہتی ہے تو ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے نصاب کی طرح جونیر ہائی اسکول کے نصاب میں بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کسی اہم مضمون کو

چھوڑے بغیر اردو لی جاسکے، موجودہ شکل میں تو ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں بھی اردو کی گنجائش سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اس لیے کہ جو طالب علم چھٹے، ساتویں اور آٹھویں میں اردو سے ناواقف رہے گا وہ ہائی اسکول اور اس کے بعد انٹرمیڈیٹ میں کس طرح اردو کی تعلیم حاصل کر سکے گا۔ موجودہ نصاب کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہنے کے لیے تو اردو کی تعلیم کی گنجائش رکھی گئی ہے، مگر ایسی شکل پیدا کردی گئی ہے کہ خود طالب علم اردو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر گورنمنٹ کی نیت صاف ہے اور وہ اردو کی تعلیم میں رکاوٹ پیدا کرنا نہیں چاہتی تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ جونیر ہائی اسکول کے نصاب میں ایک کے بجائے دو اختیاری مضامین کردیے جائیں۔ اس طرح بغیر کسی زحمت اور نقصان کے اردو کی تعلیم کی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ (معارف، ستمبر ۱۹۵۴ء)

حکومت، مسلمان اور نظام تعلیم

انگریزی حکومت پر یہ بڑا الزام تھا کہ اس کا بنایا ہوا نظام تعلیم خالص اس کے اغراض کے مطابق تھا، اس میں ہندوستانیوں کی قومی و ملکی ضروریات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ اس لیے اسی زمانہ سے اس کی مخالفت شروع ہوگئی تھی اور تعلیم کو قومی بنانے کا مطالبہ ہونے لگا تھا۔ ابتدائی بنیادی تعلیم کے مسئلہ میں قریب قریب اسی قسم کی صورت حال مسلمانوں کو درپیش ہے۔ انگریزوں کے زمانہ میں اعلیٰ تعلیم تو بلاشبہہ حکومت کے مصالح کے مطابق تھی، مگر ابتدائی تعلیم تمامتر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھی، اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اس زمانہ میں بھی یہ تعلیم مسلمانوں کے جذبات وخیالات سے بالکل خالی اور ہندوؤں کے تہذیبی رنگ و مذاق کی تھی، مگر لازمی نہ تھی۔ اس لیے مسلمان اس سے کم فائدہ اٹھاتے تھے لیکن ایک حد تک اس کی تلافی اردو کے اسکولوں اور نیم سرکاری مکاتب اسلامیہ سے ہوجاتی تھی، مگر اب اردو تعلیم سے بالکل خارج کردی گئی ہے اور جن شرائط کے ساتھ اس کی تعلیم کی اجازت ہے اس پر بھی عمل نہیں ہو رہا ہے۔ اس کے نصاب کی کتابیں محض نام کے لیے اردو کی ہیں۔ ان کی زبان نہایت خراب ہندی نما اور ان کے خیالات و مضامین تمامتر ہندو تہذیب و روایات پر مشتمل ہیں۔ مکاتب اسلامیہ کا پرانا نظام محض برائے نام رہ گیا ہے اور بنیادی تعلیم تمامتر ہندی زبان اور ہندو کلچر کے رنگ میں رنگ گئی ہے، جس میں اسلامی اثر کا کوئی شائبہ نہیں ہے، اس کا نصاب، طریقہ تعلیم اور اساتذہ سب کے سب ہندو تہذیب کے ترجمان و مبلغ ہیں اور یہ تعلیم لازمی بھی ہوگئی

ہے اور مسلمان بچے اس کو حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔ایسی حالت میں جو لڑکے اسی تعلیم پر رہ جائیں گے۔ان کا انجام کیا ہوگا اور ان کو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب و روایات سے کیا علاقہ رہ جائے گا۔

ہندوستان کی سیکلر اور جمہوری حکومت نے تمام فرقوں اور اقلیتوں کو اپنی مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کو قائم رکھنے کا پورا حق دیا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی بنیادی تعلیم ان کی ملی ضروریات کے مطابق ہو، اس لیے یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں، بلکہ ہندوستان کی تمام اقلیتوں کا ہے، مگر دوسرے فرقوں کے لیے اس مسئلہ کا حل زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے حالات نے اس کو ان کے لیے بہت دشوار بنا دیا ہے۔ان حالات کے پیش نظر جمعیۃ العلماء اس مسئلہ پر غور کرنے اور اس کا حل تلاش کرنے کے لیے ۸/ ۹/ جنوری کو بمبئی میں ایک آل انڈیا دینی تعلیمی کنونشن منعقد کر رہی ہے، جس میں ہر طبقہ کے علماء و مفکرین، ماہرین تعلیم اور اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والوں کی شرکت کی دعوت دی ہے۔افسوس ہے کہ راقم خصوصی دعوت کے باوجود بعض مجبوریوں کی بنا پر اس اہم کنونشن کی شرکت سے محروم رہا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ایک مذہبی و ملی، دوسری قومی اور وطنی اور ان پر ان دونوں کے حقوق و فرائض ہیں اور وہ ان کو اسی وقت ادا کر سکتے ہیں۔جب ان کی مذہبی و قومی تعلیم میں توازن ہو، تاکہ وہ اپنی مذہبی و تہذیبی خصوصیات کو بھی برقرار رکھ سکیں اور ہندوستانی قومیت اور وطنیت سے بھی بیگانہ نہ ہوں اور ملک و وطن کی محبت اور خدمت میں ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہے۔ایک مسلمان ملک کا اسی وقت سچا خادم بن سکتا ہے جب وہ اپنی دینی روح سے آشنا اور سچا مسلمان ہو۔اس لیے کہ مذہب خود وطن کی محبت کی تعلیم دیتا ہے۔چنانچہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں انہی مسلمانوں کا زیادہ حصہ رہا ہے، جو مذہبی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔اس لیے قومی و وطنی نقطہ نظر سے بھی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ضروری ہے، گو اس کے لیے کسی عمر کی قید نہیں، لیکن عقائد و خیالات کا نقش ابتدا ہی سے بیٹھتا ہے۔اس لیے ابتدائی تعلیم ہی سے دینی تعلیم کی بنیاد پڑنا ضروری ہے، مگر سیکولر حکومت مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتی، اس لیے مسلمانوں کو خود اس کا نظام قائم کرنا ہوگا۔

مگر یہ کام محض چند مقامات پر دینی مکاتب قائم کر دینے یا مذہبی نصاب تیار کر دینے سے انجام نہیں پا سکتا، بلکہ پورے ہندوستان میں اس کا مکمل نظام قائم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جو

مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور بے عملی کو دیکھتے ہوئے آسان نہیں ہے لیکن اب اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ اگر مسلمان اس تعلیم کا انتظام خود نہیں کرتے اور ان کے بچے صرف سرکاری بیسک تعلیم پر رہ جاتے ہیں تو ان کی آیندہ نسلیں محض نام کی مسلمان رہ جائیں گی اور ان میں نام کے علاوہ ان کے مذہب اور تہذیب کی کوئی نشانی باقی نہ رہ جائے گی۔ اس لیے کنونشن کی تجویزوں کے مطابق جمعیۃ العلماء کی نگرانی میں اس نظام کو بہر حال قائم کرنا ہے۔

اتر پردیش میں حکومت کی تھوڑی سے توجہ سے اس صوبہ میں اس کام میں آسانی ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے کسی رعایت کی ضرورت نہیں بلکہ مسلمانوں کو جو تعلیمی حقوق حاصل ہیں، ان کو عملاً پورا کیا جائے۔ مثلاً اگر مسلمان اردو کی تعلیم کے شرائط کے مطابق اس کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس کے نصاب کی معیاری کتابیں مہیا کی جائیں۔ اسلامی مکاتب کا پرانا نظام جس کو رفتہ رفتہ ختم کیا جارہا ہے، باقی رکھا جائے اور اس کو ترقی دی جائے اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کو ان کے قائم رکھنے پر مجبور کیا جائے۔ اگر مصارف کی زیادتی کا عذر ہو تو اس مد کی رقم میں اضافہ کیا جائے، جب تعلیم کے تمام شعبوں میں توسیع وترقی اور ان کے مصارف میں اضافہ ہورہا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی مکاتب کے مصارف میں تخفیف کی جائے یا ان کو سرے سے ختم کردیا جائے۔ اصولاً اس میں بھی اضافہ ہونا چاہیے۔ ان مکاتب میں مسلمانوں کی مخصوص تعلیم کے ساتھ دوسرے ضروری مضامین بھی بڑھائے جائیں اور ان کا درجہ بیسک اسکولوں کے برابر مانا جائے۔ تاکہ مسلمان بچوں کو آیندہ تعلیم میں دشواری نہ ہو، اگر حکومت ان مطالبات کو جو مسلمانوں کا تسلیم شدہ حق ہے، عملاً مان لے تو اس صوبہ میں مسلمانوں کی بنیادی تعلیم کا مسئلہ نسبتاً آسان ہوجائے گا، مگر اس کی امید نہیں ہے۔ اگر حکومت کی نیت نیک ہوتی، تو یہ مشکلات ہی نہ پیش آتیں۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ کام اپنی قوت وہمت کے بھروسہ پر کرنا ہے، ورنہ ان کی مذہبی وتہذیبی خصوصیات کے ساتھ ان کا ملی وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ (معارف، جنوری ۱۹۵۵ء)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامی تحقیقات

مسلم یونیورسٹی اسلامی تہذیب وثقافت کی نمایندہ ہے۔ اس لیے اسلامیات کی تحقیقات میں اس کا نقطۂ نظر تاریخی تحقیق کے ساتھ اسلامی بھی ہونا چاہیے اور اسلامی علوم وفنون اور اسلامی

تاریخ وتہذیب کوان کی صحیح شکل میں اس طرح پیش کرنا چاہیے، جس سے ان کی عظمت نمایاں اور دنیا پران کے مذہبی، علمی اور تمدنی اثرات ظاہر ہوسکیں۔ اس بارہ میں ہم کو ہندو فضلا سے سبق لینا چاہیے، جن کا ہر فرد اپنے اپنے دائرہ میں دنیا پر ہندو مذہب، ہندو فلسفہ اور ہندو تہذیب کا سکہ بٹھانے میں لگا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے پاس تو علوم وفنون کا پورا خزانہ اور ان کے مذہبی، علمی اور تمدنی کارناموں کی ایک شاندار تاریخ موجود ہے۔ اس لیے اگر یونیورسٹی کا یہ ادارہ اسلامی جذبہ سے اس کام کو انجام دے تو بڑی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ یہ مقاصد خود اس کے کارکنوں کے پیش نظر ہوں گے۔ (معارف، فروری ۱۹۵۵ء)

ہندوستان اور پاکستان
کے تجارتی تعلقات اور اشاعتی ادارے

ہندوستان اور پاکستان کے سکہ کے اختلاف اور پاکستان کی تجارتی پالیسی کا اثر ان دونوں ملکوں کے اردو کے علمی واشاعتی اداروں پر بہت زیادہ پڑا ہے، جن میں دارالمصنّفین بھی شامل ہے۔ اس کی کتابوں کی تجارت اتنی گھٹ گئی ہے کہ اگر حکومت ہند ساٹھ ہزار سے اس کی مدد نہ کرتی تو اس کا چلنا دشوار ہوجاتا۔ اس سے وقتی طور پر اس کی حالت ضرور سنبھل گئی، مگر اس قسم کی عارضی امداد اس کی مشکلات کا مستقل حل نہیں ہے اور جب تک اس کی تجارت اصلی حالت پر نہ آئے گی۔ اس وقت تک اس کو دشواریاں پیش آتی رہیں گی۔ ہندوستان کے مصنّفین کی جماعت اور علمی واشاعتی اداروں نے اخبارات کے ذریعہ بارہا اس کی جانب توجہ دلائی، مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پاکستان اپنے مصالح کے مطابق اپنی تجارتی پالیسی بنانے میں بالکل حق بجانب ہے، مگر عام تجارتی چیزوں میں علم وادب کو بھی شامل کرلینا اور اس پر پابندی لگانا علم دوستی کے بھی خلاف ہے اور اس سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ لاکھ دولاکھ کتابیں ہندوستان سے پاکستان جاتی ہوں گی، مگر کم وبیش اتنی ہی وہاں سے آتی ہوں گی اور اگر ان کی درآمد برآمد میں چند ہزار کا فرق بھی ہو تو اس حقیر رقم سے حکومت کے اقتصادیات پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ مگر اس سے کتنے اداروں کی زندگی ہوجائے گی۔ اس لیے کم سے کم کتابوں کو تجارتی پابندیوں سے آزاد رکھنا چاہیے۔

یہ دونوں ملکوں کے اداروں کا معاملہ ہے۔ اس لیے ان کو خود باہمی صلاح ومشورے سے اس

کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔اس سلسلہ میں دارالمصنّفین کی جانب سے ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب پاکستان میں دارالمصنّفین کی تجارت کی بقا اور اس کی توسیع کے ذرائع کی تلاش اور اس مسئلہ پر وہاں کے تاجروں سے گفتگو کرنے کے لیے عنقریب کراچی اور لاہور جانے والے ہیں۔اگر ضرورت ہوئی تو دارالمصنّفین کا کوئی اور نمایندہ بھی بھیجا جائے گا۔ہم کو امید ہے دارالمصنّفین کے تمام ہوا خواہ وہمدرد اس کام میں صباح الدین صاحب کی پوری مدد کریں گے۔

(معارف،فروری ۱۹۵۵ء)

اردو اور حکومت

اردو کو مٹانے اور ہندی کو بڑھانے کے لیے جن جن تدبیروں سے کام لیا جارہا ہے۔اس کا ایک دلچسپ نمونہ گذشتہ مردم شماری کی رپورٹ کے لسانیاتی اعداد وشمار بھی ہیں،جن پر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ہماری زبان میں تبصرہ کیا ہے۔اردو ہندی کا مسئلہ زیادہ تر اتر پردیش اور اس کے بعد بہار میں ہے۔ان دونوں صوبوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد اس طرح گھٹائی گئی ہے کہ بہار میں اس غلط بنیاد پر کہ اردو ہندی ہی کی ایک شکل ہے۔اس کو مستقل زبان نہیں مانا گیا ہے اور اردو بولنے والوں کے اعداد ہندی میں شامل کر لیے گئے ہیں۔حالانکہ بہار کے مقامی بولیوں تک کے اعداد الگ دیے گئے ہیں،اس سے ایک طرف بہار میں اردو کی مستقل حیثیت ختم ہوگئی۔دوسری طرف مقامی بولیوں کے مقابلہ میں ہندی بولنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔اتر پردیش میں صرف دو ہی زبانیں ہیں،اردو یا ہندی۔اس لیے یہاں اردو کے مقابلہ میں ایک تیسری زبان ہندوستانی کھڑی کی گئی ہے۔اس طرح اردو بولنے والوں کی تعداد ہندوستانی میں تقسیم کر کے گھٹائی گئی ہے۔حالانکہ یہ کام اس زحمت کے بغیر بھی ہوسکتا تھا،جیسا کہ پورے صوبہ میں کیا گیا ہے۔

اردو بولنے والوں کی تعداد کو اس صوبہ میں جس طرح گھٹایا گیا ہے۔اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وسطی اور مشرقی اضلاع کا ذکر نہیں۔سہارنپور،مظفر نگر،میرٹھ،بلند شہر،علی گڑھ،آگرہ، بریلی،بجنور،بدایوں،مراد آباد،شاہ جہاں پور،فرخ آباد،اٹاوہ،کانپور اور لکھنؤ جیسے اضلاع میں جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت مسلم مانی جاتی ہے۔ہندی بولنے والوں کی تعداد پچاس پچپن فیصدی سے لے کر ۹۰ فیصدی تک دکھائی گئی ہے۔حد یہ ہے کہ لکھنؤ کے ضلع کی زبان ۶۲ فیصدی ہندی، ۲۰

فیصدی ہندوستانی اور کل ۱۵ فیصدی اردو دکھلائی گئی ہے۔ تنہا یہ مثال اس ثبوت کے لیے کافی ہے کہ کس طرح اردو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، جب ناسخ و آتش، انیس و دبیر، نسیم و چکبست کی سرزمین میں تینوں زبانوں کے بولنے والوں میں یہ تناسب ہوگا تو دوسرے اضلاع کا کیا ذکر، مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ کسی درجہ میں سہی اردو کا وجود تو تسلیم کیا گیا، ورنہ اگر سمپورنانند جی کی طرح اردو کے وجود ہی سے انکار کردیا جاتا تو کون منوا سکتا تھا، مگر یہ اعداد و شمار بھی مطلق انکار سے کم مضحکہ انگیز نہیں ہیں۔

اردو کے دو بڑے مرکز تھے۔ دہلی اور لکھنؤ، لکھنؤ کے صوبہ کی سرکاری زبان کئی سال سے ہندی قرار پاچکی ہے۔ یہاں کے اسکولوں تک میں اردو کی تعلیم کی گنجائش نہیں اور حکومت کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ چند سال کے عرصہ میں لکھنؤ کی زبان ۶۲ فیصدی ہندی ہوگئی اور کل ۱۵ فیصدی اردو رہ گئی۔ اگر ہندی کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو آیندہ مردم شماری میں اردو کا نام بھی باقی نہ رہ جائے گا۔ لکھنؤ کا قصہ تو اس طرح ختم ہوا ''یادگار بزم غالب ایک دہلی رہ گئی'' تھی۔ اس کی سرکاری زبان بھی ہندی بنانے کی تجویز ایک مرتبہ پیش ہوچکی ہے۔ مگر گوپی ناتھ امن کی مخالفت کی وجہ سے مسترد ہوگئی تھی۔ لیکن جناب امن کب تک اردو کی جان کو امان دلا سکتے تھے۔ اب خود دہلی کی سرکار نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اس سال سے ریاست دہلی کی زبان ہندی کردی جائے گی اور آیندہ سال سے اس کا سارا کاروبار ہندی میں ہوگا۔ اور جب ان دونوں مرکزوں سے اردو ختم ہوجائے گی تو پھر اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا۔

ع کردیا سفاک نے میدان صاف

اترپردیش کی حکومت کا رویہ اب تک وہی ہے۔ اس نے دکھانے کے لیے اردو کو جو حقوق دیے بھی ہیں ان پر عمل نہیں ہورہا ہے۔ حافظ ابراہیم صاحب نے بجٹ کی تقریر کے سلسلہ میں اردو کے بارہ میں حکومت کی جو پالیسی ظاہر کی ہے اور اس بنیاد پر کہ ''اردو بھی اترپردیش میں بولی جاتی ہے'' اس غیر سرکاری زبان کو جس قسم کی امداد دینے کا وعدہ کیا ہے، وہ کوئی نیا نہیں ہے، پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں خاص شرائط کے ساتھ اردو تعلیم کی اجازت اور اس کے انتظام کا وعدہ پہلے سے ہے اور اس کے بارہ میں حکومت کے احکام بھی موجود ہیں، سرکاری دفتروں میں بھی اردو میں درخواست دینے کی اجازت ہے جس کا اظہار حافظ ابراہیم صاحب نے اپنی تقریر میں بھی کیا، مگر

سوال یہ ہے کہ ان پر عمل کہاں تک ہو رہا ہے۔ ان شعبوں کے عمال حکومت کے احکام کی تعمیل میں جو رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ ان سے حافظ صاحب بے خبر نہ ہوں گے۔ اس لیے ان کی تقریر کے بعد بھی اس پر عمل کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ اگر حقیقتاً حکومت کی پالیسی وہی ہے جو حافظ نے ظاہر کی ہے تو اس پر عمل بھی ہونا چاہیے اور جو لوگ اس میں رکاوٹ پیدا کریں ان سے باز پرس ہونی چاہیے اور اردو کا حق محض تعلیم اور اردو درخواستوں تک محدود نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کو وہ تمام سہولتیں ملنی چاہییں جو علاقائی زبان کی حیثیت سے اس کا حق ہیں ورنہ محض زبانی وعدہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں، تاہم ایک ایک ذمہ دار وزیر کی زبان سے اس تصریح کے ساتھ پہلی مرتبہ اعلان کیا گیا ہے۔ اس لیے حسن ظن یہی رکھنا چاہیے کہ شاید اس پر عمل بھی ہو۔

اردو کے بارہ میں حافظ صاحب کی تقریر کے بعض فقرے ایسے عبرت انگیز ہیں کہ بے اختیار اکبر الہ آبادی کا یہ قطعہ یاد آ گیا:

انہی کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انہی کا مطلب نکل رہا ہے
انہی کا مضمون انہی کا کاغذ قلم انہی کی دوات ان کی

مگر وہ بھی مجبور ہیں۔ حکومت کے نمایندے کی حیثیت سے اس کے سوا وہ اور کیا کہہ سکتے تھے، مگر ہم کو یقین ہے کہ ان فقروں کے بولتے وقت ان کے دل نے ان کی زبان کا ساتھ نہ دیا ہوگا۔

اردو علاقائی زبان کا میمورنڈم صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے مگر ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا، معلوم نہیں انتظار کی یہ مدت کب تک بڑھے گی، درحقیقت مرکزی حکومت خود اس بارہ میں کشمکش میں مبتلا ہے۔ ایک طرف ہندوستان کے دستور میں اردو کو بھی ہندوستان کی چودہ زبانوں میں ایک زبان مانا گیا ہے۔ پنڈت جواہر لال بھی اس کی حمایت میں ہیں لیکن اکثریت اس کے مخالفین کی ہے۔ ایسی حالت میں ان کے خلاف فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے مگر اس انتظار سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جاتا، خواہ وہ خلاف ہی کیوں نہ ہوتا۔ امید و بیم کی یہ کیفیت تو ختم ہوتی، اور اردو کے حامی کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرتے۔ (معارف،

مارچ ۱۹۵۵ء)

اسپیشل میرج ایکٹ

اسپیشل میرج ایکٹ جس زمانہ میں پاس ہوا ہے۔اسی زمانہ میں ہم نے لکھا تھا کہ یہ ایکٹ اسلامی قانون نکاح کے خلاف ہے۔اس لیے مسلمانوں پر اس کا اطلاق نہ ہونا چاہیے۔مگر بغیر کسی استثنا کے اس کا نفاذ ہو گیا۔اس وقت کے قانون کے رو سے مختلف مذہب رکھنے والے مرد اور عورتیں آپس میں شادی کر سکتے ہیں، یہ شادی قانوناً جائز ہوگی اور اس کے لیے کسی مجسٹریٹ کے سامنے شادی کا اقرار کر لینا کافی ہوگا۔

اسلامی قانون میں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان شادی جائز نہیں ہے۔البتہ مسلمان مردوں کو کتابیہ عورت سے شادی کی اجازت ہے۔اس کے خلاف جو صورت ہوگی وہ شرعاً جائز نہ ہوگی اور شادی کرنے والے کو اپنے بعض اسلامی حقوق سے دست بردار ہونا پڑے گا۔مگر اسپیشل میرج ایکٹ کے رو سے اس قسم کی شادی قانوناً جائز ہوگی اور شادی کرنے والا کسی حق سے محروم بھی نہ ہوگا۔ اس لیے دینی حیثیت سے اس قانون کی مضرت ظاہر ہے، دنیاوی حیثیت سے بھی وہ مسلمانوں کے لیے برابر نقصان کا باعث ہے۔آج کل اگر کوئی ہندو کسی مسلمان عورت سے شادی کر لیتا ہے تو اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی، بلکہ اس کو متحدہ قومیت کی نشانی قرار دیا جاتا ہے،لیکن اگر بدقسمتی سے کوئی مسلمان مرد، خواہ نام ہی کا مسلمان ہو، کسی ہندو عورت سے شادی کر لیتا ہے تو اس کے خلاف ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ایسی حالت میں کوئی مسلمان ہندو عورت سے شادی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، مگر ہندو مرد آزادی سے مسلمان عورتوں سے شادیاں کریں گے۔اور عورت کسی حق سے محروم بھی نہ ہوگی اور اس کی اولاد ہندو مانی جائے گی۔اس لیے دنیاوی حیثیت سے بھی یہ قانون مسلمانوں کے لیے سخت مضر ہے۔

انگریزی حکومت نے بھی کبھی کوئی ایسا قانون نہیں بنایا تھا، جس سے کسی مذہبی قانون کی مخالفت ہوتی ہو، مختلف المذاہب عورتوں اور مردوں کے درمیان شادی کے جواز کے لیے سول میرج ایکٹ ضرور تھا، مگر اس میں فریقین کو اس کا اقرار کرنا پڑتا تھا کہ ان کا کسی مذہب سے تعلق نہیں ہے۔ اور اپنے حقوق سے بھی دست بردار ہونا پڑتا تھا۔اس لیے اس کا اثر کسی مذہبی قانون پر نہیں پڑتا تھا،

مگر موجودہ قانون اسلامی قانون نکاح کے صریح خلاف ہے۔ اس لیے مسلمانوں پر اس کا نفاذ کسی طرف روا نہیں ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہماری سیکولر حکومت اس سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دے گی۔ (معارف، جولائی ۱۹۵۵ء)

گاؤکشی کا بل

بالآخر گاؤکشی کا بل اس صوبہ میں پاس ہو گیا۔ اس کارنامہ کی توقع اسی حکومت سے ہو سکتی تھی جس کے ہاتھ اردو کے خون اور مسلمانوں کی حق تلفی سے رنگین ہیں۔ چنانچہ گاؤکشی کے قانونی انسداد کا سہرا بھی اس کے سر رہا اور ابھی

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے یوں بھی گاؤکشی قریب قریب بند ہو چکی تھی۔ اس لیے اس قانون کی ضرورت ہی نہ تھی لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دنیا کی نگاہوں میں نام نہاد سیکولرزم کا پردہ پوری طرح فاش ہو گیا، محض الفاظ کے طلسم سے حقیقت نہیں چھپ سکتی، ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس کے بعد ان سب جانوروں کو بھی جنہیں........ ہندو مذہب میں تقدس کا درجہ حاصل ہے، مارنا ممنوع قرار دیا جائے تا کہ پھر کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ (معارف، ستمبر ۱۹۵۵ء)

صحیح تاریخ ہند کی ضرورت

انگریزوں نے اپنے زمانہ میں اسلامی ہند کی جو تاریخیں لکھیں ان کو اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر بہت مسخ کیا اور ہندو مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کے لیے عموماً اس دور کے واقعات اور مسلمان حکمرانوں کی نہایت غلط تصویر پیش کی۔ اس کی تقلید بعض ناعاقبت اندیش ہندو مورخین نے بھی کی، یہی تاریخیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی تھیں، اسلیے ان کا زہر نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا، جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، مگر ہندوستان کے عاقبت اندیش اور صاحب نظر ہوا خواہوں نے جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، اسی زمانہ میں اس فتنہ کو محسوس کر لیا تھا اور اس کے انسداد کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ خود منصف مزاج ہندو مصنّفین نے بھی اپنی کتابوں میں اسلامی دور کی بہت سی خوبیوں اور ہندوستان سے متعلق مسلمانوں کے سیاسی، علمی اور تمدنی خدمات کا بڑی کشادہ دلی سے اعتراف کیا۔

مولانا شبلی مرحوم نے ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تاریخی اغلاط کی تصحیح کا ایک خاص شعبہ قائم کیا جو کئی سال تک اس کام کو انجام دیتا رہا مگر پھر اس کی باگ ایسے ہاتھوں میں چلی گئی، جو اس کو نہ چلا سکے مگر مولانا مرحوم آخر عمر تک اپنے قلم کے ذریعہ ہندوستان کی اسلامی حکومتوں اور مسلمان حکمرانوں کے متعلق غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کی تصحیح و تردید اور ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اس سلسلہ میں بڑے اہم مضامین لکھے۔ ان کے بعد حضرت الاستاذؒ نے جن کو تاریخ ہند سے خاص ذوق تھا ہمیشہ اس مقصد کو پیش نظر رکھا اور اس نقطہ نظر سے تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر برابر مضامین لکھتے رہے۔ ان کی مشہور کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' بھی درحقیقت اسی سلسلہ کی کڑی ہے اور اس کام کو زیادہ وسعت و تنظیم کے ساتھ انجام دینے کے لیے اسلامی دور کی ایک مکمل اور صحیح تاریخ لکھنے کی تجویز پیش کی اور اس کا پورا خاکہ دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں شائع کیا، جس میں تاریخ کی ترتیب کے علاوہ اس کی قدیم اہم اور نادر قلمی کتابوں کی نقل، مطبوعہ اور کمیاب کتابوں کا حصول، مغلیہ عہد سے متعلق قدیم یورپین سیاحوں کے بیانات اور ہندوستان کی تاریخ پر انگریزی میں جو قابل ذکر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی فراہمی، مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے زمانہ میں اس کے متعلق جو تاریخی مواد پیدا کیا، اس کی جمع و ترتیب، ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کتب خانوں میں جو نادر قلمی کتابیں ہیں، ان سے استفادہ وغیرہ بھی شامل تھا۔

اس تجویز کو اہل علم نے بہت پسند کیا اور اس کے بارہ میں مفید مشورے دیے۔ جو معارف میں شائع ہو چکے ہیں اور اس تجویز کے ساتھ اس کام کو دارالمصنّفین میں شروع بھی کر دیا اور اس سلسلہ میں تاریخ سندھ، مختصر تاریخ ہند، بزم تیموریہ اور بزم مملوکیہ وغیرہ مرتب ہو کر شائع ہوئیں۔ بعض کے مسودے موجود ہیں جن کی اشاعت ابھی نہیں ہوسکی ہے اور بعض زیر تالیف ہیں لیکن اس کام کے لیے جس قدر سرمایہ اور جس سروسامان کی ضرورت تھی وہ مہیا نہ ہوسکا۔ اس لیے پروگرام کے مطابق انجام نہ پا سکا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد قومی نقطۂ نظر سے ایسی تاریخ کی اہمیت اور ضرورت اور بڑھ گئی ہے اور تاریخ ہند کے سلسلے میں بعض اور کام بھی کرنے کے ہیں مثلاً اس کی اہم قلمی کتابوں کی تصحیح و اشاعت، جو پرانی مطبوعہ کتابیں نایاب ہوگئی ہیں، ان کی دوبارہ طباعت، الیٹ نے اپنی کتاب میں

ہندوستان کی تاریخ کے عربی ماخذوں کو بھی نقل کر دیا ہے، مگر بعض کتابوں پر اس کی دسترس نہ ہوسکی تھی، جواب چھپ گئی ہیں، ان میں ہندوستان کے متعلق جو معلومات ہیں، ان کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے اس دور کے متعلق بعض نئے معلومات سامنے آجائیں گے اور بھی اس قسم کے متفرق کام ہیں۔ مگر یہ سب کام تنہا دارالمصنّفین کے بس کے نہیں ہیں۔ اس کے لیے بڑے سرمایہ کی، دوسرے اہل علم کی مدد کی بھی ضرورت ہوگی، جس کا بظاہر کوئی سامان نہیں ہے، تاہم جس حد تک دارالمصنّفین کے بس میں ہے وہ اس کو کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات زبان قلم پر آگئی ۔ انگریزوں نے ہندو مسلمانوں میں منافرت کا جو بیج بویا وہ تو ان کے سیاسی مصالح کے مطابق تھا، مگر اب اسکی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے کہ بعض تنگ نظر اور متعصب مصنّفین نے اب تک اس کا سلسلہ قائم رکھا ہے، بلکہ اور زیادہ بڑھ گیا ہے، انگریز تاریخ کے ذریعہ تو بہت زہر پھیلاتے تھے۔ مگر اپنی حکومت کی خاطر مسلمانوں کے مذہب پر حملہ نہیں کرتے تھے اور اس زمانہ میں مذاہب کی توہین کی سزا بھی ہوتی تھی۔ اس لیے دوسرے لوگ بھی احتیاط کرتے تھے۔ وہ دفعہ تو اب بھی ہے مگر مسلمانوں کے معاملہ میں بے اثر ہوگئی ہے۔ اس لیے اور بھی کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے اور نہ صرف مسلمان حکمرانوں بلکہ مذہب اسلام، اس کے پیغمبر اور اس کی مقدس کتاب کے متعلق نہایت غلط اور دل آزار باتیں تحریر کی جاتی ہیں اور نصاب کی بعض کتابوں تک میں بلا تکلف ان کو لکھا جاتا ہے، جس کو مسلمان طلبہ بھی پڑھتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں صوبہ بہار کی اسی قسم کی ایک کتاب پر اخبارات میں احتجاج ہو چکا ہے، تعجب ہے کہ نصاب کی کمیٹی ایسی لغو کتابوں کو نصاب میں شامل کرنے کی کیسے اجازت دیتی ہے، یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی حیثیت سے نہایت نازیبا بلکہ حکومت کے مصالح کے بھی خلاف ہے، اگر حکومت ایک دو مصنّفین کو سزا دے دے تو پھر کسی کو اس کی جرأت نہ ہو۔ مگر مسلمانوں کے معاملہ میں وہ کیوں ایسا کرنے لگی، اگر ہندو مذہب کے بارہ میں اس قسم کا جرم کسی مسلمان سے سرزد ہوتا تو پھر دیکھتے، اس کا انجام کیا ہوتا۔

(معارف، اکتوبر ۱۹۵۵ء)

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی

فرقہ پرستوں کی جانب سے مسلمانوں کی دل آزاری کا سلسلہ برابر جاری ہے اور حکومت

کے توجہ نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب مسلمانوں کی سب سے محترم و محبوب ہستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس تک گستاخی کی نوبت پہنچ گئی ہے، جس سے زیادہ مسلمانوں کی دل آزادی تصور میں نہیں آسکتی۔ اور جس کو کوئی مسلمان کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کرسکتا، جس بدبخت نے یہ گستاخی کی ہے اور جن اخباروں نے یہ اشتہار شائع کیا ہے۔ انھوں نے تنہا مسلمانوں کی دل آزاری نہیں کی بلکہ اپنی قوم، اپنی حکومت اور انسانیت کے نام پر بٹہ لگایا، یہ غنیمت ہے کہ اس مرتبہ حکومت نے ڈھیل سے کام نہیں لیا اور مجرم کو فوراً گرفتار کرلیا ہے اور اس پر مقدمہ چلائے گی۔ اس ننگ انسانیت کو اس جرم کی ایسی سزا ملنی چاہیے جس سے دوسروں کو عبرت اور آیندہ کسی شرارت پسند کو اس قسم کی جرأت نہ ہو۔

یہ کوئی نادانستہ حرکت یا اتفاقی واقعہ نہیں ہے، بلکہ لکھنؤ میں شدھی یگیہ اور جن سنگھ کے سلسلہ میں جو طوفان بے تمیزی برپا ہوا، فرقہ پرستی کی آگ کو جس طرح مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی اور حکومت نے جس چشم پوشی سے کام لیا اس کا لازمی نتیجہ ہے، اگر وہ شروع سے ان فتنوں کو روکتی تو اس کی نوبت ہی نہ آتی، اگر ایک مرتبہ حکومت نے مجرم کو سزا دے بھی دی تو اس سے اس قسم کے جرائم کا مستقل انسداد نہیں ہوسکتا، اس کے لیے پیشوایان دین کو، توہین کی دفعہ کو اور زیادہ سخت اور موثر بنانے کی ضرورت ہے، جس کی رو سے ہر اس شخص کو مدعی بننے کا اختیار ہو، جس کے پیشوا کی توہین کی جائے اور سزا کو بھی اور زیادہ سخت کیا جائے، اس کے بغیر اس فتنہ کا پورا تدارک نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کی دفعہ ملکی مفاد کے نقطہ نظر سے بھی ضروری ہے اور اس کا فائدہ ہر فرقہ کو پہنچے گا۔ (معارف، جنوری ۱۹۵۶ء)

بہار میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کے لیے
صدر جمہوریہ کی خدمت میں دستخطی عرضداشت

گذشتہ مہینہ ایک بڑے اسلامی ملک کے فرماں روا رضا شاہ پہلوی نے ہندوستان کو اپنی میزبانی کی عزت بخشی۔ ایران اور ہندوستان کے درمیان اتنے قدیم اور ایسے گوناگوں تعلقات ہیں اور ان میں اس قدر اشتراک ہے کہ مشکل سے کسی دو ملکوں اور قوموں کے درمیان اتنا اشتراک ہوسکتا ہے، دونوں قومیں نسلاً ایک ہیں۔ دونوں کی زبانیں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں، ان کی مشابہت سے آج بھی ان کی قدیم وحدت کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ ایک زمانہ میں بدھ مذہب کا اثر ایران تک تھا، ان قدیم رشتوں کے علاوہ ہندوستان کے اسلامی اور خصوصاً دکن کے سلاطین اور تیموریوں کے زمانہ

میں ہندوستان ایران کا ایک خطہ بن گیا تھا۔ ایران کے اصحاب کمال کی آمد کا ایک سلسلہ قائم تھا۔ اس دور کے ہندوستان کے بہت سے نامور ایرانی تھے جو آج بھی اسی سرزمین میں محوخواب ہیں۔ فارسی ہندوستان کی علمی اور حکومت کی زبان تھی، ایرانی تہذیب نے ہندوستانی تہذیب کے ہر شعبہ پر اتنا اثر ڈالا ہے اور یہ اثرات اس میں اس قدر پیوست ہوگئے ہیں کہ آج بھی ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا، ان دونوں تہذیبوں کے میل سے ایک ایسی دلکش ودل فریب تہذیب وجود میں آئی جو اپنی لطافت ونفاست میں ہندوستان کی تمام تہذیبوں میں ممتاز اور ہندو مسلمانوں کے اونچے طبقہ کی مشترک تہذیب ہے۔ ہندوستان کی زبان، اس کے ادب، فنون لطیفہ اور تہذیب ومعاشرت ہر چیز میں اس کا جلوہ نمایاں ہے، اسی تہذیب نے ہندوستان کو دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور حیدرآباد جیسے تہذیبی مرکز، تاج محل جیسی عجوبۂ روزگار عمارت اور اردو جیسی حسین وجمیل زبان بخشی مگر انگریزی عہد میں ان دونوں ملکوں میں دوری ہوگئی تھی، تاہم تہذیبی اشتراک کا رشتہ قائم تھا، اسی رشتہ کی بدولت رضا شاہ نے ہندوستان میں ایک خاص قسم کی یگانگت محسوس کی، ان کی آمد سے ان قدیم رشتوں کی دوبارہ تجدید ہوگئی ہے۔ ہندوستان اور اسلامی ملکوں کے تعلقات نہ صرف ان ملکوں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہیں۔ اس لیے شاہ ایران کی آمد ہر اعتبار سے ہمارے لیے مبارک ومسعود ہے۔

(معارف، مارچ ۱۹۵۶ء)

بہار میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کے لیے
صدر جمہوریہ کی خدمت میں دستخطی عرضداشت

بالآخر اہل بہار نے بھی اردو کو اپنے صوبہ کی علاقائی زبان بنوانے کے لیے کئی لاکھ دستخطوں کا میمورنڈم صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کردیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بہار سے لے کر دلی تک کا پورا علاقہ اردو کا خاص وطن ہے، اس کی ساری نشوونما اور ترقی یہیں ہوئی اور آج بھی اس علاقہ کے بڑے حصہ کی زبان اردو ہے۔ اس حقیقت سے خود صدر جمہوریہ بھی واقف ہیں، آج سے ۱۵، ۱۶ سال قبل اردو اور ہندی کے قضیے کو طے کرنے کے لیے اردو اور ہندی دانوں کے درمیان جو مفاہمت ہوئی تھی، اس کے رکن رکین ہمارے صدر جمہوریہ اور مولوی عبدالحق صاحب تھے اور یہ مفاہمت ''راجندر وعبدالحق پیکٹ'' کے نام سے موسوم تھی۔ اس لیے ان سے زیادہ اس مسئلہ کا واقف کار اور کون

ہوسکتا ہے، مگر اب یہ مسئلہ آئینی ہوگیا ہے اس لیے مرکزی حکومت اور جن ریاستوں کے باشندوں کی جانب سے میمورنڈم پیش کیے گئے ہیں، ان کی حکومتوں سے مشورہ کیے بغیر صدر جمہوریہ اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔

(معارف، مارچ ۱۹۵۶ء)

اتر پردیش میں اردو

جہاں تک اتر پردیش کا تعلق ہے، یہاں اردو کی مخالفت بہت کم ہوگئی ہے۔ اور اردو کے حامیوں کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے، حکومت کا رویہ بھی بدل چلا ہے۔ اس نے اردو کو کچھ تعلیمی حقوق بھی دیے ہیں۔ اتر پردیش کے وزیر اعظم کو اس کا بھی اعتراف ہے کہ ''وہ اردو کو اسی ملک کی زبان سمجھتے ہیں، وہ اس صوبہ کے ہر ضلع میں بولی جاتی ہے، اس سے ان کو کوئی دشمنی نہیں اور جو لوگ اس کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں اس کا وہ انتظام کریں گے''، مگر اس کے باوجود اردو کو اس لیے اس صوبہ کی علاقائی زبان بنانے کے لیے آمادہ نہیں ہیں کہ ان کے نزدیک کوئی ایسا علاقہ نہیں ہے، جہاں صرف اردو بولنے والے ہوں اور ان کے مقابلہ میں ہر ضلع میں ہندی بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دو لسانی ریاست بنانا اتر پردیش کے لیے مضر ہے۔

مگر ان دونوں دلیلوں میں کوئی وزن نہیں ہے۔ اولاً یہ بیان ہی صحیح نہیں ہے کہ ہر ضلع میں ہندی بولنے والوں کی اکثریت ہے، گذشتہ مردم شماری کے اعداد و شمار کا اعتبار نہیں، اس کی صحت اس سے ظاہر ہے کہ اس کی رو سے لکھنؤ جیسے شہر میں اردو بولنے والوں کی تعداد کل ۱۵ فیصدی ہے لیکن اگر وزیر اعظم کا بیان صحیح بھی جان لیا جائے تو جب وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اردو ہر ضلع میں بولی جاتی ہے تو خواہ ان کے بولنے والوں کی تعداد ہندی بولنے والوں کے مقابلہ میں کم ہی کیوں نہ ہو اس کو لسانی اقلیت تو بہر حال ماننا پڑے گا۔ اس لیے اس کو وہی حقوق ملنے چاہئیں جن کی سفارش حد بندی کمیشن نے لسانی اقلیتوں کے لیے کی ہے۔ اس میں قریب قریب وہ تمام حقوق آ گئے ہیں، جن کا اردو والوں نے مطالبہ کیا ہے اگر حکومت سرکاری طور پر ان کو اردو کے لیے مان لے تو اردو والوں کا مطالبہ پورا ہوجائے گا۔ حکومت کو کوئی مزید حق بھی نہ دینا پڑے گا اور اردو کے لیے یہ سہولت پیدا ہوجائے گی کہ اس کی تعلیم وغیرہ میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ نہ پیش آئیں گی۔ پنجاب اور دوسری ریاستوں کے دو

لسانی ریاست بننے کے بعد اس سے نقصان پہنچنے کا عذر بھی عذر لنگ ہوجاتا ہے۔ اگر دو لسانی ریاست بننے سے پنجاب کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تو اتر پردیش کو کیوں پہنچے گا۔

(معارف، مارچ ۱۹۵۶ء)

راجستھان اردو کنونشن

راجستھان اردو کنونشن جے پور جس کی تیاریاں عرصے سے جاری تھیں۔ بڑی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اس کنونشن نے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت واضح کردی کہ اردو کسی خاص فرقہ کی نہیں بلکہ تمام فرقوں کی مشترک زبان ہے اور ہندوؤں کا سنجیدہ اور سمجھ دار طبقہ اس کی حمایت میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ چنانچہ راج پرمکھ نے اپنی افتتاحی تقریر، پنڈت رام کشور ویاس ہوم منسٹر راجستھان نے اپنے خطبۂ استقبالیہ اور راجہ امرناتھ اٹل نے اپنے خطبۂ صدارت میں پوری صراحت کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ ''اردو تنہا مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے، لاکھوں انسان اس کو بولتے ہیں، خصوصاً شمالی ہندوستان میں صدیوں سے بولی جاتی ہے۔ اردو کے شاعر و ادیب سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں''۔ لائق صدر نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ اردو خود راجستھان میں برسوں سرکاری زبان رہ چکی ہے، اگر وہ تنہا مسلمانوں کی زبان ہوتی تو ہندوؤں اور سکھوں کی مذہبی کتابیں اس میں منتقل نہ ہوتیں اور اس کے بڑے بڑے ہندو شعرا اور ادیب نہ پیدا ہوتے۔ یہ خیالات اس کا ثبوت ہیں کہ ہندوؤں کا حق پرست طبقہ اردو کی حمایت میں ہے اور عام فضا اس کے موافق ہورہی ہے۔

اس صوبہ میں اردو کے لیے ایک اچھی علامت یہ بھی ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد سے اردو بالکل ختم کردی گئی تھی۔ اس کے نئے دستور میں نام کے علاوہ اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی تھی۔ اردو کے ممبروں کی تعداد بھی گھٹادی گئی تھی اور عملاً اس کو ہندی اکیڈمی بنادیا گیا تھا، مگر گذشتہ ۱۸؍ مارچ کے جلسہ میں طے پایا ہے کہ اکیڈمی پرانے دستور کے مطابق رہے گی، جس میں اردو کا بھی حصہ ہے، اردو کے ممبروں کی پرانی تعداد بھی قائم رکھی گئی ہے اور امید ہے کہ کچھ نہ کچھ اردو کا بھی کام ہوگا۔ جو اردو کے حق میں ایک خوش گوار تبدیلی ہے۔

(معارف، اپریل ۱۹۵۶ء)

تصانیف شبلی صدی

۱۔ سیرۃ النبی جلد اول و دوم   علامہ شبلی نعمانی
قیمت =/۲۰۰۰ روپے

۲۔ شبلی کی آپ بیتی   ڈاکٹر خالد ندیم
قیمت =/۳۲۵ روپے

۳۔ دارالمصنّفین کے سو سال   کلیم صفات اصلاحی
قیمت =/۳۵۰ روپے

۴۔ شذرات شبلی (ماہنامہ الندوہ کے اداریوں کا مجموعہ)
مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی   قیمت =/۲۲۰ روپے

۵۔ الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی، علامہ شبلی
تحقیق و ترتیب ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی
قیمت =/۳۵۰ روپے

۶۔ مولانا شبلی لائف اینڈ ورکس
ڈاکٹر جاوید علی خاں   قیمت =/۲۳۰ روپے

۷۔ حیات شبلی   مولانا سید سلیمان ندوی
قیمت =/۶۰۰ روپے

۸۔ متاع رفتگاں، مولانا شاہ معین الدین ندوی
مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی   قیمت =/۲۰۰ روپے

۹۔ رسائل شبلی   علامہ شبلی نعمانی
قیمت =/۳۰۰ روپے

۱۰۔ یہود اور قرآن مجید، مولانا ضیاء الدین اصلاحی
مرتبہ اشتیاق احمد ظلی   قیمت =/۱۵۰ روپے

۱۱۔ مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں (مجموعۂ مقالات)
مرتبہ اشتیاق احمد ظلی   قیمت =/۲۵۰ روپے

۱۲۔ اردو ترجمہ مکاتیب شبلی مع حواشی و تعلیقات
ڈاکٹر خالد ندیم   قیمت =/۱۱۰ روپے

۱۳۔ شبلی شناسی کے اولین نقوش
مرتبہ ظفر احمد صدیقی   قیمت =/۶۰۰ روپے

۱۴۔ الفاروق (ہندی ترجمہ)   عبداللہ دانش
قیمت =/۴۵۰ روپے

۱۵۔ شبلی ایک دبستان   آفتاب احمد صدیقی
قیمت =/۲۵۰ روپے

۱۶۔ حیات سعدی، مولانا الطاف حسین حالی
تحشیہ و تعلیقات سید محمد اسد علی خورشید
قیمت =/۴۰۰ روپے

۱۷۔ تاریخ بدء الاسلام، علامہ شبلی
مرتبہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی قیمت =/۳۵۰ روپے

۱۸۔ مطالعات شبلی (مقالات سمینار)
مرتبہ اشتیاق احمد ظلی   قیمت =/۵۵۰ روپے

۱۹۔ مراسلات شبلی   ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
قیمت =/۱۵۰ روپے

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) PRINT

JUNE 2016 Vol - 197 (6)

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Office Mobile) 09170060782

یہی (معارف) ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ (علامہ اقبال)

معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ صرف یہی ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد اللہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو خدمت علم و تصنیف کے لیے وقف ہے۔

(مولانا ابوالکلام آزاد)

میں معارف کو دنیا کا سب سے بلند پایہ علمی رسالہ سمجھتا ہوں۔ وہ ہمارے تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ، ایک ماخذ ہوگا۔ وہ مرجع انام ہے اور لوگ اب بھی، آیندہ بھی اس سے استناد کریں گے۔ (ڈاکٹر حمید اللہ، پیرس)